آئینۂ ایام
(قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے)
مرتبہ : ڈاکٹر محمد غیاث الدین
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

آئینۂ ایام

آئینۂ ایّام

(قاضی عبدالسّتار کے بہترین افسانے)

مرتبہ

ڈاکٹر محمّد غیاث الدّین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

AAINA-E-AYYAM

(Short Stories by Qazi Abdul Sattar)

Complied By

Dr. Mohammad Ghayasuddin

1995

Price Rs. 100

I S B N : 81-86232-09-5

سنہ اشاعت ________ ۱۹۹۵ء

قیمت ________ ۱۰۰/- روپے

کمپوزنگ ________ ایم-ایم- کمپیوٹر پوائنٹ - کوچہ پنڈت ، دہلی

مطبع ________ ایگل آفسیٹ پریس ، جعفر آباد ، سیلم پور ، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Azizuddin Vakil, Kucha Pandit,

Lal Kuan Delhi-110006 (India) Ph : 526162, 7774965.

اپنی والدہ محترمہ

کے

نام

فہرست

مقدمہ

قاضی عبدالستار کی پیدائش ۹ فروری ۱۹۲۲ میں سیتا پور (اودھ) کے ایک گاؤں مچھریٹہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۸ میں ہائی اسکول اور ۱۹۵۰ میں انٹرمیڈیٹ آر۔ آر۔ ڈی۔ کالج سے پاس کیا۔ ۱۹۵۲ میں بی۔اے آنرز اور ۱۹۵۴ میں ایم۔اے کے امتحانات میں امتیاز حاصل کیا۔ ۱۹۵۶ میں شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں بہ حیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۵۷ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی نگرانی میں "اردو شاعری میں قنوطیت" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند سے سرفراز ہوئے۔

ایک مکمل تہذیب، مستند استاد، بے باک انسان، عارف تہذیب و تاریخ، خوش بیان مقرر، مفکر و مدبر، عالم عصر، صاحب طرز افسانہ نگار اور صاحب اسلوب ناول نگار کا نام قاضی عبدالستار ہے۔

دنیا کی تاریخ ساز شخصیتیں متنازعہ فیہ ہوتی رہی ہیں۔ قاضی عبدالستار بھی متضاد خوبیوں کے حامل ہیں۔ تحریر میں نسل، رنگ، قوم اور مذہب کو انسانیت سے کمتر سمجھنے والا ذاتی زندگی میں اریسٹو کریٹ، امیرانہ اور شاہانہ بود و باش کا پرستار ہے۔

قاضی عبدالستار دوست اور دشمن کا اشتہار علی الا علان کرتے ہیں۔ للو چپو کرنے والے اور بیمار رشتوں پر وہ یقین نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں رعایت کا خانہ نہیں ملتا۔ اسی لیے لوگوں نے انھیں اکھڑ، ضدی اور بد دماغ کا نام دے رکھا ہے اور قاضی عبدالستار کو یہ نام پسند ہے۔ ان کے خیال میں فنکار کو ابنارمل ہونا بھی چاہئے۔

ان کے الزام تراشوں میں وہ سادھو منش بھی شامل ہیں جو کبھی ان کے نور نظر بننا چاہتے تھے مگر ٹھکرا دیے گئے۔ علی گڑھ میں ان کے دشمنوں کی تعداد ان کے دوستوں سے کئی گنا زیادہ ہے اور اس بات کے لئے انھیں ذرہ بھر افسوس نہیں۔ اس شہر میں انھیں کئی بار بھگوان شنکر کی طرح زہر پینا پڑا ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسری کے انٹرویو کے لیے ان سے کہا گیا تو انھوں نے اس شرط پر انٹرویو میں جانا منظور کیا کہ وہ بھی انٹرویو لینے والوں سے تین سوال پوچھیں گے۔ وائس چانسلر نے کہا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ قاضی عبدالستار

نے جواب دیا مجھے پروفیسری کا خبط نہیں ۔ جس دن انٹرویو ہوا وہ علی گڑھ میں موجود نہیں تھے ۔ ان کی غیر موجودگی میں انھیں پروفیسر کا آفر پیش کیا گیا۔

پاکستان کے ادبی سفر پر صدر پاکستان ضیاء الحق مرحوم نے قاضی صاحب کو مستقل رہائش اور کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی پیشکش کی ۔ قاضی عبدالستار نے اس فرمائش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جس ملک نے مجھے قاضی عبدالستار اور پدم شری سے نوازا ہے میں اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔

قاضی صاحب کے ہندو دوستوں نے کہا کہ آپ صرف یہ تسلیم کرلیں کہ ہندی زبان سے واقف ہیں تو ناول "داراشکوہ" پر انعام حاضر ہے ۔ انھوں نے جواب دیا میں ہندی زبان نہیں جانتا ہوں ۔ سابق صدر ہندوستان جناب فخر الدین علی احمد نے ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل آف آل انڈیا ریڈیو کے نئے عہدے اور دیگر تمام سہولیات سے نوازنا چاہا۔ مگر یہاں بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس عظیم عہدے پر سارے کام ہندی میں ہونگے اور ہندی مجھے نہیں آتی ہے ۔

رفیقوں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ اپنی زبان کو ذرا مصلحت آمیز بنا دیں تو کسی یونیورسٹی کی وائس چانسلری یا ممبر پارلیمنٹ کی بلندی تک پہنچ سکتے ہیں ۔ انھیں جواب دیا گیا کہ دستور زباں بندی کا اصول مجھے پسند نہیں ۔ ہماری پستی بھی آپ کی بلندی سے عظیم تر ہے اور ہماری بلندی سے آپ کا موازنہ ممکن نہیں ۔

قاضی عبدالستار نے اکثر غریب طلباء کی مدد کی ہے ۔ جو شخص ظاہری طور پر اسقدر سخت اور پتھر ہے اس کے باطن میں محبت اور ہمدردی کا دریا بھی بہتا ہے ۔ یہ راز وہ لوگ جانتے ہیں جو ان سے قریب رہے ہیں

علی گڑھ کعبہ بھی ہے اور کربلا بھی ۔ کربلا کے مشرکوں سے قاضی عبدالستار نے سالہا سال خاموش جنگ لڑی ہے ۔ وہ اپنے آپ سے بھی لڑتے رہتے ہیں جب ان پر سکوت کا عالم طاری رہتا ہے ۔ انھیں خاموش رہنے کی عادت ہے ۔ کبھی کبھی یہ خاموشی بڑی طویل ہو جاتی ہے اور مخاطب پریشان ہو جاتا ہے ۔ انھیں انجمن سے زیادہ تنہائی گوارا ہے ۔ ان کے خیال میں خلوت تخلیق کی ماں ہے ۔ قاضی صاحب تنہائی سے محظوظ ہوتے ہیں ۔

قاضی عبدالستار مستعلیق زندگی کے خواہاں ہیں ۔ خوش لباس، خوش خوراک اور کڑوی زبان ۔ ان کی چائے بھی کسی کسی کو میسر ہوتی ہے ۔ ریسرچ اسکالرس حتیٰ کہ اساتذہ

بھی ان کے پاس جانے اور گفتگو کی ہمت نہیں کر پاتے۔ اگر وہ کسی کو چائے پلاتے ہیں تو یقیناً اس میں کوئی خوبی ہو گی۔

قاضی صاحب کا روزانہ آٹھ گھنٹہ مطالعہ، تحریر و تصنیف میں گذرتا ہے۔ یہ معمول ادبی زندگی کی ابتداء سے ابتک قائم ہے۔ پڑھنا لکھنا ہی ان کی زندگی کا دوسرا نام ہے گویا ادب زندگی ہے اور زندگی ادب۔ ادبی مشغولیت نے اتنی فرصت اور ملازمت کی تنخواہ نے اتنی سہولت نہیں دی کہ رہائش کے لئے ایک مستقل ذاتی مکان بنوا لیتے۔ اور آج کے ہندوستان جنت نشان میں محض ایک نوکری سے گھر کی تعمیر کارفرہاد سے بڑھکر ہے۔

قاضی صاحب "جنوادی لیکھک سنگھ" کے سرپرست ہیں۔ جنوادی لیکھک سنگھ ہندوستان میں اردو ہندی ادیبوں کے قریب آنے کا بہترین پلیٹ فارم ہے۔ سنگھ نے اس دعوے کا عملی ثبوت بھی دیا ہے۔ قاضی صاحب کو موجودہ ترقی پسند تحریک اور اس کے کارکنان سے سخت بیزاری ہے۔

قاضی عبدالستار کے ناول، افسانے اور مضامین ہندوپاک کے بڑے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ شکست کی آواز"، شب گزیدہ"، مجو بھیا"، صلاح الدین ایوبی"، بادل"، غبار شب"، داراشکوہ"، غالب"، حضرت جان"، یہ تمام ناول شائع ہو چکے ہیں۔ خالد بن ولید جلد ہی منظر عام پر آنے کو ہے۔ صلاح الدین ایوبی" کے علاوہ دوسرے سبھی ناولوں کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ شب گزیدہ، مجو بھیا، اور شکست کی آواز" ناولوں کو اسکرپٹ اور ڈائیلاگ کی صورت ڈاکٹر راہی معصوم رضا دینے والے تھے مگر افسوس اس سے پہلے ہی وہ اس جہاں سے گذر گئے۔

ناول "داراشکوہ" کو ساہتیہ اکادمی ہندوستان کی چودہ زبانوں میں شائع کر رہی ہے۔ ناول غالب کا ترجمہ گجراتی میں ہو چکا ہے۔

افسانہ " مالکن " پر ٹی۔ وی سیریل اسد علی شاہ بنا رہے ہیں۔ ناول "داراشکوہ" دہرہ دون ملٹری اکیڈمی کے نصاب میں شامل ہے۔ اس ناول کا مختصر حصہ بہار کے سکنڈری اسکول میں اردو نصاب کی بھی زینت رہ چکا ہے۔

قاضی عبدالستار ابتک اردو فکشن کا پہلا غالب ایوارڈ، پدم شری، اترپردیش کے دو انعامات، میر ایوارڈ، نام پتر، عالمی اردو ایوارڈ، دیگر ریاستی ایوارڈ سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ لکھنو ٹیلی وژن نے "ماسٹرس آف انڈیا" نام کی سیریز میں قاضی عبدالستار کی حیات اور کارنامے

پر نوے منٹ کی ڈاکومنٹری فلم ۲۱ / ۱ اکتوبر ۱۹۹۱ کو ٹیلی کاسٹ کیا۔

قاضی صاحب کے تنقیدی مضامین کی تعداد دو درجن ہے۔ ان مضامین کے ترجمے بھی ہندوستان کی دیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

قاضی عبدالستار نے تقریباً تین درجن افسانے لکھے ہیں۔ یہ افسانے ان کے ناولوں کیطرح ہندوستان کے دیہات، شہر اور تاریخ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

قاضی عبدالستار نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا۔ سیتاپور کے چھوٹے موٹے مشاعروں میں دوستوں کے ساتھ شرکت کرنے پر شعر سے رغبت ہوئی اور ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہنے لگے۔ ان کے دادا کے دوست سیتاپور کے مشہور شاعر بابو کرشن لال شیدا نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ان کی معمولی غزلوں کی اصلاح اتنی محبت سے کرتے تھے کہ وہ عمدہ غزل بن جاتی تھی۔ ۱۹۵۴ میں جب وہ ایم۔اے کے طالب علم تھے تو فراق سے پہلے ان کی نظم شائع ہوئی تھی۔

قاضی عبدالستار کو شاعری میں وہ تسکین نہیں ملی جو افسانے اور ناول میں میسر آئی اپنے آپ کو کھونے اور پانے کی لذت نے انھیں نظم سے نکال کر نثر کے کوچے میں ڈال دیا۔ ان کا پہلا افسانہ "اندھا" کے نام سے لکھنؤ کے جریدہ "جواب" میں ایڈیٹر شارب لکھنوی کے آدھے صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ ۱۹۴۶ میں شائع ہوا تھا۔ ان کی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۴ سے ہوتا ہےجب انھوں نے "پیتل کا گھنٹہ" لکھا جو ماہنا کتاب (لکھنؤ) میں شائع ہوا۔ پہلا ناول "شکست کی آواز" ۱۹۵۴ میں لکھا۔ ۱۹۵۸۔۶۰ میں مجروح سلطانپوری اس ناول کو بمبئی لے گئے اور اسے ایک بڑے معیاری رسالے میں چھاپا جس میں بڑے بڑے مصنفوں کی نئی تخلیقات کو بھی موقع نہیں ملتا تھا۔ اسی ناول کو ہندی میں "پہلا اور آخری خط" کے نام سے الہ آباد میں چھاپا گیا۔ ۱۹۶۲ میں ناول "شب گزیدہ" کے منظر عام پر آتے ہی قاضی عبدالستار اردو کے بڑے ناول نگاروں میں شمار ہونے لگے۔ اس ناول پر احسن فاروقی اور ممتاز شیریں نے اچھے تبصرے کیے۔ جمیلہ ہاشمی اور احسن فاروقی نے "شب گزیدہ" کو سو سو بار پڑھا تھا۔ افسوس کہ دونوں انتقال کر گئے۔ جس نے بھی ان کے ناول کو سراہا اور نیا رنگ روپ دنیا چاہا اسے موت نے موقع نہ دیا۔ ستیہ جیت رے دارا شکوہ پر اور راہی معصوم رضا دیگر ناولوں پر فلم بنانا چاہتے تھے۔ شاید اسے قاضی صاحب کی بد قسمتی کہا جا سکتا ہے۔

قاضی عبدالستار کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی اس کی Authenticity ہے ان کی ہر کہانی کسی نہ کسی سچے واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسی پر افسانہ لکھا ہے۔ ان کا تعلق سیتاپور کے زمیندار گھرانے سے رہا ہے اس لیے زمینداروں کی زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ انھوں نے بہت قریب سے کیا ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں زمینداروں اور تعلقداروں کا کردار ہی بنیادی ہوتا ہے۔ یہ کردار ظاہر کرتے ہیں کہ پریم چند اور ان کے متقدمین کے یہاں جس طرح ظالم و جابر دکھایا گیا ہے یہ سچائی کا صرف ایک رخ ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ ذی حیثیت زمیندار بھی ہمدرد، منصف، رحمدل اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زمینداروں کی گذشتہ آن بان کی جگہ صرف نام و نشان نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ یہ زمیندار مفلسی اور غربت کے قعر مذلت میں بری طرح ڈوب گئے ہیں۔ ان سے ہزار گنا بہتر ان کے وہ نوکر، سپاہی اور مزدور ہیں جو کبھی ان کی عدالت میں جوتے کھاتے تھے اور آج وہی سرپنچ عدالت کا فیصلہ کررہے ہیں۔ قاضی عبدالستار اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے دیہات میں بڑا فرق ہے۔ قاضی صاحب کے دیہات میں کل کا زمیندار، مالکن اور چودھری آج خوار و زبوں ہے۔ روزی، روٹی، لباس اور گھر کا محتاج ہے اور کل کا مفلس، غریب، مزدور، نوکر، کسان، سپاہی، چمار آج سرپنچ، لالہ، سرمایہ دار، منصف، مکھیا، پردھان، بی۔ ڈی۔ او۔ آئی اے ایس، ایم۔ ایل۔ اے، ایم پی اور وزیر ہے۔ پیتل کا گھنٹہ، میراث، ممواں لالہ، کھا کھا، رضو باجی، ٹھاکر دوارہ، مجری، گرم لہو میں غلطاں، سایہ، سوچ میں اسی حقیقت کے جلوے بکھرے نظر آتے ہیں۔

قاضی صاحب کے افسانوں کو تین خانوں میں رکھا جاسکتا ہے۔ دیہات، شہر اور تاریخ۔ دیہات پر لکھے گئے مشہور افسانوں کے نام یہ ہیں۔ "روپا"، "سینگ"، "وراثت"، "کھا کھا"، "پیتل کا گھنٹہ"، "مالکن"، "رضو باجی"، "پرچھائیاں"، "نازو"، "ممواں لالہ"، "واپسی"، "دو گانواں"، "دیوالی"، "ٹھاکر دوارہ"، "قد آدم مشعل"، "ساحلی"، "ایک کہانی"، "گھسو"، "میراث"، "مجری"، "دھندلے آئینے"، "گرم لہو میں غلطاں"، "لومی" اور "سایہ"۔

شہری زندگی سے متعلق افسانوں کے نام اس طرح ہیں۔ "سوچ"، "ماڈل ٹاون"، "پہلی موت"، "آڑے ترچھے آئینے"، "جنگل"، "مشین"، "ایک دن"، "کتابیں"، "داغ" اور "تحریک"۔

تاریخی موضوعات پر یہ افسانے لکھے ہیں۔ "غادرہ"، "آنکھیں"، "نیا قانون"، "سات سلام"

اور بھوے بسرے"۔

قاضی صاحب نے اودھ کے دیہات اور جاگیردارانہ تہذیب کے علاوہ شہری مسائل پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ ایسے افسانوں کی تعداد کم ہے۔ ان افسانوں میں ان کا وہ رنگ نظر نہیں آتا جو دیہات اور تاریخ پر مبنی افسانوں میں ملتا ہے۔ چہ جائیکہ ان کے شہری افسانے دیہات کے افسانوں کے مقابلے میں دوئم درجے کے ہیں تاہم ان کی بھی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ یہاں نئے تجربے ملتے ہیں۔ سوچ، ماڈل ٹاون، جنگل، ایک دن، کتابیں، تحریک، بلاعنوان، پہلی موت، آڑے ترچھے آئینے، مشین اور داغ، میں شہروں کی بدلتی ہوئی قدروں، جذبوں، رشتوں، اور روایتوں کی بڑی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔

"بادل"، "سوچ"، "جنگل"، "داغ"، "دھندلے آئینے" اور زنجیریں" میں چشمۂ شعور کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ حرفوں کی صلیب ایک تجریدی افسانہ ہے۔ قاضی عبدالستار کے خیال میں تکنیک بازی کمزور دماغوں کی شعبدہ بازی ہوتی ہے۔ افسانہ تو اول و آخر افسانہ ہی ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں اپنے تجرباتی افسانے بھی پسند نہیں ہیں۔

قاضی صاحب نے تاریخ پر بھی افسانہ لکھا ہے۔ عام طور پر تاریخ کے بڑے واقعات کا علم قاری کو ہوتا ہی ہے اس لیے اسے کہانی کی شکل میں پڑھنا اکثر تضیع اوقات سمجھا جاتا ہے مگر قاضی صاحب کے تاریخی افسانوں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کے ہر واقعے کو اسقدر دلچسپ، حقیقی، پراثر اور جاندار بنا کر پیش کیا ہے کہ ماضی جسم و روح کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ ہندی کے آچاریہ چتر سین شاستری، برندابن لال ورما اور اردو کے عزیز احمد اور قرۃالعین حیدر کیطرح قاضی عبدالستار نے بھی تاریخ کو ادب بنا کر حال کے مسائل کا حل ماضی میں بھی تلاش کرنے کی فنکارانہ کوشش کی ہے۔ "داراشکوہ"، "صلاح الدین ایوبی"، "خالد بن ولید" ناولوں کیطرح افسانے آنکھیں، نیا قانون، سات سلام، بھولے بسرے اور غادرہ میں قرون اولیٰ سے لے کر مغلیہ سلطنت تک کے تاریخ ساز واقعات کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ ان ناولوں اور افسانوں کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہمیں سالار اعظم خالد بن ولید، شہنشاہ سلطان صلاح الدین ایوبی، داراشکوہ، اورنگ زیب، بہادر شاہ ظفر، جہانگیر اور واجد علی شاہ کی اس تہذیب و تمدن اور کلچر سے روشناس کراتی ہے جس سے بیشتر افسانہ نگار اور قاری بھی ناواقف ہیں۔

تاریخ، شہر اور دیہات کے تمام افسانوں کی زبان اس قول کی دعویدار ہے کہ اس کا خالق ایک صاحب طرز افسانہ نگار ہے ۔ دیہات، شہر اور تاریخ کے پس منظر میں قاضی صاحب کا اسلوب بھی نیا آہنگ اختیار کرلیتا ہے ۔ اس اسلوب میں اودھی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے فنی تناسب کی بہترین مثال ان کے افسانوں میں پائی جاتی ہے ۔ اسی لیے وہ موپاساں کے بجائے فلابیر کو پسند کرتے ہیں ۔ قاضی عبدالستار کے یہاں ایک لفظ بھی کم اور زیادہ نہیں ہوتا ۔ ان کے خیال میں ناسئانے اتنا عظیم ہے کہ ہمیں اس کی نقل نہیں کرنی چاہیئے ہندی افسانہ نگار شرت چندر اور رینو کے وہ مداح ہیں ۔

قاضی صاحب کے اسلوب پر غالباً پہلی کتاب پاکستان میں شائع ہوئی ہے ۔ افسانہ نگاروں اور ان کے افسانوں پر کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ واحد کتاب ہے جو کسی کے اسلوب کا محاکمہ کرتی ہے ۔

قاضی عبدالستار کے اسلوب کی یہ شان ہے کہ وہ موضوع کے موافق اس کی تشکیل کرتے ہیں یہ صفت خدا عظیم فنکاروں ہی کو عطا کرتا ہے ۔ محمد حسین آزاد کے بعد اردو کے معدودے افسانہ نگار اس وصف سے متصف ہیں ۔ عزیز احمد میں یہ تجلی موجود تھی ۔ محمد حسین جاہ، محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد اور شبلی نعمانی کی تحریروں میں اس اسلوب جلیل کی کہیں کہیں صرف جھلکیاں نظر آجاتی ہیں مگر قاضی عبدالستار اس طرز میں بہت دور تک جاتے ہیں ۔ ان کے یہاں صفحے کے صفحے موجود ہیں ۔ "داراشکوہ" میں ساموگڑھ کی لڑائی کا منظر پچاس ساٹھ صفحات پر اپنے جلال و عظمت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے اور غالباً اس کے مغل جنگی طریقہ کار (Mughal War Fare) کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی دہرہ دون ملٹری اسکول نے اسے اپنے نصاب میں شامل کرلیا ہے ۔ اس ناول کا مختصر حصہ بہار سکنڈری اسکول کے نصاب کی بھی زینت ہے ۔ معین احسن جذبی کی رائے ہے کہ "قاضی عبدالستار نے داراشکوہ میں استعارات کا جلوس نکال دیا ہے" ۔

قاضی عبدالستار کے اسلوب کا یہ اعجاز ہے کہ وہ چند جملوں میں پورا سماں باندھ دیتے ہیں ۔ وہ منظر اور پس منظر دونوں کو زندہ کر دیتے ہیں ۔

شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں کہ "قاضی عبدالستار Paradoxes کے بادشاہ ہیں ۔ ان کا فن ایڈ گر ایلن پو کی یاد دلاتا ہے ۔ ان کے قلم میں گذشتہ عظمتوں اور کھونے ہونے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے ۔ ان کی سب سے بڑی قوت ان کی

حاضراتی صلاحیت ہے جو دو جملوں میں کسی مکمل صورت حال کو زندہ کر دیتی ہے۔ ایڈ گر ایلن پو کیطرح اس سے انتہائی مختلف سیاق وسباق میں وہ نفسیات کو اجاگر کرنے کے بادشاہ ہیں"۔

قاضی عبدالستار کے افسانوں کی بڑی خوبیاں حقیقت نگاری زندگی آمیز کردار، فضا بندی، تاثر، دلچسپی، تہذیبی پس منظر اور اسلوب جمیل و جلیل ہیں۔اس تہذیبی نشیب و فراز سے ان کے ناول بھی گذرتے ہیں۔ صلاح الدین ایوبی "داراشکوہ" غالب "غبار شب"، بادل"، مجو بھیا"، شب گذیدہ"، خالد بن ولید"، میں اودھ، دہلی، کلکتہ اور فلسطین کے شہنشاہوں، بادشاہوں، جاگیرداروں، امراؤں اور زمینداروں کی فتح و شکست، جنگ و جدل، عشق و محبت اور حیات و موت کی دنیائیں آباد ہیں۔افسانوں میں خاص طور پر آنکھیں، بھوے بسرے، پیتل کا گھنٹہ، رضو باجی، سات سلام اور غادرہ نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔

جسطرح "داراشکوہ" اور "خالد بن ولید" کا ایک ایک لفظ تاریخ کے سامنے جواب دہ ہے اسی طرح ناول "شب گذیدہ" کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک جملے میں اودھ کی جاگیر دارانہ تہذیب و تمدن اور عظمت و زوال کی تہذیبی تاریخ محفوظ ہے۔ مشہور ناول نگار قرۃ العین حیدر کا خیال ہے کہ "شب گذیدہ سے بہتر ناول قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں"۔

۱۹۶۰ کے بعد نئے لکھنے والوں نے خصوصاً ناول نگاری میں قاضی عبدالستار سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ قاضی صاحب کا اپنی تخلیق سے وہی رشتہ ہے جو شیر کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ مکمل غورو خوض، تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کے بعد ہی ان کی تخلیق منشۂ شہود پر آتی ہے۔پروفیسر قمر رئیس کے خیال میں۔"قاضی عبدالستار نئی پود کے نمائندہ ہیں وہ ناول کو قصے کی حیثیت سے دلچسپ بنانے کا گر جانتے ہیں۔ ان کی تخلیق قوت ہر کردار کو ایک روشن انفرادی پیکر بخشتی ہے۔اودھی بولی کے استعمال سے بھی انھوں نے اپنے کرداروں میں ارضیت اور زندگی کی روح پھونکی ہے"۔

قاضی عبدالستار ادبی کاوش کو شریفوں کا فن شریف سمجھتے ہیں اور افسانے کو نہایت مشکل فن جس میں ایک ایک لفظ کی اہمیت ہوتی ہے اور جسے مضبوط اور کسی حونی چار پائی کیطرح ہرطرف سے گٹھا ہوا ہونا چاہئے۔یعنی وہ تناسب کا اعجاز ہو۔ قاضی صاحب کے خیال میں فن افسانہ شاعری سے عظیم اور جزو خدائی کی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے۔

اگر شاعری جزو پیغمبری ہے تو افسانہ نگاری جزو خدائی اور دلیل اس دعوے کی

یہ ہے کہ صحائف آسمانی نثر میں موجود ہیں اور افسانوں سے معمور ہیں"۔ ۱۹۶۰ء کے بعد افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں قاضی عبدالستار ایک بہت ہی معتبر نام ہے۔انھوں نے پریم چند کی ادبی میراث کی حدود میں مزید توسیع کی ہے۔انھوں نے اردو افسانے کے ساتھ ساتھ اردو ناول نگاری میں بھی اضافے کئے ہیں۔اردو ناول کو عالمی ناولوں کے سامنے لا کھڑا کرنا ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ممتاز شیرین کے خیال میں "داراشکوہ اردو کا پہلا ناول ہے جسے ہم دنیا کے بڑے ناولوں کے ساتھ رکھ سکتے ہیں"۔ پروفیسر احسن فاروقی نے لکھا ہے کہ" قاضی عبدالستار کے ناولوں سے عالمی معیاروں کی خوشبو آتی ہے"۔

قاضی عبدالستار نے اردو افسانے اور ناول کو اسلوب جلال سے نوازا ہے۔قاضی عبدالستار اردو ادب کے معیار،میزان اور اعجاز کا نام ہے۔

ایسی شخصیتوں سے ادب پڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں "ہم قاضی عبدالستار کی بڑائی کو اس لیے نہیں سمجھ پارہے ہیں کہ وہ ہمارے زمانے میں ہیں"۔ ہندی کے مشہور ادیب بابانا گرجن نے الہ آباد میں دے گئے استقبالیہ میں (۱۹۶۴ میں) قاضی عبدالستار کو "دوسرا پریم چند" کہا تھا۔

قاضی عبدالستار ایک کامیاب افسانہ کیلئے جاندار کردار، کہانی ،اختصار،فطری جذبات، اور فطری زبان کو لازمی سمجھتے ہیں۔ان کے الفاظ میں :-

"افسانہ اگر بہترین افسانہ ہے تو ادب کی تمام اصناف میں سب سی مشکل صنف ہے اس کی ابتدا محدود ہے۔کرداروں میں زندگی پیدا کرنا بنیادی قدر ہے۔کہانی کھولنا، نقطۂ عروج کا پیدا کرنا اور پھر افسانے کو اسطرح سمیٹ لینا کہ سارا عمل دس ہزار الفاظ کے آنگن ہی میں رہے عام طور پر اس کی ایک مشکل شرط ہے ------------اچھے افسانے کا قطعی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ زندہ آدمیوں کو فطری زبان میں فطری جذبات کا اظہار کرنا چاہئے اور حقیقت پر مبنی عمل کرنا چاہئے۔ملکہ حسن کیطرح اس کا جسم نئی بنی ہوئی چارپائی کیطرح تنا ہوا اور گتھا ہوا ہونا چاہئے-------------دیکھا گیا ہے کہ کہانی کے میدان میں انھیں لوگوں نے کارنامے انجام دیے ہیں۔جو قلم کی چند جنبشوں اور ابرو کے چند اشاروں سے معنی کی پوری کی پوری دنیائیں روشن کردیتے ہیں۔ماضی کے ہاتھ میں آئینہ پکڑا دیتے ہیں۔ تقدیر کے بطن میں سوئے ہوئے مستقبل کی ایسی بشارت دیتے ہیں کہ ایک ایک تفصیل آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی ہے۔حال کے سیال موضوعات جو پرچھائیوں کیطرح ہاتھوں

سے نہیں سنبھلتے ٹھوس مادی اشیا کی مانند مٹھی میں اسیر نظر آتے ہیں"۔

مندرجہ بالااقتباسات کی حقیقی تصویر قارئین کو اس مجموعے کے افسانوں میں نظر آئیگی قاضی عبدالستار کے افسانے پہلی بار مجموعے کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔افسانے "آخری چراغ"،واپسی"،دو گانواں"،قد آدام مشعل"، گھسو"،پہلی موت"،آڑے ترچھے آئینے، مشین"،داغ"،دھوئے گئے کچھ ایسے"،غادرہ"،سات سلام"،آخری نذر"،سینگ"،وراثت"، "بلاعنوان"اور جوتے کا خطبہ"اس مجموعے میں ضخامت کی بنا شامل نہیں کئے جاسکے۔ انشا۔اللہ یہ کسی دوسرے مجموعے کی زینت بنیں گے۔ہماری سعئی سطحی آپ کی نگاہ عمیق کے روبرو حاضر ہے۔

ڈاکٹر محمد غیاث الدین

قاضی عبدالستّار

کے

بہترینؔ افسانے

ٹھاکر دوارہ

بڑے باغ کے دھورے پر ڈھول تو سانجھ سے بج رہے تھے لیکن اب ان کی گدے کھائی آواز میں لیزم کی تولی گوٹ بھی ناکی جانے لگی ۔ چتمبر پاسی نے چلم منہ سے نکال کر کان کھڑے کئے اور کہنزلی ۔ اب گدے کھائی آواز پر لگی تو گوٹ کے اوپر مدراپاسی کی چہچہاتی آواز کے گول گول ٹھپے بھی پڑنے لگے تھے ۔ چتمبر نے چلم مانچی پاس ہی دھری نیانی میں جھونک دی اور اپنے بھاری گھٹنوں پر جو جہازی پلنگ کے تیل پلائے پایوں کیطرح ٹھوس تھے دونوں ہاتھ رکھ کرکھڑا ہوا تو اس کے سر کا مریٹھا چھپر کے بانس سے لڑ گیا ۔ ساتھ ہی تدواری سے بڑ کنو کی مہتاری نکلی جو اونچے ٹھائے اور چوڑے ہاڑ کی بہنی کنی ادھیڑ عورت تھی ۔ اس کے پیروں میں کالے پرمٹے کالہنگا اور سر پر تول کا لمبا چوڑا اوڑھنا لہریں لے رہا تھا اور دونوں کالے ہاتھوں پر پیتل کی تھالی دھری تھی ۔ تھالی میں دھرے پیتل سے ڈھکے لوٹے کے پاس ہی مٹی کا چراغ جل رہا تھا اور تلپوری کے ڈھیر پر گڑ کی سنہری ڈلیاں چمک رہی تھیں اور اس کے دونوں کندھوں سے لگی دونوں بہوئیں چل رہی تھیں جو لال پیلی دھوتیوں میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی تھیں لیکن ان کے چاروں ہاتھ باہر تھے ۔ چاندی اور لاکھ سے جڑے ہوئے ہاتھوں کے ایک جوڑے پر کمان اور پانچ تیر رکھے تھے ۔ اور دوسرا جوڑا مٹی کی ایک مٹکی سنبھالے ہوئے تھا ۔ چتمبر سر نہوڑا کر چھپر سے نکلا اور بیچوں بیچ آنگن کھڑا ہوگیا ۔ بڑا کنو کی مہتاری نے تھالی اس کے چہرے کے سامنے تین بار نچا کر روک لی ۔ چتمبر نے گڑ کی ڈلی اٹھا کر منہ میں ڈال لی ۔ بڑکنو کی مہتاری نے پتل بنا کر لوٹے سے رنگ کا ایک چلو بھرا اور چتمبر کے ننگے لنکلاٹ کے چوبندے پر چھڑک دیا اور وہ اس طرح سرخ ہو گیا جیسے اس نے اپنے تیر سے شکار کئے ہوئے زخمی بڑیلے کو دونوں بازوؤں میں بھر کر داب لیا ہو اور خونم خون ہوگیا ۔ چتمبر نے آسمان کیطرف دیکھا ۔ چندرماں سر کے اوپر آچکا تھا ۔ اس نے بڑی بہو کے ہاتھ سے کمان لے کر ماتھے سے لگائی ۔ چھوٹی بہو کی ہتھیلی سے ایک تیر اٹھا کر ہونٹوں سے چوما اور دونوں ہاتھوں سے مٹکی اٹھا کر منہ میں

انڈیل لی اور وہ تینوں عورتیں مٹی کی ڈھلی مورتیوں کیطرح کھڑی گھٹ گھٹ کی آوازیں سنتی رہیں ۔ جب مٹکی خالی ہو گئی اور چھوٹی بہو نے سنبھال لی تو بڑ کنو مہتاری نے ہتمبر کے چارپائی جیسے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اب کی ہولی ہم کا دے دیو"

"دیا"

اور دونوں بہوؤں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے تروا ہے میں کھڑے ہوئے ہل کی منٹھیا پکڑ کر پرنام کیا۔ چار جوڑے لمبے چوڑے بیلوں کے کندھے پر تھپکیاں دیں ۔ ہاتھی ایسی بندھی ہوئی مندرانی بھینس کے این پر انگلیاں پھیریں اور باہری دروازے کے کپاٹ سے لگا لوہے سے منڈھا اور تیل سے سینچا ہوا سات ہاتھ کا لٹھ اٹھا کر چوما اور کندھے پر رکھ کر باہر نکلا ۔ دہلیز سے اترا تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اپنے پاؤں پرائے معلوم ہونے لگے اور کھوپڑی میں آندھی چلنے لگی ۔ دور پاس سے پالا گن اور جے جے کار کی آوازیں سبیرا کرتی چڑیوں کی چہکار بن گئیں اور وہ جھومتا جھامتا بڑے باغ کی داتنی پر آ گیا جہاں اس کے بھائی بھتیجے جانے بوجھے بچے یار دوست اس کا انتظار کر رہے تھے ۔ اس نے جاتے ہی ایک لونڈے کے ہاتھ سے مشعل چھین لی اور نئی پرانی اور سوکھی تازی لکڑیوں کی چھوٹی سی پہاڑی میں جھونک کر نعرہ لگایا۔

"جے ہولکارانی کی"

اور لمبے چوڑے ڈیل ڈول پر لال دھوتی اور چمرودھے جوتے پہنے مدورا لٹو کیطرح ناچنے لگا اور ڈھول تاشے اور لیزم اور جھانجھ سب ایک ساتھ مل کر آوازیں انڈیلنے لگے ۔ جیسے ساون بھادوں میں ہتھیا نکھت برس رہا ہو اور وہ گردن گردن پانی میں کھڑا ہو اور پانی بڑھتا جا رہا ہو اور ہاتھ پاؤں جواب دیتے جا رہے ہوں ۔ جب وہ "ہوری" گاتے گاتے ڈوبنے لگا تو ہاتھوں کے چپو اسے سہارے گئے ۔ نکال کر لے گئے اور اسے نہیں معلوم پھر کیا ہوا۔ جب آنکھ کھلی تو وہ اپنی تدواری کے پلنگ پر لیٹا تھا اور سارے آنگن میں کڑوی دھوپ چھائی تھی اور اس کے نیچے چھپروں میں اور تروا ہوں میں نرا آدمی اچھل رہا تھا ۔ نری عورتیں اچھل رہی تھیں ۔ نرے لڑکے کود پھاند رہے تھے اور معاملہ رنگ سے اتر کر کیچڑ اور گوبر پر آ چکا تھا ۔ ابھی وہ اپنے اندر کے بھاری پن سے جوجھ رہا تھا کہ ایک طرف سے درگا نکلا اور دارو کا ادھ سیرا کلھڑ اس کے منہ سے لگا دیا ۔ اور پھر وہ لیپ دیا گیا ۔ پوت دیا گیا ۔ نہلا دیا گیا ۔ پھر

کندھوں پر اٹھا لیا گیا اور گاؤں کے کھلیاروں کو چھان دیا گیا اور گھروں کو متھلیا گیا اور جب دوپہر ڈھلنے لگی تو اپنے دوارے پہنچا۔ کنویں پر منجھلنو اور چھنکنو نہار ہے تھے اور صابن بہار ہے تھے اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ چھپر کے نیچے کھٹیا پر ڈھیر ہو گیا۔ بڑی دیر کے بعد کسی نے اس کا انگوٹھا پکڑ کر ہلا دیا۔ اس نے دھواں دھار آنکھیں کھول دیں۔ سامنے بڑکنو کی مہتاری کھڑی تھی۔ لال لال اوڑھنی لال کرتی لال لہنگا بالوں میں تیل آنکھوں میں کاجل دانتوں میں مسی اور ہونٹوں پر ہنسی۔ اس نے اس کر ایک بار دیکھا۔ ہنسی باچھوں سے نکل کر کانوں تک پہنچ گئی تھی۔

"چلو پانی دھرا ہے نہالیو"

وہ کھٹیا سے اس طرح جیسے ہاتھی بیٹھ کر اٹھتا ہے۔ ایک ایک جوڑ کو سبج سبج سنبھال سنبھال کر چلا اور کنویں کی جگت پر بیٹھ گیا۔

سانجھ ہو رہی تھی لیکن دھوپ میں دھار باقی تھی۔ آدھی دھوتی باندھ کر اور آدھی لپیٹ کر اٹھا۔ دروازے پر بڑکنو کی مہتاری راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تدواری کے پیچھے لے گئی۔

"آج یا دھوتی باندھو"

کرتا پہنو۔۔۔۔چادر باندھو۔۔۔۔ایک کندھے پر دھنئی (کمان) اور ایک پر تیر سجاؤ اور ہم کا لئے کے دوارے چلو۔ تم تال دیو ہم ناچیں۔

"دوارے" جیسے کمان کو کان تک کھینچ کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

ہاں۔۔۔۔مالک کے دوارے نہا کر دوارے"۔

اور جیسے پوری کوٹھری کی فضا برچھی کی نوک پر تل گئی۔

"بھا گیہ وان۔۔۔۔مالک کو مریں پانچ برس ہونے گئیں"۔

"ہاں ہمار گھر ماں بھی پانچ موتیں ہونے گئیں"۔

"پانچ موتیں"

ہاں۔۔۔۔پانچ موتیں۔۔۔۔بڑی بھینس مری پہلے۔ پھر لال جوڑ کر بڑی بدھیا مری۔ پھر بڑکنو مرے۔۔۔۔ پھر سنجھلنو مرے۔۔۔۔ پھر منجھلنو کی دلہن مری پانچ ہونے گئیں۔

مالک کا پورا دوارہ کرانے پر اٹھ گوا۔ کہوں گودام ہے۔ کہوں ہسپتال ہے کہوں

دپھتر ہے۔

"مل دوارہ تو ہے۔۔۔۔۔او تو کوڈ نا نئیں اٹھانے لئے گوا۔۔۔۔"۔

"واجگہ تو ہے جہاں دادا پہ دادا ناچت رہیں۔تیج تہوار کے دن سب اپنی جگہ پہ آوت ہیں۔۔۔۔سب پھیر کرتے ہیں۔سنو۔۔۔۔بڑکنو مر گئے مل ہمرے لئے جندہ ہیں۔ترے لئے جندہ ہیں۔۔۔۔۔ تم ہم کا بڑ کنو کی مہتاری کا ہے کہت ہو"۔

مل بڑکنو کی مہتاری یو نا نئیں ہونے سکت۔۔۔۔۔یو نا نئیں ہو سکت اور وہ باہر جانے کے لئے مڑنے لگا تو بڑ کنو کی مہتاری نے اس کی دھوتی پکڑلی۔بڑے پاسی کے پوت ہو۔رات کا بچن دیت ہو اور سبیرے چھین لیت ہو۔تدواری سے گذرتے ہوئے یہ جملہ لاٹھی کیطرح اس کے کان پہ لگا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔لیکن پھر سنبھل کر پورے قدموں سے زینے کیطرف چلا چھپر میں دونوں بہوئیں گھونگھٹ کاڑھے کھڑی تھیں۔اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"کوئی آوے تو کہہ دینا نا ئیں ہیں۔۔۔۔ کہوں ہولی ملے گئے"

زینے کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا جیسے بڑکنو کی مہتاری کے منہ پر لٹھ مار دیا ہو۔تینوں عورتیں کھڑی اس کے پیروں سے دھچکتی سیڑھیاں گنتی رہیں۔وہ بنگلے میں بڑے جہازی پلنگ پہ ڈھیر ہو گیا۔بڑ کنو کی مہتاری نے پھر اس کے کان میں کاٹ لیا۔

"پاسی کے پوت"

ہنھ۔۔۔۔۔کوئی ٹھا کر کہہ کے دیکھے تو سینے پہ چڑھ کے نئی سے خون پی لیوں۔وہ ابلتا رہا۔کھولتا رہا۔لمبے لمبے سانس بھرتا رہا۔جب بے چینی اس کے تلووں سے ٹپکنے لگی تو وہ منڈیر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔نیچے سارا دریاپور بچھا تھا۔داناپور راج کا تخت گانوں۔

راج باسیوں کا کھرا گاؤں جو ایک ہی چاچا بابا کی اولادیں تھے۔دن میں نوکری کے نام پہ داناپور راج کیطرف لاٹھیاں اٹھاتے اور کمائیں کڑ کاتے اور رات میں رہزنی کرتے اور ڈاکے ڈالتے۔جب پکڑ ہی لیے جاتے تو داناپور راج انکی ضمانت کرتا اور مقدمے لڑاتا۔اگر سزا ہو جاتی تو ان کی بیوی بچوں کی ایسی رکھوالی کرتا جیسے وہ گھر میں نہیں سسرال میں ہوں۔کیسا دن تھا وہ بھی۔سبیرے جمینداری فیل ہونے کی ڈگی بجی اور سانجھ ہوتے ہوتے "بابا" مار ڈالے گئے۔ابھی پولیس کی ہاہا کار مچ رہی تھی کہ ٹھا کر نواب علی کی سواری آ گئی۔ہاتھی سے اترتے ہی مقتول دلاور پاسی کے بیٹے چتمبر پاسی کی طلبی ہوئی۔وہ جیسے ہی پاؤں

چھونے کو جھکا اسے کندھوں سے پکڑلیا۔

"پہتمبر"

"مالک"

"تمہارے مقتول باپ کا مقدمہ ہمارا ہے۔ یہ کٹھار تمہارا ہے۔ بڑا باغ تمہارا ہے۔ دریاپور کی سرکاری آراضی تمہاری ہے۔ تمہارے باپ کی جگہ ہمارے پلنگ کا پہرہ بھی تمہارا ہے"۔

اتنی بہت سی چیزیں ایک ساتھ پا کر وہ بو کھلانے بھی نہیں پایا تھا کہ ٹھا کر کھڑی سواری سدھار گئے۔

اور اس شام جب وہ دریاپور کا پردھان چن لیا گیا تو بندوق چھوڑتے اور گولے داغتے ہجوم کے ساتھ سرکار کو سلام کرنے دوارے پہنچا۔ دالان پہ پہرہ کھڑا ہو چکا تھا لیکن "ہال" کے پردوں سے آواز آئی کہ پہتمبر کو اندر بھیج دو۔

ٹھاکر کے سامنے خالی گلاس اور بھری بوتل رکھی تھی۔

"مبارک ہو"

"سرکار" اس کے منھ سے اور کچھ نکلا ہی نہیں۔

"آج سے تمہاری پہرے داری موقوف"

"سرکار"

"پلنگ کا پہرے دار گاؤں کی پردھانتا نہیں کر سکتا۔"

"سرکار"

"اور تم پردھانتا چھوڑ بھی نہیں سکتے کہ اگر ہم پہ اس سے بھی برا وقت آ گیا تو کم از کم ایک پردھان تو ہمارے ساتھ ہو گا"۔

"شراب پیتے ہو؟ انھوں نے گلاس بھر لیا۔

"مالک"

"مت پیا کرو شراب سوت برداشت نہیں کرتی۔ ہم اس لئے پیتے ہیں کہ ہمیں اس کی سوت نہیں لانا ہے۔ شادی اس لیے نہیں کی کہ بچے پیدا ہونگے اور جیسے جیسے بڑھتے جائیں گے نشہ گھٹتا چلا جائے گا اور شراب بوڑھی ہوتی چلی جائے گی۔ تم جا سکتے ہو۔"

"مالک"

"داناپور راج میں ٹھاکر نواب علی کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ تمہارا پہرہ ایک رسم تھا۔ بہت سی رسموں کیطرح آج یہ رسم بھی اٹھادی گئی۔"

"سپاہی"

"دریاپور کے پردھان ہتمبر جی کو باہر لے جاؤ۔ مٹھائی کھلاؤ حقہ پلاؤ اور رخصت کردو۔"

وہ کھڑا کانپ رہا تھا کہ ایک مضبوط ہاتھ نے اسے شانے سے پکڑ کر کمرے سے باہر کر دیا۔ اس نے کڑوی مٹھائی کھائی اور میٹھا حقہ پی لیا اور معلوم نہیں کیسے اپنے گھر پہنچ گیا اور پھر پردھانا کی پہلی ہولی آئی۔ سورج بیٹھتے بیٹھتے وہ اپنے پریوار کے ساتھ گڑھی پہنچ گیا۔ بہت سے سوانگ آرہے تھے اور جارہے تھے، جب سب چلے گئے تو اس کی عورتوں کو اندر اور مردوں کو باہر بلایا گیا اور پان حقے کی تواضع گئی اور جب رات ادھیانے لگی تو سرکار برآمد ہوئے۔

"پردھان ہتمبر ----- تمہارا اور تمہاری عورتوں کا یہ ناچ ہم کو پسند نہیں رہا۔ دنیا سنے گی تمہارے خلاف ہو جائیگی۔ تم کو ووٹ نہیں دے گی۔ تم کو پردھانا سے اتار دیگی"۔

"ناچ تو پرکھوں سے ہوتا آیا ہے ----- پردھانا تو آج آئی ہے ------ پردھان چنے جاتے ہیں ہتمبر پیدا ہوتا ہے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ سنک کے گھونٹ لیتے رہے اور تال کی ٹھیک دیتا رہا اور عورتیں ناچتی رہیں اور پچھلے برسوں سے زیادہ دیر تک اور مستی سے ناچتی رہیں۔ اس نے اپنے گالوں پر نمی محسوس کی۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ سارا گاؤں سوچکا تھا۔ ہتمبر جاگ چکا تھا۔ جس تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھا اسی تیزی سے اترا۔ آنگن میں تینوں عورتیں ایک ہی پلنگ پر سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ وہ اندر گیا۔ لال کناری کی نئی دھوتی باندھی۔ ململ کا کرتا پہنا۔ بھاگلپوری چادر کمر میں لپیٹی اور لال انگوچھے کا مرٹھا سر پر کس لیا۔ دونوں ہاتھوں سے کمان اٹھا کر چڑھائی اور چوم کر داہنے بازو پر ٹانگی۔ باپ کے بنائے تیروں کا ترکش پشت پر سجایا اور زری کا جوتا پہن کر چرمر کرتا باہر نکلا۔

"اٹھو بڑکنو کی مہتاری دوارے چلو"۔ وہ کوک بھرے کھلونے کیطرح اس کے ساتھ ہولیں۔ دروازے نکلتے نکلتے اس نے بہوؤں کو منع کیا لیکن وہ نہ مانیں۔ کسی کو دروازہ بند کرنے کی تاکید کرکے وہ سڑک پر ہولیا۔

چار جوڑ پیروں میں پہیے لگے تھے اور سڑک اس کی یادوں کیطرح گھستی جا رہی تھی ۔ پھر داناپور آگیا۔ گڑھی آگئی ۔ اس کے سواگت کے لئے پھاٹک اپنے دونوں پٹ کھولے کھڑا تھا ۔ محلسرا نے اور دیوان خانے کے بیچ کا پختہ فرش خالی پڑا تھا ۔ اس نے ہمیشہ کیطرح سیڑھیوں پر چڑھنے سے پہلے جوتے اتار دیے ۔ دیوان خانے کے دروازے کے جاگتے شیشوں کے پیچھے ہسپتال کے ساز و سامان نے اس کا سلام کیا ۔ پھر وہ الٹے پیروں گھوما اور ترچھا ہو کر دونوں پیر کھول دیے اور کمر میں خم دے کر تالی بجائی اور عورتیں ناچنے لگیں ۔ ناچتی رہیں ۔ جب ہوش آیا تو ان کے چاروں طرف بھیڑ جمع تھی اور سورج کی کرن پھوٹ رہی تھی ۔

———— • ————

رضو باجی

سیتاپور تحصیل سدھولی اپنی جھیلوں اور شکاریوں کے لیے مشہور تھی ۔اب جھیلوں میں دھان بویا جاتا ہے ۔ بندوقیں بیچ کر چکیاں لگائی گئی ہیں اور لائسنس پہ ملے ہوئے کارتوس "بلیک " کر کے شیروانیاں بنائی جاتی ہیں ۔۔یہاں چھوٹے چھوٹے قصبوں کا زنجیرا پھیلا ہوا تھا ۔ جن میں شیوخ آباد تھے جو اپنے مغرور ماضی کی یاد میں ناموں کے آگے خان لگاتے تھے اور ہر قسم کے شکار کے لیے غنڈے ، کتے اور شکرے پالتے تھے ۔ان میں سارن پور کے بڑے ،بھیا رکھو چچا اور چھوٹے بھیا پاچو چچا بہت ممتاز تھے ۔ میں نے رکھو چچا کا بڑھاپا دیکھا ہے ۔ان کے سفید ابروؤں کے نیچے سُرخ آنکھوں سے چنگاریاں اور آواز سے لپٹیں نکلتی تھیں ۔ رضو باجی انہی رکھو چچا کی اکلوتی بیٹی تھیں ۔میں نے لڑکپن میں رضو باجی کے حسن اور اس جہیز کے افسانے سنے تھے جسے ان کی دو سوتیلی صاحب جائداد مائیں جوڑ جوڑ کر مر گئی تھیں ۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں میراثنیں اتنے لقلقے سے ان کا ذکر کرتیں کہ نیڑھے بینچے لوگ بھی ان کی ڈیوڑھی پہ منڈلانے لگتے ۔ جب رضو باجی کی ماں مر گئیں اور رکھو چچا پہ فالج گرا تو انھوں نے مجبور ہو کر ایک رشتہ قبول کر لیا۔ مگر رضو باجی پہ عین منگنی کے دن جنات آگئے اور رضو باجی کی ڈیوڑھی سے رشتے کے "کاگا" ہمیشہ کے لیے اڑ گئے ۔ جب رکھو چچا مر گئے تو پاچو چچا ان کے ساتھ تمام ہندوستان کی درگاہوں کا پیکرمہ کرتے رہے لیکن جناتوں کو نہ جانا تھا نہ گئے ۔پھر رضو باجی کی عمر ایسا پیمانہ بن گئی جس کے قریب پہنچنے خوف سے سوکھی ہوئی کنواریاں لرزاٹھتیں جب بھی رضو باجی کا ذکر ہوتا میرے وجود میں ایک ٹوٹا ہوا کانٹا کھٹکنے لگتا اور میں اپنے یادوں کے کارواں کو کسی فرضی مصروفیت کے صحرا میں ڈھکیل دیتا ۔انھیں رضو باجی کا جب رجسٹری لفافہ مجھے ملا تو ایسا بدحواس ہوا کہ خط پھاڑ دیا ۔لکھا تھا وہ حج کرنے جارہی ہیں اور میں فورآ سارنگ پور پہنچ جاؤں لیکن اسطرح کہ گویا میں ان سے نہیں پاچو چچا سے ملنے آیا ہوں اور یہ بھی کہ میں خط پڑھنے کے بعد فورآ جلادوں ۔ میں نے رضو باجی کے ایک حکم کی فوری تعمیل کر دی ۔خط کے شعلوں کے اس پار ایک دن چمک

رہا تھا ۔ پندرہ سال پہلے کا ایک دن جب میں بی ۔اے ۔میں پڑھتا تھا اور محرم کرنے گھر آیا ہوا تھا۔

محرم کی کوئی تاریخ تھی اور سارنگ پور کا سپاہی خبر لایا تھا کہ دوسرے دن مسرکھ اسٹیشن پر شام کی گاڑی سے سواریاں اتریں گی ۔ ہماری بستی کے محرم سارے ضلعے میں مشہور تھے اور یہ مشہور محرم ہمارے گھر سے وابستہ تھے اور دور دور سے عزیز واقارب محرم دیکھنے آیا کرتے تھے اور ہمارا گھر شادی کے گھروں کیطرح گھم گھمانے لگتا تھا ۔اس خبر نے میرے وجود میں قمقمے جلا دیے میں رضو باجی کو جن کی کہانیوں سے میرا تخیل آباد تھا پہلی بار دیکھنے والا تھا ۔ عید کی چاندرات کے مانند وہ رات بڑی مشکل سے گذری اور صبح ہوتے ہی میں انتظامات میں مصروف ہو گیا ۔ چھوٹے چھوٹے ادھے جن کو پھر ک لہڑو بھی کہتے ہیں ۔ سنوارے گئے ۔بیل صابن سے نہلائے گئے ۔ان کو نئی اندھیریاں سنگوٹیاں اور ہمیلیں پہنائی گئیں ۔ دھراؤ جھولیں اور پردے نکالے گئے ۔ گھوڑے کے ایال تراشے گئے ۔ زین پر پالش کی گئی اور سیاہ اطلس کا پھیا باندھا گیا جو اس کے سفید جسم پر پھوٹ نکلا ۔ساتھ جانے والے آدمیوں میں اپنی نئی قمیصیں بانٹ دیں اور جیب خرچ سے دھوتیاں خرید دیں اور دوپہر ہی سے کلف لگی برجس پر لانگ بوٹ پہن کر تیار ہو گیا اور دو بجتے بجتے سوار ہو گیا جب کہ چھ میل کا راستہ میرے گھوڑے کے لیے چالیس منٹ سے کسی طرح زیادہ نہ تھا ۔ اسٹیشن ماسٹر کو جو ہمارے تحائف سے زیر بار رہتا تھا ، اطلاع دی کہ ہمارے خاص مہمان آنے والے ہیں اور مسافر خانے کے پورے کمرے پر قبضہ جما لیا۔ گاڑی وقت پر آئی لیکن ایسی خوشی ہوئی جیسے کئی دن کے انتظار کے بعد آئی ہو ۔فرسٹ کلاس کے دروازے میں سارنگ پور کا مونوگرام لگائے ایک بوڑھا سپاہی کھڑا تھا ۔ ڈبے سے مسافرخانے تک قناتیں لگادی گئیں ۔ آگے آگے پھوپھی جان تھیں ۔ایک رشتے سے رکھو چچا ہمارے چچا تھے اور دوسرے رشتے سے ان کی بیوی ہماری پھوپھی تھیں ، ان کے پیچھے رضو باجی ، پھر عورتیں ۔ تھرماس اور پاندان اور صندوقچے اٹھائے ہوئے آرہی تھیں ،چائے کا انتظام تھا ۔لیکن پھوپھی جان نے میری بلائیں لے کر انکار کر دیا اور فوراً اس ادھے پر سوار ہو گئیں جو تابوت کیطرح پردوں سے ڈھکا ہوا تھا ۔ رضو باجی بھی اس میں غروب ہو گئیں جن کے ہاتھ سیاہ برقعوں پر شعلوں کیطرح تڑپ رہے تھے ۔ دوسرے ادھوں پر عورتوں کو سامان کے ساتھ چڑھا دیا گیا۔ کتنا دیس کے پھڑکتے دھوئے بیلوں پر میرا چھوٹا سا ادھا خالی اڑ رہا تھا اور میں پھوپھی جان کے

ادھے کے پہلو میں چھل بل دکھاتے ہوئے گھوڑے پر بھاگ رہا تھا۔ میں جو کبھی ہوائی بندوق ہاتھ میں لے کر نہ چلا تھا آج بارہ بور کی ہنجھضیری اس امید پر لادے ہوئے تھا کہ اگر اڑتا ہوا طاؤس گرالیا تو رضو باجی ضرور متاثر ہوجائیں گی۔ کچی سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے دھندھاری کے جنگل پر میری نگاہیں منڈلا رہی تھیں اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ دور دور کسی جھاڑی سے طاؤس اٹھے اور اتنے قریب سے گذرے کہ میں شکار کرلوں کہ پھوپھی جان کا ادھا رک گیا۔ میں گھوڑا چمکا کر قریب پہنچا۔ آج سے زیادہ کسی جانور کے نخرے بھلے نہ لگے تھے۔

"میرا تو اس تابوت میں دم گھٹا جارہا ہے"

رضو باجی کی آواز تھی، جاڑوں کی صبح کیطرح صاف اور چمکدار۔

"تو آپ میرے ادھے پر آجائیے۔"

"مگر اس پر پردہ کہاں ہے؟"۔

"میں ابھی بند ہواتا ہوں"

پردہ بندھ رہا تھا کہ پھوپھی جان نے حکم دیا۔

"کسی بوڑھے آدمی سے کہوان کا ادھا ہانکے اور کسی عورت کو سنبھال دو۔"

"ادھا تو میں خود ہانکوں گا"

"ارے تو ——— ادھا ہانکے گا؟"

انھوں نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا اور میں گھوڑے پر سے پھاند پڑا۔ ساتھ ہی کسی سپاہی نے میری تائید کی"۔

"ایسا ویسا ہانکت ہے۔ بھیا ——— بیلن کی جان نکال لیت ہیں"۔

چادروں اور صافوں کا پردہ باندھ دیا گیا۔ رضو باجی سوار ہوئیں اور بولیں۔

"اس پر اتنی جگہ کہاں ہے کہ بوا بھی دھانس لی جائیں۔"

قبل اس کے کہ بوا اپنے ادھے سے اتریں میں نے بیل جڑوا دیے اور پینٹھ لے کر جوڑ پر بیٹھ گیا اور بڑھنے کا اشارہ کردیا۔ پھوپھی جان نے کچھ کہا لیکن پانچ جوڑ بیلوں کے گلے گھنگھروؤں کی تند جھنکار میں ان کی بات ڈوب گئی۔ جب حواس کچھ درست ہوئے اور دماغ کچھ سوچنے پر رضامند ہوا تو جیسے رضو باجی نے اپنے آپ سے کہا۔

"امی کے ادھے کی ساری دھول ہمیں کو پھانکنا ہے"

میں نے فوراً لیکھ بدلی - آدمی نے راسیں کھینچ کر مجھے نکل جانے دیا - ظالم بیلوں کو دوبارہ لیکھ پر لانے کے لیے میں نے ایک کے پینٹھ اور دوسرے کے ٹھو کر ماردی اور میری مہمیز اس کی ران میں چبھ گئی - وہ تڑپا اور قابو سے نکل گیا اور اچانک رضو باجی کے ہاتھ میری کمر کے گرد آگئے اور میرا بایاں شانہ ان کے چہرے کے لمس سے سلگ رہا تھا اور اعصاب میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں -

"روکو"

انھوں نے پہلی بار مجھے حکم دیا ـــــ میں نے سینے تک راسیں کھینچ لیں - بیل دلکی چلنے لگے، میں نے جھانک کر دیکھا - سانپ کیطرح رینگتی ہوئی سڑک پر دور تک درختوں کے سنتری کھڑے تھے اور ایک سپاہی میرے گھوڑے پر سوار سائے کے مانند میرے پیچھے لگا تھا - رضو باجی نے برقعہ کا اوپری حصہ اتار دیا تھا، اور وہ سرخ بال جن پر ان کے حسن کی شہرت کا دارومدار تھا، چہرے کے گرد پڑے دہک رہے تھے اور وہ ایک طرف کا پردہ جھکا کر جنگل کی بہار دیکھ رہی تھیں - ان کے ہاتھوں کی قاتل گرفت نے ایک بار پھر میرے چٹکی لی اور میں نے بیلوں کو چھیڑ دیا - اور ایک بار پھر ان کے سفید ریشمی ہاتھ میری کمر کو نصیب ہو گئے لیکن اب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں اور میں بیلوں کو پھنکار رہا تھا - اور ان کا سر میری پشت پر رکھا تھا اور میں اڑتی ہوئی ریشمی لپٹوں کو دیکھ سکتا تھا پھر وہ باغ نظر آنے لگا جن کے سائے سے آبادی شروع ہو جاتی ہے - مسرکھ سے میرے گھر کا راستہ کبھی اتنی جلدی نہیں ختم ہوا - اتنا دلکش نہیں معلوم ہوا - میں نے ادھار وکا، پردہ برابر کیا - سپاہی کو جوتر پر بیٹھا کر خود گھوڑے پر سوار ہوا - بستی میں بیل ہانکتے ہوئے داخل ہونا شایان شان نہ تھا - رضو باجی مجھے دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں - جب وہ اتر کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں تو میں نے پہلی بار ان کا سراپا دیکھا اور ان کے حسن کے سامنے میراثنوں کی تمام کہانیاں ہیچ معلوم ہوئیں - وہ مجھ سے تھوڑے دنوں بڑی تھیں، لیکن جب انھوں نے میری پیٹھ پر سر رکھا اور ٹھنک کر کہا کہ وہ اپنی بھابی جان اور میری اماں سے مرمت کرائیں گی تو وہ مجھے بہت چھوٹی معلوم ہوئیں جیسے میں نے ان کی گڑیا نوچ کر پھینک دی ہو اور وہ مجھے دھمکیاں دے رہی ہوں -

میں جو محرم میں سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات باہر گذارا کرتا تھا اس سال باہر جانے کا نام نہ لیتا تھا اور بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اندر منڈلایا کرتا تھا - نویں کی رات سال

بھر میں واحد رات ہوتی تھی، جب ہمارے گھر کی بیبیاں بستی میں زیارت کو نکلتی تھیں۔ پورا اہتمام کیا جاتا تھا کہ وہ پہچانی نہ جائیں۔ برقعوں کے بجائے وہ موٹی موٹی چادر اوڑھ کر نکلتی تھیں لیکن دور چلتے سپاہیوں کو دیکھ کر لوگ جان جاتے تھے اور عورتیں تک راستہ چھوڑ دیتی تھیں۔ جب رات ڈھلنے لگی اور سب لوگ سوتی چادریں اوڑھ کر یعنی بھیس بدل کر جانے کو تیار ہونے تو پتہ چلا کہ رضو باجی سوگئیں ہیں کسی نے جگایا تو پتہ چلا کہ سر میں درد ہے اور میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔ جب بیبیوں کے پیچھے چلتے ہونے سپاہیوں کی لاٹھیاں اور لالٹینیں پھاٹک سے نکلنے والی سڑک پہ کھو گئیں تب میں اندر آیا۔ وہ دالان میں سیاہ کامدانی کے دوپٹے کا پلو سر پہ ڈالے سو رہی تھیں۔ ایک عورت پنکھا جھل رہی تھی دوسری ان کی پائنتی پڑے کھٹولے پہ اونگھ رہی تھی۔ میں نے ان کی سفید گداز کلائی پہ میٹھی سے چٹکی لی۔ انھوں نے منہ کھول دیا۔

"چلئے آپ کو تعزیے دکھلاائیں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا جسے انھوں نے عورتوں کو دیکھ کر جلدی سے چھڑالیا اور کھڑی ہو گئیں

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے"

"زیارت کی برکت سے دور ہو جانے گا"

میں نے بڑے جذبے سے کہا انھوں نے کپڑوں پہ نگاہ ڈالی۔

"اگر ان سے خراب کپڑے آپ کے پاس ہوں تو پہن لیجئے۔"

اور میں نے ان کے پلنگ سے چکن کی چادر اٹھا کر ان کے شانوں پہ ڈالدی۔

اپنے تعزیے کے پاس بیٹھی ہوئی بھیڑ سے چند پاسی منتخب کیے۔ ان کو بندوق اور نارچ لینے کی ہدایت کی اور رضو باجی کو لئے ہونے سڑک پہ آگیا۔ مجھے بیبیوں کے راستے معلوم تھے جو محرم کے جلوس کیطرح مقرر تھے اور میں مخالف سمت میں چل رہا تھا۔ کٹا ہوا چاند تہائی آسمان پہ روشن تھا اور ہم بستی کے باہر نکل آنے تھے اور میں خود اپنے منصوبے سے لرز رہا تھا۔ پھر وہ تالاب آگیا جس کے پاس ٹیلے پہ مندر کھڑا تھا اور سامنے املیوں کے دائرے میں لکھوری اینٹوں کا کنواں تھا۔ میں نے اپنے رومال سے پختہ جگت صاف کی۔ نوخیز پاسیوں کو حکم دیا کہ وہ مندر کے اندر جا کر بیٹھ جائیں۔ اب حد نگاہ تک دمکتے پانی اور آبادی کے دھندلے خطوط کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف املی کے گھنے درختوں کا گھنا سایہ

پہرہ دے رہا تھا۔میں نے اپنا گلا صاف کیا۔ان کے پاس بیٹھ کر پہلی بار ان کو مخاطب کیا۔
"یہ کنواں دیکھ رہی ہیں آپ؟"
مجھے خود اپنی آواز بھیانک معلوم ہوئی۔
"یہ جناتوں کا کنواں ہے۔"
انھوں نے پوری شربتی آنکھوں کو کانوں تک کھول دیا اور میری طرف ذرا سا سرک آئیں۔
"اس میں جنات رہتے ہیں۔"
وہ میرے اور قریب آگئیں۔ان کا زانو میرے جسم میں مس کرنے لگا۔میں بھانوں کیطرح بےتعلق لہجے میں بولا"یہ جنات میرے ایک دادا کے شاگرد تھے۔جب دادا میاں اس کنویں میں ڈوب کر مر گئے تو جناتوں نے یہاں بسیرا لے لیا۔"
انھوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔چادر ان کے شانوں سے ڈھلک گئی۔گھٹی گھٹی آواز میں بڑے کرب سے بولیں۔
"چلو یہاں سے بھاگ چلو۔"
ان کا سر میرے شانے پر ڈھلک آیا اور میں نے سرخ بالوں کی ریشمی لپٹوں میں اپنے ہاتھ جلا لیے جن کے داغ آج بھی جلد کے نیچے محفوظ ہیں۔
"محرم کی اس رات کے حصے آخری میں جو شخص اس کنویں سے اپنے دل کی ایک مراد مانگتا ہے وہ پوری ہوتی ہے۔"
وہ مجھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں اور میں اس دنیا میں تھا جو پہلی بار میرے حواس نے دریافت کی تھی۔
آپ ذرا دیر کے لیے مجھے چھوڑ دیجئے میں ایک دعا مانگ لوں۔۔۔۔۔ آج کے بعد پھر کبھی اس کنویں سے کوئی دعا نہ مانگونگا۔
وہ تڑپ کر اٹھیں اور مجھ کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی چلیں۔جب پاس کھڑے ہو گئے تب وہ مجھ سے الگ ہوئیں۔سڑک پر آ کر مچل گئیں کہ گھر جاؤنگی مگر میں ان کو بہلاتا ہوا امام باڑے کیطرف چلا۔یہ امام باڑہ نواب نقی علی کی اس بہن نے بنوایا تھا جو واجد علی شاہ کی محل تھی۔آج بھی اس کی اولاد موجود ہے جو امام باڑے والیوں کے نام سے مشہور ہے اور یہ عمارت انھیں کے عمل میں ہے۔یہاں کر بلائے معلی سے لائی ہوئی ضریح

رکھی ہے ۔ عورتیں اپنے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر مراد مانگتی ہیں، جب پوری ہو جاتی ہے تو اپنی لٹ کھول کر رہے جاتی ہیں ۔ایک پاسی نے دوڑ کر امام باڑہ مردوں سے خالی کرادیا۔ پھاٹک میں عورتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔بستی کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے گھر کا کوئی فرد کسی عورت کے ساتھ محرم دیکھنے نکلا ہو ۔ زیارت کرنے نکلا ہو ۔ دالان کے پاس ایک گدبدی سی لڑکی میرے جوتے کھولنے آئی ۔میں نے رضوباجی کیطرف اشارہ کر دیا ۔ وہ ان کے سینڈل کھولنے لگی ۔جب میں اس ہال میں داخل ہونے لگا جس میں سونے کے پانی کی ضریح رکھی ہے تو وہی لڑکی بھاگی ہوئی آئی اور بولی ۔"بٹیا صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ باہر ہی رہیں ۔" اور میں باہر ہی کھڑا رہا۔جب میں ان کے ساتھ امام باڑے سے باہر نکل رہا تھا تو ان گنت مرد مجھے کنکھیوں سے گھور رہے تھے ۔ عورتیں گھونگھٹ سے جھانک رہی تھیں اور میرے اعصاب کی کمان کھنچی ہوئی تھی کہ ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا۔

"کون ہیں؟"

"بڑے بھیا کی دلہن ہیں ۔"

اور میں لڑکھڑا گیا۔ رضوباجی کے سر سے چادر کا جھونپا ڈھلک گیا۔

جب سڑک ویران ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ رضوباجی کا چہرہ لمبی چوڑی مسکراہٹ سے روشن ہے میں ان کے بالکل قریب ہو گیا۔

آپ بہت خوش ہیں ۔"

"اوں ــــــ ہاں ــــــ نہ مانگتے دیر نہ ملتے دیر ۔"

اور میں اس جملے کے معنی سوچتا رہا۔

پھر ہمارے مقدر میں کوئی ایسی رات نہ لکھی گئی جوان کے قریب سے مہک سکتی ۔ایک آدھ بار ان کی صورت دیکھنے کو ملی بھی اسطرح جیسے کوئی چاند دیکھ لے اور جب میں سارنگ پور کی ڈیوڑھی پر یکے سے اترا تو دیر تک کسی آدمی کی تلاش میں کھڑا رہا۔دن دہاڑے وہاں ایسا سناٹا تھا جیسے اس شاندار بوسیدہ عمارت میں آدمیوں کے بجائے روحیں آباد ہوں ۔میں دوسری ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور آواز دی ۔

"میں اندر آجاؤں"

ایک بوڑھی پھٹی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں چتر ہنٹ کا اجن ہوں۔"

ارے ـــــ آئیے ـــــ بھیا آجائیے۔

بھاری پختہ صحن پر میرے جوتے گونج رہے تھے۔ بارہ دری کے دوہرے دالان کی اسپینی محرابوں کے پیچھے لابنے لابنے کمرے کے اونچے اونچے دروازے کھلے تھے اور دوسری طرف کی عمارت نظر آرہی تھی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میں چونک پڑا یا ڈر گیا۔ دور تک پھیلے ہوئے سفید چوکے پر سفید کپڑے پہنے ہوئے بھاری بھرکم رضو باجی کھڑی تھیں چنا ہوا سفید دوپٹہ ان کے شانوں پر پڑا تھا اور سرخ و سفید بال ان کی پیٹھ پر ڈھیر تھے۔ وہ گردن گھمائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اترتی ہوئی شام کی مدھم روشنی میں ان کے زرد چہرے کی سیاہ شکنیں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ کانوں میں بیلے کے پھول اور ہاتھوں میں صرف گجرے پہنے تھیں۔ میں ان کی نگاہ کی ویرانی سے کانپ اٹھا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے دیکھتے رہے۔ صدیاں گذر گئیں۔ کسی میں نہ پلک جھپکنے کی طاقت تھی، نہ زبان کھولنے کا حوصلہ پھر جیسے وہ اپنی آواز کا سہارا لے کر تخت پر ڈھے گئیں۔

تم ایسے ہو گئے ـــــ اجن؟۔"

"بیٹھ جاؤ"

میں چوکے کے کونے پر ٹک گیا۔

"مجھے اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔ مجھ پر جو گذری وہ اگر پتھروں پر گذرتی تو چور چور ہو جاتے۔ لیکن تم کو کیا ہو گیا؟ کیسے کالے دبلے کھپٹا سے ہو گئے ہو، نوکر ہو نا اچھی بھلی تنخواہ پاتے ہو۔ زاہدہ جیسی بیوی ہے، پھول ایسے بچے ہیں، نہ قرض ہے نہ مقدمے بازی، تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا چپ کا روزہ رکھ لیا"۔

میں نے دل میں سوچا جناتوں کا سایہ ہے نا ان پر

"آپ نے پندرہ برس بعد روزہ توڑنے کو کہا بھی تو اس وقت کہ زبان ذائقہ بھول چکی اور معدہ قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکا۔"

انھوں نے اس طرح دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ وہ بوڑھی عورت میرے سوٹ کیس کو نیچے سے لئے ہوئے چلی آرہی تھی، پھر پاچو چچا آگئے۔ دبلے پتلے سے پاچو چچا جن کے شکار کی ایک زمانے میں دھوم تھی۔

رات کا کھانا کھا کر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب رضو باجی اٹھ گئیں تو چچی جان

نے سرگوشی میں کہا۔

"آج نوچندی جمعرات ہے۔ بٹیا پر جن کا سایہ ہے وہ آنے والے ہیں۔ تمہارا بستر اپنی طرف لگوایا تھا، لیکن بٹیا نے اٹھوالیا، اگر ڈرنا تو آواز دے لینا یا چلے آنا۔ بیچ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔"

جمعرات کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر خاموش رہا۔ ان کے ہاتھ سے گلوریاں لے کر منہ میں دبائیں اور کھڑا ہو گیا وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو تھپکتی رہیں۔ پانچو چچا مجھے بھیجنے آئے۔ دالان میں دو بستر لگے تھے۔ ان کے درمیان ایک کھٹولہ پڑا تھا جس پر رضو باجی کی بواڈھیر تھیں۔ پانچو چچا مجھے صحن میں چھوڑ کر لالٹین لیے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ایک کالا جھبرا جھبرا کتا ایک طرف سے نکلا اور مجھے سونگھتے ہوئے چلا گیا پھر ایک دروازے سے رضو باجی نکلیں اور سارے میں مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ ان کے کپڑے نئے اور پھول تازے تھے۔ صحن میں اکتوبر کی چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ برساتی میں کرسیوں پر ہم بیٹھے ٹھنڈی سفید گاڑی کافی پی رہے تھے اور گفتگو کے لئے الفاظ پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"یہ جناتوں کا کیا قصہ ہے رضو باجی؟"۔

مجھے اپنی آواز پر حیرت ہوئی۔ میں نے یہ گولی کسطرح داغ دی تھی۔ انھوں نے پیالی رکھدی۔ مسکرائیں۔ وہ پہلی مسکراہٹ عمر بھر کے غموں سے زیادہ غمگین تھی۔

"میں نے تم کو اسی لیے بلایا ہے"

"کاش آپ نے پہلے بلایا ہوتا"

"بیاہ کیطرح بے حیائی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اجن -------- دس برس پہلے کیا یہ ممکن تھا کہ تم اسطرح کھلے خزانے آدھی رات کو مجھ سے باتیں کر رہے ہوتے؟ آج تم گھر بار والے ہو۔ میں کھوسٹ ہو گئی ہوں اور چچی جان کا باورچی خانہ میری جائداد سے روشن ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو میں حج کرنے جا رہی ہوں اور حج کرنے والے ہر اس شخص سے معافی مانگتے ہیں جس کے ساتھ انھوں نے کچھ زیادتی کی ہو۔ تم کو معلوم ہے مجھ پر جنات کب آئے؟ آج سے دس سال پہلے، اور تم کو معلوم ہے تمہاری شادی کو کتنے برس ہوئے؟ دس سال! تم کو ان دونوں باتوں میں کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ تم نے چتربنہ کے سفر میں کیا کیا؟ تم محرم کی نویں تاریخ مجھے کہاں کہاں گھسیٹتے پھرے؟ تم اس بھیانک کنویں سے

میرے سامنے کیا مانگنا چاہتے تھے ۔ تم نے عباسی علم کو بوسہ دے کر مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کسے پانے کی آرزو کی تھی؟ جاؤ اپنے امام باڑے کی ضریح کو غور سے دیکھو۔ میرے بالوں کی سرخ لٹ آج بھی بندھی نظر آئے گی اگر کھچڑی نہ ہوگئی ہو تو ۔ کیا میں نے امام حسین سے صرف ایک عدد شوہر مانگنے کے لیے یہ جتن کئے تھے؟ سارنگ پور کی ناونوں اور میراثنوں سے پوچھو کہ وہ رشتے لا تے لاتے تھک گئیں لیکن میں انکار کرتے نہ تھکی ۔ کیا مجھ سے تم یہ چاہتے تھے کہ میں سارنگ پور سے ستو باندھ کر چلوں اور چتر ہٹہ کی ڈیوڑھی پر دھونی رما کر بیٹھ جاؤں اور جب تم برآمد ہو تو اپنا آنچل پھیلا کر کہوں کہ حضور مجھ کو اپنے نکاح میں قبول کرلیں کہ زندگی سوارت ہو جائے ۔ تم نے رکھو میاں کی بیٹی سے وہ بات چاہی جو رکھو میاں کی طوائفوں سے بھی ممکن نہ تھی ۔"

"لیکن رضو باجی"

مجھ پر جنات نہیں آتے ہیں اجن میاں ! میں جناتوں کو خود بلالاتی ہوں ۔ اگر جنات نہ آتے تو کوئی دولہا آچکا ہوتا اور تب اگر جناتوں کا کنواں ،عباسی علم اور ضریح مبارک تینوں میرے دامن کو ایک مراد سے بھر دینے کی خواہش کرتے تو میں کیا کرتی ؟ کس منہ سے کیا کہتی ۔اس لیے میں نے یہ کھیل کھیلا تھا ۔اسی طرح جسطرح چتر ہٹہ میں تم مجھ سے کھیل رہے تھے ۔ نہ اس میں تمہارے لیے کوئی حقیقت تھی اور نہ اس میں رضو کے لیے کوئی سچائی ہے ۔ یہ حج میں اپنے باپ کے لئے کرنے جارہی ہوں ۔ جو میرے بوجھ سے کچل کر مر گئے ۔ جنھوں نے مرتے وقت بھی اپنی عقبیٰ کے لیے نہیں ،میری دنیا کے لیے دعا کی ۔اس لیے میں نے تم کو معاف کیا ۔اگر تم زاہدہ کو مجھ پر سوت بنا کر لے آتے تو بھی معاف کر دیتی ۔"

وہ نرکل کے درخت کیطرح لرز رہی تھیں ۔ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا ۔ دورنگی شال شانوں سے ڈھلک گئی تھی ۔ سرخ بالوں میں برابر سے پڑے ہوئے چاندی کے تار جگمگا رہے تھے ۔اور مجھے محسوس ہو رہا تھا ،جیسے زندگی رائیگاں چلی گئی جیسے میری بیوی نے مجھے اطلاع دی ہو کہ میرے بچے میرے بچے نہیں ہیں ۔

———— * ————

نومی

وہ عجیب تھی جسم دیکھئے تو ایک لڑکی سی معلوم ہوتی ۔ چہرے پہ نظر ڈالیے تو بالکل بچی سی دکھائی دیتی اور اگر آنکھوں میں اتر جانیے تو ساری سموچی عورت انگڑائیاں لیتی ملتی ۔ وہ سرخ اونچا سا فراک اور سیاہ سلیکس پہنے جگمگا رہی تھی اور سیاہ گھنگھرالے بالوں کو جھٹک جھٹک کر "جیپ" میں اپنے سامان کا شمار کر رہی تھی اور میرے سامنے ایک دوپہر کھلی پڑی تھی ۔

اس نے آنگن میں قدم رکھتے ہی اپنی ممی سے بھیا کے لیے پوچھا تھا ۔ اونچے بغیر آستین کے بلاؤز اور نیچی چھپی ہوئی ساڑی میں کسی بندھی آنٹی نے جنھیں ابھی اپنے بدن پہ ناز تھا چمک کر بھیا کو مخاطب کیا ۔

"نومی پوچھ رہی ہے کہ تم کون ہو؟ ۔"

بھیا نے اداس چہرے پہ سلیقے سے رکھی ہوئی رنجور آنکھیں چشمے کے اندر گھمائیں ۔ روکھے سوکھے بالوں پہ دبلا پتلا گندمی سا ہاتھ پھیرا ۔ انکل نے بڑے سے بیگ کو تخت پہ پٹکا ۔ پیک تھوکنے کیلئے اگالدان پہ جھکے اور بھیا بھاری آواز میں بولے ۔ بھیا کی آواز ان کی شخصیت کو اور منفرد بنا دیتی ہے ۔ غم میں بسی ہوئی کھوجدار آواز سے ہلکا ہلکا دھواں سا انھتا رہتا ہے اور جسے سن کر اجنبیت احساس کمتری بن جاتی ہے اور خواہ مخواہ متعارف ہونے کو جی چاہتا ہے ۔

"بہت چھوٹی سی تھی جب دیکھا تھا اس نے"

اور نومی کو اسطرح دیکھا جیسے کیلنڈر کو دیکھ رہے ہوں ۔ جواب اسطرح دیا جیسے آنٹی سے کہہ رہے ہوں اسے بکس میں رکھ لیجئے ورنہ خراب ہو جانے گا دیہات میں اور نومی بے چاری بھیا کی آواز میں شرابور کھڑی تھی ۔ اس کی نظریں بھیا کے چہرے میں پیوست ہو چکی تھیں ۔ انکل پکا گانا گانے والوں کیطرح کھنکار کر بولے ۔

"بیٹی ------ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہاں گاؤں میں جہاں تم شادی میں جا رہی

ھو تمہارے ایک کزن ہیں جو بہت سی کتابوں کے "آتھر" ہیں ----- وہی تو ہیں یہ"۔

بھابی جو نند کی شادی میں بھیا سے زیادہ اپنا آپا کھونے بیٹھی تھیں ایک طرف سے ہڑ بڑاتی نکلیں اور بھیا کو لیے دوسری طرف چلی گئیں اور بھیا نے بے خیالی میں بھی نومی کی نگاہیں بھی اپنے ساتھ ہی لیے چلے گئے ۔ اور وہ بے چاری خالی خالی آنکھیں لیے گم سم کھڑی رہی ۔

"جلدی کیجئے ----- پانی لدا کھڑا ہے"۔

پھاٹک سے کسی نے ہانک لگائی ۔ میں نے آسمان کیطرف دیکھا ۔ سارے میں سیاہ جامنی بادل چھانے ہونے تھے اور اندھیرا پھیلا ہوا تھا جیسے سورج کی بجلی فیل ہو گئی ہو ۔ اس دن بھی ایسا ہی دل مسوس ڈالنے والا موسم تھا ۔

ابھی بارات میں آنے کئی دن باقی تھے لیکن مکان کا کونا کونا مہمانوں سے چھلک پڑا تھا ۔ نہ کہیں تل رکھنے کی جگہ تھی اور نہ کسی کو دم مارنے کی مہلت ۔ ایک تو برسات کی شادی وہ بھی دیہات میں اور دیہات بھی ایسا کہ سڑک پر "جیپ" دھنسی کھڑی ہے اور نکالنے کیلئے بیلوں کی جوڑیاں بھیجی جارہی ہیں ۔ کام تو جیسے آسمان سے پانی کیطرح برس رہا تھا اور بھیا کا یہ حال تھا کہ پاویں تو اپنی کھال تک اتار کر بہن کی جہیز میں دے ڈالیں ۔ ابھی جوڑے نہار ہے ہیں ۔ ابھی "تخت دار" دیکھ رہے ہیں ۔ ابھی شامیانے کے قناتوں کے انجام پر سوچ رہے ہیں ۔ میں پیڈ اور قلم لیے موجود رہتی ۔ خطوط، پرچے اور یادداشتیں لکھنے کو حاضر رہتی ۔ دالان میں یہاں سے وہاں تک چوکا لگا تھا ۔ ٹوٹی پھوٹی بیبیاں سالخوردہ کپڑوں کے بجھے رنگوں میں اپنا بھرم بنانے خاموشی سے کھانا کھارہی تھیں ۔ چمچے پلیٹوں سے ٹکراتے، خاموشی کھنک اٹھتی تو عجیب سا لگتا ۔ کہ بھیا باہر سے آگئے ۔

"ارے یہ ہماری نومی جی جی کھڑی کیوں ہے"

نومی ایک ایک ستون کے پہلو میں کھڑی پلیٹ میں چمچا گھما رہی تھی ۔ اس نے مڑ کر بھیا کو دیکھا ۔ بھیا اس کے بالکل پیچھے آکر اس کی پلیٹ میں جھانکنے لگے اور نومی جاگ اٹھی ۔ کھل گئی ۔ لو دینے لگی ۔ گردن پیچھے جھکا کر اپنے ڈھیروں بال بھیا کے سینے پر انڈیل دیے اور آنکھوں میں آنکھیں رکھ دیں ۔ بھیا بچوں کیطرح پلکیں جھپکانے لگے ۔ اور نومی کی آنکھوں کو اپنی کھوئی ہوئی نظریں مل گئیں ۔ کسی نے بھیا سے کھانے کو پوچھا تو کہیں دور سے آواز آئی ۔

"نہیں بابر تو نہیں کھایا میں نے"

اور نومی بیسیوں کی صف چیر کر ایک پلیٹ میں الم غلم بھر لائی اور ایک چمچہ ان کے منہ کیطرف بڑھایا ۔ بیسیوں کے وجود پر منڈھی ہوئی نیستی کی چادریں مسک گئیں ۔ ہونٹوں کی بھولی بسری مسکراہٹیں یاد آنے لگیں ۔۔ بھابی نے یہ تماشا دیکھا تو ایک کرسی لا کر رکھ دی ۔ نومی نے ٹھنک کر کہا ۔

"نئیں نئیں ------ میں اپنے بھیا کو بوفے کھلاؤنگی ۔"

اور بھیا سچ مچ سعید بچوں کیطرح کھاتے رہے ۔ دکھوں کے دلدل میں گردن گردن تک دھنسی ہوئی زندگیاں جو خوشی کے بہانوں کے انتظار میں بوڑھی ہو گئی تھیں اس معمولی سے مذاق پر خوب ہنسیں ۔ آنٹی کے تو اچھو لگ گیا ۔ بھیا قہقہوں میں بھیگ گئے ۔

اب رخصت ہونے والوں اور رخصت کرنے والوں کی بھیڑ چھوٹے سے جلوس کے مانند ڈیوڑھی سے نکل رہی تھی ۔ گوری چٹی ، گول مٹول آنٹی جیسے پھوٹی پڑ رہی ہوں بھیا ان کو پہلو میں لیے آ رہے تھے جیسے پگھلے جا رہے تھے اور نومی بغیر کسی مصروفیت کے مصروف لگ رہی تھی ۔ دور سے آتی ہوئی باتوں کی پھوار سے اپنا آپ بچانے پھر رہی تھی اور اُس کی آنکھیں جن میں بڑے بڑے ہاتھی ڈوب جاتے اور گہری ہو گئی تھیں اور میری یادوں کی فلم میں نئی ریل لگ گئی تھی ۔

رات چڑھ چکی تھی ۔ باہر سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ لڑکوں کے قہقہے سارے میں پھیلے ہوئے تھے ۔ گاؤں کی عورتیں شوخ رنگ کے کڑھے ہوئے پینٹی کوٹ اور سستھنک ساڑیاں پہنے گہرا اور بھدا میک اپ کیے اپنے بدنما زیوروں اور خوشنما جسموں کی پریڈ کر رہی تھیں ۔ ان کی آوازیں "سیلزمین" کی مصنوعی مسکراہٹ کیطرح شوخیوں سے سجی ہوئی تھیں ۔ "مایوں" بیٹھی ہوئی آپا کی صحنچی کے سامنے ان کا ایک گروہ بےپھسل آواز میں گیت گا رہا تھا اور میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ صحن میں پلنگوں کی قطاریں بچھی تھیں ۔ کونے کے تخت پر پچیسی ہو رہی تھی اور اودھم مچا ہوا تھا ۔ نومی کے قہقہے دھنک میں سرخی کیطرح نمایاں تھے ۔۔ بھابی اپنے بچوں کو سلانے کیلئے لانگی چارج کر رہی تھیں کہ بھیا آنے اور سر جھکائے ہوئے زینے کیطرف جانے لگے کہ آنٹی نے آواز دی ۔

"رشن !------ شطرنج کھیلو گے ۔"

بھیا جہاں تھے وہیں جم گئے ۔ آنٹی کے اٹھتے ہی شور ہوا ۔ لڑکیاں بھر امار کر زینے

کیطرف دوڑیں جیسے شطرنج نہیں مجرا ہونے جا رہا ہے ۔ ۔بھیا کے کمرے میں جہاں ۔بھابی تک بغیر اجازت اور ضرورت کے داخل نہ ہوتی تھیں طوفان مچ گیا ۔تخت پر ۔بھیا اور آنٹی شطرنج لے کر بیٹھ گئے اور لڑکیاں جہاں تہاں سماں گئیں ۔ ۔بھیا کی پشت پر دیوار تھی ۔ داہنی طرف گاؤ ۔ بائیں طرف نومی ۔ دیوار میں لگے لیمپ کی گلابی روشنی میں سب کچھ پر اسرار سا معلوم ہو رہا تھا ہر مہرے کے پٹنے پر مات کیطرح شور مچتا ۔نومی ۔چونچال نومی آہستہ ہستہ جگہ بنا رہی تھی اور پاؤں پھیلا رہی تھی ۔ ۔بھیا نے چونک کر دیکھا ان کے زانو پر نومی کے بال ڈھیر تھے ۔ پھر ۔بھیا کا ہاتھ بالوں پر لرزنے لگا جیسے وہ نومی کے نہیں خود انھیں کے بال ہوں ۔ پھر اچانک ۔بھیا نے ہاتھ کھینچ لیا اور جگہ ڈھونڈ کر تخت پر رکھ دیا ۔ نومی نے پھر کروٹ لی اور نوکیلے سرخ ناخنوں سے سجی ہوئی انگلیاں ۔بھیا کے ہاتھ کی ابھری رگوں پر لرزنے لگیں جیسے تھکے ہوئے سرخاب جھیل میں تیر رہے ہوں ۔ پھر لیمپ ۔بھبک کر گل ہو گیا ۔سب ہڑبڑا گئے ۔جب روشنی ہوئی تو وہ گھٹنوں پر کھڑی ۔بھیا کے بائیں شانے سے لگی ہوئی تھی اور ۔بھیا کا چہرہ تمتما رہا تھا ۔ آنکھیں بساط پر لیکن نگاہیں کہیں اور تھیں ۔ آنٹی نے تالی ۔بجا کر شور مچایا ۔ ۔بھیا وہ بازی ۔بھی ہار گئے تھے ۔

"تم آج ۔بھی میری ہار پر اس طرح خوش ہو سکتی ہو یہ معلوم نہ تھا ورنہ ۔بہت پہلے ہار چکا ہوتا ۔"

۔بھیا نے پہلی بار آنٹی کو تم کہا تھا ۔ آنٹی ۔بجھ گئی تھیں اور ان کی نظریں معافی مانگ رہی تھیں اور ۔بھیا کے ہونٹوں نے جلدی سے اپنی پرانی مصنوعی مسکراہٹ پہن لی تھی ۔

جلوس جیپ کے گرد آ کر منتشر ہو گیا تھا ۔میں سب سے الگ کھڑی سب کے چہروں سے دلوں کے مضمون پڑھ رہی تھی انکل نے اسٹیرنگ سنبھال لیا ۔ انجن غرانے لگا ۔ آنٹی ۔بھیا کے پہلو سے پھسل کر انکل کے پاس بیٹھ گئیں ۔ ۔بھیا نے جھک کر ان کی ساڑی کا فال ہک سے چھڑا دیا ۔ آنٹی اور گلابی ہو گئیں اور پرس سے گاگلز نکال کر جلدی سے آنکھیں جھکالیں ۔ نومی بیتی رات کے باسی آنسوؤں سے چمچماتی آنکھیں سب کے چہروں میں چھپاتی گھوم رہی تھی لیکن ۔بھیا کے پاس اسطرح گذر جاتی جیسے وہ ۔بھیا نہیں کوئی اجنبی ہوں اور ۔بھیا تو اس کے لیے اجنبیوں سے ۔بھی بدتر ہو گئے تھے ۔

اس رات پانی آفت مچائے تھا اور میراثنیں قیامت ڈھائے تھیں ۔ پرنالوں اور گیتوں کے شور میں نہ کچھ سنتے بنتا تھا اور نہ سوچتے ۔میری نگاہ اوپر اٹھ گئی ۔ ۔بھیا کے کمرے

میں تیز روشنی ہو رہی تھی ۔معلوم نہیں وہ کس وقت باہر سے آگئے تھے ۔میں بھیگتی .بھاگتی اوپر پہنچی تو دیکھا نومی .بھیا کی مسہری پر دونوں تکیے پشت سے لگائے کتابیں اور رسالے پھیلائے .بھیا ہی کیطرح نیم دراز ہے ۔ مجھے دیکھتے ہی گھبرا گئی .جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو ۔.بھیا کاالبم پھینک کر کھڑی ہو گئی ۔

"آپا---- آئیے" ۔

میں نے اسے مسہری پر .بٹھا دیااور خود نیچی کرسی پر .بیٹھ گئی ۔اور اسے دیکھنے لگی جو شفق کیطرح شوخ اور شاداب تھی ۔سرمے کی لکیریں لپ سٹک کی تازگی ، روز کا غبار ، بغیر شمیز کے کلف لگے کرتے کی استری ، جلد بدن بنایا ہوا پانجامہ ، گلےمیں سرخ دوپٹے کا مفلر ، بالوں میں پھول کیطرح کھلی ہوئی سرخ ربن کی گرہ ۔وہ سر سے پاؤں تک بے پناہ تھی ۔

"آپا-----میں .بھیا کی کتابیں پڑھتی ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتیں ۔"

اتنے میں .بھیگے ہوئے .بھیا آگئے ۔

"ارے تم لوگ ابھی تک جاگ رہی ہو .بھائی ؟ ۔"

انھوں نے کھونٹی سے سلیپنگ سوٹ اتار لیا ۔

"آپ کو نیند آرہی ہے ؟"

.بھیا نے جواب میں مڑ کرنومی کو دیکھا اور میں نے انھیں ، آنکھیں اسی طرح رنجور اور معصوم اور نگاہ اسی طرح بے نیاز ۔

"نہیں تو-----لیکن کیوں"

اور وہ پردے کے پیچھے کپڑے بدلنے چلے گئے ۔

"میں آپ سے پڑھونگی"

"کیا پڑھوگی .بھائی ؟ ۔"

"آپ ہی کو پڑھونگی ۔"

وہ اسطرح جواب دے رہی تھی .جیسے وہ .بھیا سے نہیں اپنی ہمجولی سے مخاطب ہو ۔

"اور جو نیند آئی تو-----؟"

"تو-----یہیں سو جاؤنگی ،اسی تخت پر"

.بھیا پردے سے باہر نکل آئے تھے ۔ ہونٹوں پر اسی غمناک مسکراہٹ کی مہر لگی تھی ۔

"اور آنٹی کہیں گی میری بیٹی کو تخت پہ لٹا کرا کڑا دیا"۔
میں صرف آپ کی آنٹی کی بیٹی نہیں ہوں ------ نومی بھی ہوں۔
میں سن ہو کر رہ گئی ۔ پھر میں نے سنا۔ نیچے سے کوئی مجھے چیخ چیخ کر پکار رہا تھا
میں اٹھی تو بھیا نے حکم دیا۔
"جی جی ! تم بھی یہیں لیٹنا آ کر"۔
جب میں واپس آئی تو دیکھا لیمپ جل رہا ہے ۔شیڈ بھیا کیطرف ہے ۔تخت پہ نومی سو رہی ہے اور اس کے بدن کی قیامت جاگ رہی ہے ۔میں نے اس کا کرتا نیچے کھینچ دیا اور کرسی کا گدا سرہانے رکھ کر اسی کے پاس لیٹ رہی ۔ آنکھیں بند کیے مردوں کیطرح پڑی رہی ۔ پھر نہ جانے کیوں خراٹے لینے لگی جن کی شکایت آج بھی نومی نے کی تھی ۔میں آپ ہی آپ مسکرا دی پھر چہرے پہ بازو موڑلیا۔ایک آنکھ کھول کر دیکھا ۔۔بھیا اسی طرح دیوار کیطرف منہ کیے چپ چاپ پڑے تھے ۔ پھر اچانک نومی نے مجھے جھنجھوڑا۔
"آپا------اے آپا"
میں اسی طرح خراٹے لیتی رہی ۔ وہ چھلاوے کیطرح اٹھی اور اور بھیا کی مسہری پہ ۔۔بھیا نے چشمہ لگایا اور اب نومی ان کے گلے میں بانہیں ڈال چکی تھی ۔
"مجھے ڈر لگ رہا ہے"۔
وہ بھیا کے گریباں سے بولی ۔اس کے گھونگھرالے بالوں پہ بھیا کا ہاتھ آہستہ سے لرزا۔ میں اتنی دور سے بھی ان کے ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کر رہی تھی ۔ پھر بھیا نے مجھے پکارا۔ میں سوتی بنی رہی ۔
نومی جی جی ! ------اٹھ کر بیٹھو------ مجھ سے باتیں کرو۔
وہ تھوڑی دیر مچلتی رہی ۔ پھر ان کی گود میں پھیل گئی ۔
بھیا نے اسے بستر پہ رکھ دیا۔لیمپ کا شیڈ گھمایا۔
"نومی جی جی !"
اس نے آنکھیں کھول دیں ------جیسے کہہ رہی ہو جی !
اور میں حیرتوں میں ڈوب گئی ۔ وہ آنسوؤں سے تر بتر تھیں ۔
"تمہارے ڈیڈی مجھ سے چند سال بڑے ہیں لیکن تمہاری ممی مجھ سے کئی سال چھوٹی ہیں ۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے کہہ رہے ہوں شٹ اپ !

"تم نومی ہو جس نے کلکتہ کے ایک مشہور کانونٹ سے کیمبرج پاس کیا ۔ جو اپنے میگزین میں کہانیاں لکھتی ہے ۔ جوراک اینڈرول جانتی ہے ۔ لیکن میں اس نومی کو نہیں جانتا ۔ میں تو ایک ہی نومی کو جانتا ہوں ، جو میری بہت پیاری بہت ہی پیاری آنٹی کی سب سے بڑی اور سب سے دلاری بیٹی ہے ۔ یہ جو جی جی لیٹی ہے یہ بھی مجھے تمہاری طرح عزیز ہے اور یہ بالکل سو رہی ہے ۔ تم باتیں کرو ۔"

"کچھ بولو ------ نومی بیٹی"

وہ آندھی کیطرح اٹھی اور دھم سے تخت پر گر پڑی ۔

"نومی تم بھیا سے رخصت نہیں ہوئیں"

آنٹی کی دور سے چل کر آتی ہوئی آواز کوند گئی ۔ وہ ایک طرف سے شعلے کیطرح لپکتی آئی ۔

"آپ کو آپ کی بہت پیاری ، بہت ہی پیاری آنٹی نے تو رخصت کر دیا"

وہ اس ایک جملے کی گولی داغ کر مڑ گئی کہ اگر کھڑی رہتی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور پھر جیپ پر اسطرح سوار ہوئی جیسے جیکی گھوڑے چڑھتے ہیں ۔ گرد کا ایک بادل اڑا کر جیپ چلی گئی ۔ بھیا اسی طرح کھڑے رہے رنجور خاموش اور کھوئے ہوئے ۔ میں اس بادل کے متعلق سوچتی رہی جو بھابی کی بھری پری زندگی پر منڈلا گیا تھا اور جسے بھیا نے سگریٹ کے دھوئیں کیطرح اڑادیا تھا اور جس کا علم تک بھابی کو نہ تھا ۔ میں راز کے اس بوجھ کے نیچے کانپ سی گئی اور پھر میں بھیا کے متعلق سوچنے لگی کہ وہ کس کیلئے کیا سوچ رہے ہونگے

ایک دن

الارم بجتے ہی سلمیٰ کے خیالوں کا میلہ اجڑ گیا جیسے فائر بریگیڈ کے گھنٹوں کی آواز زندگی سے چھلکتے ہوئے بازاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور رواں دواں مصروفیتوں میں بریک سالگ جاتا ہے۔اس نے ناگواری سے آنکھیں کھول دیں۔ نیلام میں خریدی ہوئی کاہی رنگ کی مچھر دانی کی گھنی جالی سے گہرا نیلا آسمان سرمئی معلوم ہو رہا تھا۔اس نے تکیے پر اذیت سے سر رگڑتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ اپنے پلنگ سے اٹھ رہا تھا جیسے فوجی بگل کی آواز چھاونی سے نکلتی ہے۔ سلمیٰ نے کروٹ بدل کر چہرے کو ننگے بازو کے خم میں چھپالیا لیکن اس کی بند آنکھیں بھی شوہر کو اسی طرح دیکھ رہی تھیں جسطرح ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی کی سوئی دیکھی جاسکتی ہے۔اب وہ کچن کا دروازہ کھول رہا تھا رہا تھااور اسٹو جلا رہا تھا۔اتنی احتیاط کے ساتھ گویا لیباریٹری میں جونیر طالب علم تیزابی محلول پر تجربہ کر رہا ہو تین پیالی دودھ کی طرح ناپ کر کیتلی اسٹو پر رکھ دی اور پمپ کرنے لگا۔جیسے پھر تیلے دوکاندار سائیکل میں ہوا بھرتے ہیں۔پھر جلدی جلدی برش کیااور جھپٹ کر ایک پیالی پانی میں ایک چمچہ نمک ڈال کر غرارہ کرنے لگا۔جیسے بقر عید کے دن بکرا ذبح کیا جا رہا ہے۔ ننگے بازووں سے کان کو بند کر دیا۔ پھر اس نے جلد باز بیروں کیطرح دوپیالی چائے بنائی۔ گول کشتی تپائی پر رکھ کر اس کی مچھر دانی کے پردے الٹ دیے۔ بوڑھے نامحرموں کیطرح پینی کوٹ سے جھانکتے ہوئے عریاں گھٹنے چھپا دیے اور بازو سے اٹھا کر چائے کی پیالی پکڑا دی اور وہ اپنی ایک بیوہ پھوپھی کو یاد کر کے مسکرا دی جو دس دس برس کی لڑکیوں سے ڈھلکتے آنچلوں کا بہانہ ڈھونڈ کر چار چوٹ کی لڑائی کرتی تھیں۔ سلمیٰ کی کلی کے پان کو اگالدان کے باہر گرتا دیکھ کر اس کا چہرہ اور سخت ہو گیا۔ وہ اچانک چائے کی پیالی ہاتھ سے رکھ کر اس کے بلاؤز کے اوپری بٹن کو بند کرنے لگا۔وہ دونوں ہاتھوں میں پیالی تھامے بیٹھی رہی۔ وہ باتھ روم جاتے جاتے رک گیا۔چہرے کا تاثر پھر کڑوا ہو گیا۔لپک کر اٹھتی ہوئی سلمیٰ کو شانہ دبا کر بٹھا دیا۔ بیڈ روم سے سلیپر لا کر اس کے سامنے رکھے اور پالش

کرنے والے لڑکوں کیطرح سینڈل اٹھا لیے ۔ جب کھانا پکانے والی بوا نے بھٹی سلگا کر جھاڑو اٹھائی تو اس نے مچھر دانی اتار لی ۔ بستر لپیٹنے جھکا تو جھکا ہی رہ گیا۔ سلمیٰ بُرش کرتے کرتے رک گئی ۔ پیسٹ تھوک کر انتظار کرنے لگی ۔ اس جملے کا جو ہونے والا تھا ۔

"تم نے رات میں یہ بندے یہیں ڈال دیے ؟" ۔

"ڈالے نہیں رکھ دیے تھے سرہانے !"

"اور اگر یہ گر پڑتے میرا یا تمہارا پاؤں پڑ جاتا تو؟" ۔

سلمیٰ خاموش رہی لیکن دیکھا اس طرح گویا کہہ رہی ہو ۔

"اگر رات میں بجلی گر پڑتی اور میں مر جاتی تو کاش؟"

بوا کے نکلتے ہی وہ ڈرائنگ روم میں گھس گیا ۔ ایک ایک چیز کو جھاڑن سے رگڑنے لگا جیسے دکانوں کے ملازم "شوکیس" کو چمکاتے ہیں ۔ بنیان سے نکلے ہوئے پتلے پتلے بازوؤں کے نیچے بغلوں کے گڑھے دیکھ کر سلمیٰ نے بیڈ روم کا پردہ ڈال دیا اور اس کی آنکھوں میں قلعی کرنے والے بوڑھے مزدور کام کرنے لگے ۔ اب وہ شیشے کے شاربہ بدرنگ بلیڈ اس طرح تیز کر رہا تھا جیسے سڑک کے کنارے نائی چمڑے پہ استرا چمکاتے ہیں ۔ جب باتھ روم سے نکلا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں ہینگر تھے جن پہ دھلے ہوئے کپڑے جھول رہے تھے ۔ ایک ایک ہینگر کو ورانڈے کے تار میں اتنی احتیاط سے لٹکایا کہ سلمیٰ کو اپنے آپ پہ ایسی نکمی دھوبن کا گمان ہونے لگا جو کپڑے کھینچنا تک نہ جانتی ہو ۔ وہ ناشتے کی کشتی دیکھ کر چونکا ۔ پلیٹوں اور طشتریوں کے لیے میز پہ ربر کے کیپر رکھے تھے ۔ چائے دان کا ایک کنارہ پلاسٹک کے میز پوش سے سرگوشی کرنے کو جھکا ہی تھا کہ اس نے اٹھ کر دور ہٹا دیا ۔ شکر اپنے ہاتھ سے ڈالی اور سارے وقت اس طرح مصروف رہا جیسے وہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ ناشتہ نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنی کانی کھتری لڑکی کی بارات کو کھانا کھلا رہا ہے ۔

اس نے ڈبے سے گن کر پانچ سگریٹ نکالے ۔ چار سگریٹ کیس میں بند کئے ۔ ایک منہ میں لگایا ۔ آرام کرسی کو ایک بار اور جھاڑ کر اخبار دیکھنے لگا ۔ ٹھیک سوا نو بجے اخبار موڑ کر اسٹور میں رکھا اور کپڑوں کی الماری کھول کر کھڑا ہو گیا ۔ ورانڈے میں رکھی ہوئی بید کی گول کرسی میں سلمیٰ اسی طرح اداس پڑی رہی ۔ وہ ٹیریلین کے اشتہار کی طرح سجا بنا نکلا ۔ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا غیر ذاتی بے جان لمس جیسے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر

رہنمائی کر رہا ہو۔ پھر کچن کیطرف دیکھا اور مطمئن ہو کر اسے پیار کر لیا۔سرد، باسی اور مشینی پیار۔جیسے وہ پیار نہ کر رہا ہو شیو کے بعد لوشن لگا رہا ہو۔ آفس کے لیے باہر نکلتے ہوئے اس نے داہنا ہاتھ سائیکل کے ہینڈل پر رکھا اور بائیں ہاتھ کی دوانگلیاں چمکا کر اسے ٹاٹا کہا جیسے فوٹو گرافر فوٹو کھینچنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہیں۔بے روح،خود کار۔ وہ السائی ہوئی اٹھی اور اس طرح دروازے تک آئی جیسے مہذب،اور میزبان عورتیں مہمان مردوں کو رخصت کرتی ہیں۔

اب سارا دن پڑا تھا۔دن تو اب شروع ہوا تھا اور کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔وہ جس کام کے متعلق سوچتی اسے مکمل پاتی۔ وہ اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی کہ ایک ہی کرسی پر روز روز بیٹھنے سے سیٹ خراب ہو جاتا ہے۔وہ حقارت سے مسکرادی۔ایک خاموش گالی اس کے ہونٹوں پر دیر تک لرزتی رہی۔وہ بیٹھی سوچتی رہی۔اپنے آپ سے اپنے وجود کے معنی پوچھتی رہی۔کیا اس کی جاگتی آنکھوں نے اسی زندگی کے خواب دیکھے تھے خواب جن کی گرمی سے کانپتی راتیں دہک اٹھتی ہیں اور جن کی نرم نرم خنکی سے دہکتی دوپہریں کانپنے لگتی ہیں۔کیا یہی وہ پاک صاف زندگی ہے جس کی چاہت میں اس نے کسی پرشوق نگاہ کی رنگین گستاخیوں کو نظر کے قریب نہ آنے دیا۔ کسی بے قرار ہاتھ کے لمس کی خوشبودار گرد اپنے دامن پر نہ پڑنے دی۔وہ چپلوں میں پیر گھسیٹتی اٹھی اور "فریج" کھول دیا تین دن کے گنے ہوئے پھل رکھے تھے۔پانی کی بوتلیں حساب سے جمی ہوئی تھیں۔مکھن اور پنیر کے ڈبے کھلے ہونے کے باوجود بند تھے۔جام اور جیلی کی خوش رنگیوں نے یاد دلایا کہ پانچ بجنے میں ابھی کئی گھنٹے باقی ہیں،کئی سال باقی ہیں،کئی صدیاں باقی ہیں۔وہ انھیں چھو نہیں سکتی،چکھ نہیں سکتی۔جس طرح وہ اپنے بچے کو پیدا کر کے اپنی گود میں اٹھا کر چوم نہیں سکتی کہ ابھی شادی کو پانچ سال نہیں ہوئے۔پانچ سال سے پہلے پہلا بچہ پیدا نہیں ہونا چاہئے۔پانچ سال میں کتنے دن باقی ہیں۔تین سال-----تین سو سال-----تین ہزار سال -----اس نے "فریج" بند کر دیا۔وہ خود بھی اسی فریج کیطرح ہے جو اس بظاہر خوبصورت اور آرام دہ مکان میں،ہوٹل میں-----قید خانے میں رکھ دی گئی ہے۔خرید کر ڈال دی گئی ہے۔اس کے پھل اس کی شیرینیاں اس کی نمکینیاں اس کا ذائقہ اور اس کی افادیت اس کے مصارف سے زیادہ ہیں۔وہ بھی "فریج" کی طرح وقت سے کھلتی ہے اور وقت سے بند کر دی جاتی ہے۔وقت-----------وقت------------یہ کون سی رٹ ہے جیسے ایک

اور نامعلوم طوطا رٹے جارہا ہے ۔وہ اپنے احساس کی اذیت سے چور اپنے بے داغ بے شکن بستر پر گر پڑی ۔سامنے وہ قد آدم آئینہ رکھا تھا جس میں اس کے بستر کی ہر کروٹ دیکھی جا سکتی ہے ۔اس اسے نے آپ کو دیکھا جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رہی ہو پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے عکس پہچاننے کی کوشش کرتی رہی یاد کرتی رہی لیکن حافظے پر یہاں سے وہاں تک سیاہی بکھری ہوئی تھی ۔وقت اور بخت کی سیاہی ۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے تین بار گھنٹی بجی ۔ جب تین بار گھنٹی بجائی جائے تو اس کا امکان ہے کہ اس کا شوہر آ گیا ----ہونہہ ----شوہر ----وہ شخص آ گیا جو اس کو اپنے گھر سے، نیلام گھر سے نکاح نامے کے چیک پر دستخط بنا کر خرید لایا ہے ---- دروازہ کھلا اور حسب معمول اسے اپنی کمر پر ایک تھپکی ملی ۔ پلاسٹک کے دستانے کی سی تھپکی ۔اس نے پنکھا تیز کیا ۔پردے کے پیچھے کپڑے تبدیل کئے ۔خالی ہینگروں کو آراستہ کیا ۔ جوتے صاف کر کے اسٹینڈ پر رکھے ۔"فریج" کھول کر ایک گلاس پانی پیا ۔ نگاہیں گلاس کے اوپر سے "فریج" کا جائزہ لیتی رہیں ۔جیسے کسٹم آفیسر سامان دیکھتا ہے ۔پھر آٹھ سو روپے نکال کر میز پر رکھے ۔ آج پہلی تاریخ تھی ۔ وہ ڈرائننگ ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی ۔اس نے اپنے قلم سے بنائی ہوئی فہرست نکالی اور ماہرا کاونٹنٹ کیطرح بجٹ بنا دیا ۔ دو سو روپے موٹر خریدنے کے لئے الگ کئے ۔سو روپے پیدا ہونے والے بچے کے نام سے سرخ لفافے میں بند کیے ۔اور پچیس روپے سلمیٰ کے سامنے بڑھا دیے ۔ اور اسے اپنے مرحوم باپ یاد آ گئے جو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اسی طرح جیب خرچ دیا کرتے تھے ۔ وہ چونک پڑی ۔ بوا چائے کی کشتی لیے کھڑی تھیں اور وہ مختلف رنگ کے لفافوں میں روپے گن گن کر رکھ رہا تھا ۔چائے کا پر شور گھونٹ لے کر اس نے اعلان کیا ۔

"آج فلم دکھلا رہا ہوں تم کو ۔"

" مگر ایک گھنٹہ پہلے جانا پڑے گا ----ورنہ ٹکٹ نہیں ملے گا ۔"

وہ پھر بھی خاموش رہی ۔

اب ناشتے کی پلیٹوں پر جھک پڑا تھا جیسے ردی خریدنے والے چھوٹی ردی بورے میں بھرتے ہیں ۔

جب وہ لانڈری سے آئے کلف استری کیے سوٹ کیطرح باہر نکلا تو سلمیٰ صحن میں کھڑی کنگھا کر رہی تھی ۔ پھر بازوؤں سے پکڑ کر وارڈ روب کے سامنے کھڑی کر دی گئی ساری انتخاب کی، بلاؤز نکال دیا ۔ بالوں کا ڈیزائن لپ اسٹک کا شیڈ بتلا دیا اور اپنے پتلون کی

کریز دیکھتا ھوا باہر چلا گیا۔

ٹکٹ مل گئے ڈکومینٹری شروع ہوگئی ۔ پھر فلم بھی شروع ہوگئی لیکن سلمیٰ نہ آئی ۔ وہ بے قراری سے ٹہلتا رہا۔ ٹکٹ ضایع ھونے کے اندیشے سے کھولتا رہا۔ سوچتا رہا۔ ایک ساتھ دو ٹکٹ خراب کرنے کی ہمت نہ پڑی ۔ اس نے گیٹ کیپر کو ہدایات دیں جو بے تعلق سے کھڑا سنتا رہا۔ وہ لوگوں سے ٹکراتا ھوا اپنے نمبر کی سیٹ تک پہنچ گیا۔ دروازے اور پردے کو باری باری دیکھتا رہا۔ انٹرول میں سب سے پہلے نکلنے کی کوشش کی۔ مایوس ھو کر پھر فلم دیکھنے لگا۔ غصے میں جلتا بھنتا گھر پہنچا۔ بوا نے دروازہ کھولا۔ گونجتی آواز اور تند الفاظ کے جواب میں اطلاع ملی۔

"بیگم صاحب ٹھیک چھ بجے رکشے پر بیٹھ کر گئی تھیں۔"

اب اس نے خفیہ پولس کے انسپکٹر کیطرح اپنے گھر کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ وارڈروب میں سلمیٰ کے کپڑے اسی طرح لگے تھے۔ چور خانے میں دو ایک معمولی زیور اور تھوڑے سے روپے اسی طرح رکھے تھے ۔ وہ بیڈ روم کیطرف جھپٹا کہ شاید فلموں کیطرح اسے بھی تکیوں پر کوئی خط مل جائے ۔ لیکن بستر خالی پڑا تھا۔ وہ سیدھے نپے تلے قدموں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ میز پر پلیٹیں لگی تھیں۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوا نے کھانا چن دیا۔ اس نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ جو باقی بچا اسے "فریج" میں رکھنے کی ہدایت کی۔ اس کا ذہن اسکوٹر کیطرح اڑ رہا تھا ۔ لیکن سلمیٰ کسی بھی اندیشے کے فریم میں فٹ نہ ھو پائی۔ اب وہ "فریج" کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ ہمیشہ کیطرح اس نے آئس کریم کے ڈبے کیطرف ہاتھ بڑھایا تو چونک پڑا۔ اس کے سہارے ایک نیلا لفافہ کھڑا تھا جلی حروف اس کا نام پکار رہے تھے ۔ اس نے دونوں چیزیں ایک ساتھ اٹھالیں اور چمچہ لیتا ھوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پہلے لفافہ کھولا۔ پھر ڈبہ ! چمچہ ڈبہ پر چلنے لگا اور نگاہ خط پر دوڑنے لگی ۔ ڈبہ پہلے ختم ھوا۔ خط اس کے بعد ۔ وارنش کی ہوئی تپائی سے سگریٹ کیس اٹھایا۔ دن کا آخری سگریٹ سلگا کر تکیہ پلٹ دیا کہ غلاف پر سر کا دھبہ نہ پڑے ۔ آرام سے لیٹ کر اس خط کو دوبارہ پڑھا۔

" مجھے یقین ہے آپ نے پوری فلم دیکھی ہو گی ــــــ پورا کھانا کھایا ہو گا۔ جو کچھ بچا ھو گا اسے "فریج" میں رکھ دیا ھو گا۔ اور اب آئس کریم کھانے کے بعد میرا خط پڑھ رہے ھونگے ۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے ۔ آپ نے شکایت کا موقع ہی کہاں دیا۔ کاش ۔ آپ ایک جدید ترین آٹومیٹک مشین ہیں ۔ اور میں ! ----- ہاں مجھ سے متعلق تمام

کاغذات آپ ہی کے سیاہ بکس میں محفوظ ہیں ۔ اور میں آپ سے کچھ طلب نہیں کرتی ۔ میں نے سب کچھ معاف کیا"۔

میرا اور آپ کا خدا حافظ

اس نے آخری جملے کو دوبارہ پڑھا ۔ سارے جسم میں تسکین کا میٹھا میٹھا درد سا محسوس کیا ۔ اعصاب کی کمان اتر گئی ۔ اور حواس چمک اٹھے ۔ وہ پوری تازگی کے ساتھ اٹھا ۔ سیاہ بکس کھول کر کاغذات دیکھ لیے ۔ کنجی سیف میں رکھ رہا تھا کہ جیسے سلمی' کا سایہ اس کی پشت سے گذر گیا ۔ بھرپور شاداب جوان سایہ ۔ اس نے دل کے قریب ایک چبھن سی محسوس کی ۔ جوان گنت بلبوں کیطرح مرنے ہی کے لیے پیدا ہوتی ہے ۔ اس نے آہستہ سے سیف بند کیا ۔ گرم زندہ خوشبودار جسم کی خواہش اس کے بدن کو جگانے لگی ۔ اس نے فوراً اسے اپنے آپ سے نوچ کر پھینک دیا جیسے چلا آیا ۔ پھر کچھ یاد آیا ۔ غسل خانے میں جا کر اس نے برش کیا باہر نکلا تو سارا گھر اسی طرح پڑا تھا ۔ سلیقے اور قرینے سے سجا ہوا ۔ ایک خالی پلنگ ورانڈے میں بچھا ہوا تھا ۔ اس نے اسے کھڑا کر دیا ۔ سگریٹ پینے کو جی چاہا لیکن اس نے ڈبے کیطرف دیکھا بھی نہیں ۔ اس نے آنی والی موٹر ----- نہیں آنے والی بیوی کے متعلق سوچا ۔ رنگ ماڈل، آرام، مصارف، معیار اور آنکھیں بند ہونے لگیں ۔ وہ بڑبڑا کر اٹھا ۔ دودھیا مرکری بلب بجھا کر نیلا زیرو بلب جلایا ۔ پھر اسے بھی بجھا دیا اور اپنے پلنگ پر لیٹ رہا ۔

*

پیتل کا گھنٹہ

آٹھویں مرتبہ ہم سب مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور ڈھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے لیکن انجن گنگنایا تک نہیں ۔ ڈرائیور گردن ہلاتا ہوا اتر پڑا۔ کنڈکٹر سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر بیٹھ کر بیڑی سلگانے لگا ۔ مسافروں کی نظریں گالیاں دینے لگیں اور ہونٹ بڑبڑانے لگے ۔ میں بھی سڑک کے کنارے سوچتے ہوئے دوسرے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا ۔ ایک بار نگاہ اٹھی تو سامنے دو درختوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے ۔ میں ابھی سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کھردرے دیہاتی ہاتھ نے میری چٹکیوں سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکال لی ۔ میں اس کی بے تکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک پڑا ۔ مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا ۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا یا بیڑی کھانے لگا ۔

"یہ کون گاؤں ہے ؟" میں نے میناروں کیطرف اشارہ کر کے پوچھا ۔

"یو ـــــــــ یو بھسول ہے ۔"

بھسول کا نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آ گئی ۔ میں اندر سلام کرنے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر روک دیا ۔ وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور پورے پائچے کا پاجامہ اور فر کی ٹوپی دیے میرے سامنے کھڑے تھے ۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں ۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمتگاروں کے ہاتھوں سے پھولوں کی بدھیا لے لیں اور مجھے پہنانے لگے ۔ میں نے بل کھا کر اپنی بنارسی کی پوت کی جھلملاتی ہوئی شیروانی کیطرف اشارہ کر کے تلخی سے کہا ۔ "کیا یہ کافی نہیں تھی ؟" ـــــ وہ میری بات پی گئے ۔ بدھیا برابر کیں ۔ پھر میرے ننگے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا ـــــ "اب تشریف لے جائیے ۔" میں نے ڈیوڑھی پر کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے ۔ بتایا گیا کہ یہ بھسول کے قاضی انعام حسین ہیں ۔

بھسول کے قاضی انعام حسین ، جن کی حکومت اور دولت کے افسانے میں اپنے گھر میں سن چکا تھا ۔ میرے بزرگوں سے ان کے جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے ۔ میں اپنی

گستاخ نگاہوں پہ شرمندہ تھا۔ میں نے اندر سے آ کر کئی بار موقع ڈھونڈ کر ان کی چھوٹی موٹی خدمتیں انجام دیں۔ جب میں چلنے لگا تو انھوں نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا، مجھے بھسول آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے لیکن اب تو داماد ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے سبھی کہتے ہیں لیکن اس وقت ان کے لہجے میں خلوص کی ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ جملے میرے دل پہ لکھ دیے۔

میں تھوڑی دیر کھڑا بگڑی "بس" کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنا بیگ جھلاتا ہوا چتے ہوئے کھیتوں میں اٹھلاتی ہوئی پگڈنڈی پہ چلنے لگا۔ سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی، جسے قاضی انعام حسین نے اپنی جوانی میں بنوایا تھا۔ مسجد کے سامنے میدان کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکان کا سلسلہ تھا، جن میں شاید کبھی بھسول کے جانور رہتے ہونگے، ڈیوڑھی کے بالکل سامنے دو اونچے آم کے درخت ٹرانک کے سپاہی کیطرح چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے۔ جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ پڑا تھا۔ دن کے تین بجے تھے۔ وہاں اس وقت نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد کہ ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔ لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈوریے کی قمیض، میلا پائجامہ اور موٹر ٹائر کے تلوؤں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے، ماتھے پہ ہتھیلی کا چھجہ بنائے مجھے گھور رہے تھے میں نے سلام کیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آئے اور جیسے یک دم کھل گئے۔ میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھین لیا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ڈیوڑھی میں گھس گئے۔

ہم اس چکر دار ڈیوڑھی سے گذر رہے تھے جس کی اندھیری چھت کمان کیطرح جھکی ہوئی تھی۔ دھنیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے۔

وہ ڈیوڑھی سے چلائے۔ "ارے سنتی ہو ______ "دیکھ تو کون آیا ہے۔ میں نے کہا گر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے۔" لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں، ڈھلے ہوئے گھڑوں گھڑونچی کے پاس دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ بھی شرمندہ کھڑی تھیں، پھر انھوں نے لپک کر الگنی پہ پڑی مارکین کی دھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹہ کیطرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھپ جائے۔

اس اہتمام کے بعد وہ میرے پاس آئیں۔ کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ سکھ اور

دکھ کی گنگا جمنی آواز میں دعائیں دیں ۔ دادی کانوں سے میری بات سن رہی تھیں لیکن ہاتھوں سے جن کی جھریاں بھری کھال جھول گئی تھی دالان کے اکلوتے ثابت پلنگ کو صاف کر رہی تھیں ، جس پر میلے کپڑے ، کتھے چونے کی کلیاں اور پان کی ڈلیاں ڈھیر تھیں اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں ۔ مجھے پلنگ پر بیٹھا کر دوسرے جھولا جیسی پلنگ کے نیچے سے وہ پنکھا اٹھالائیں جس کے چاروں طرف کالے کپڑوں کی گوٹ لگی تھی اور کھڑی ہوئی میرے اس وقت تک جھلتی رہیں جب تک میں نے چھین نہ لیا ۔ پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں ۔ وہ ایک تین دروں کا دالان تھا ۔ بیچ میں مٹی کا چولھا بنا تھا ۔ المونیم کی چند میلی پتیلیاں کچھ پیپے کچھ ڈبے کچھ شیشے بوتل اور دو چار اسی قسم کی چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔ وہ میری طرف پیٹھ کئے چولہے کے سامنے بیٹھی تھیں ۔ دادا نے کونے میں کھڑے ہوئے پرانے حقہ سے بے رنگ چلم اتاری اور باورچی خانہ میں گھس گئے ۔ میں ان دونوں کی گھس گھس کرتی سرگوشیاں سنتا رہا ۔ دادا کئی بار جلدی جلدی باہر گئے اور آئے ۔ میں نے اپنی شیروانی اتاری ۔ ادھر ادھر دیکھ کر چھ دروازوں والے کمرے کے کواڑ پر ٹانگ دی ۔ نقشیں کیواڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی ۔ ایک جگہ لوہے کی پتی لگی تھی لیکن بیچوں بیچ گول دائرے میں ہاتھی دانت کا کام ، کتھے اور تیل کے دھبوں میں جگمگا رہا تھا ۔ بیگ کھول کر میں نے چپل نکالے اور جب تک میں دوڑوں دادا گھرونچی سے گھڑا اٹھا کر اس لمبے چوڑے کمرے میں رکھ آئے جس میں ایک بھی کیواڑ نہ تھا ۔ صرف گھیرے لگے کھڑے تھے ۔ جب میں نہانے گیا تو دادا المونیم کا لوٹا میرے ہاتھ میں پکڑا کر مجرم کیطرح بولے ۔ " تم بیٹے اطمینان سے نہاؤ ۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا پردے تو میں ڈالدوں لیکن اندھیرا ہوتے ہی چمگادڑ گھس آئے گی اور تم کو دق کرے گی ۔

میں گھڑے کو ایک کونے میں اٹھالے گیا ۔ وہاں دیوار سے لگا ، اچھی خاصی سینی کے برابر پیتل کا گھنٹہ کھڑا تھا ۔ میں نے جھک دیکھا ۔ گھنٹے میں مونگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے ۔ دو انگل کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سوت کی کالی رسی بندھی تھی ۔ اس سوراخ کے برابر ایک بڑا سا چاند تھا اس کے اوپر سات پہل کا ستارہ تھا ۔ میں نے تولیہ کے کونے سے جھاڑ کر دیکھا تو وہ چاند تارا ، بھسول اسٹیٹ کا مونو گرام تھا ۔ عربی رسم الخط میں قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ " کھدا ہوا تھا ۔ یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھسول کی ڈیوڑھی پر اعلان ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی سے بجتا چلا آرہا تھا ۔ میں نے اسے روشنی

میں دیکھنے کے لیے اٹھانا چاہا لیکن ایک ہاتھ سے نہ اٹھا سکا۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دیکھتا رہا۔ میں دیر تک نہاتا رہا۔ جب باہر نکلا تو آنگن میں قاضی انعام حسین پلنگ بچھا رہے تھے۔ قاضی انعام حسین جن کی گدی نشینی ہوئی تھی۔ جن کے لیے بندوقوں کا لائسنس لینا ضروری نہیں تھا۔ جنھیں ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں پر خدمتگاروں کیطرح طباق اٹھائے ہوئے آئے۔ جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں "لب سوز" لب بند چائے سے لبریز رکھی تھیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں دو ابلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے گئے تھے۔ شروع اکتوبر کی خوشگوار ھوا کے ریشمی جھونکوں میں ہملوگ بیٹھے نمک پڑی ہوئی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ دروازے پر کسی بوڑھی نے ہانک لگائی۔

"مالک"

"کون"

"مہتر ہے آپ کا ــــــ صاحب جی کا بلاہے آئے ہے۔"

دادا نے گھبرا کر احتیاط سے اپنی پیالی طباق میں رکھی اور جوتے پہنتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اپنے بھلے دنوں میں تو اسطرح شاید وہ کمشنر کے آنے کی خبر سن کر بھی نہ نکلے ہونگے۔

میں ایک لمبی ٹہل لگا کر جب واپس آیا ڈیوڑھی میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی تھی۔ دادا باورچی خانے میں بیٹھے چولھے کی روشنی میں لالٹین کی چمنی جوڑ رہے تھے۔ میں ڈیوڑھی سے ڈبیا اٹھا لایا اور اصرار کر کے ان سے چمنی لے کر جوڑنے لگا۔

ہاتھ بھر لمبی لالٹین کی تیز گلابی روشنی میں ہملوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دادا میرے بزرگوں سے اپنے تعلقات بتاتے رہے۔ اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے۔ کوئی آدھی رات کے قریب دادی نے زمین پر چٹائی بچھائی اور دسترخوان لگایا۔ بہت سی ان میل بے جوڑ اصلی چینی کی پلیٹوں میں بہت سی قسموں کا کھانا چنا۔ شاید میں نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا۔

صبح میں دیر سے اٹھا ــــــ یہاں سے وہاں تک پلنگ پر ناشتہ چنا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ دادی نے رات بھر ناشتہ پکایا ہے ــــــ جب میں اپنا جوتا پہننے لگا تو رات کیطرح اس وقت بھی دادی نے مجھے آنسو بھری آواز سے روکا۔ میں معافی مانگتا رہا دادی خاموش کھڑی رہیں۔ جب میں شیروانی پہن چکا، دروازے پر یکہ آگیا، تب دادی نے کانپتے

ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھا۔ ان کے چہرے پر چونا پتا ہوا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں اور دس کرانے کے۔"

"ارے ۔۔۔۔ ارے دادی ۔۔۔۔ آپ کیا کر رہی ہیں!" اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیے۔

چپ رہو تم ۔۔۔۔ تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں جو جس کا حق ہوتا ہے وہ دے تو دیتے ہیں ___غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ بھیا ۔۔۔۔ تیری دادی تو فقیرن ہو گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھکارن ہو گئی۔

معلوم نہیں کہاں کہاں کا زخم کھل گیا تھا۔ وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں۔ دادا میری طرف پشت کیے کھڑے تھے اور جلدی جلدی حقہ پی رہے تھے۔ مجھے رخصت کرنے دادی ڈیوڑھی تک آئیں لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔ میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اور گردن ہلا کر رخصت کر دیا۔

دادا قاضی انعام حسین تعلقدار بھسول تھوڑی دیر تک یکہ کے ساتھ چلتے رہے لیکن نہ مجھ سے نگاہ ملائی نہ مجھ سے خدا حافظ کہا۔ ایک بار نگاہ اٹھا کر دیکھا اور میرے سلام کے جواب میں گردن ہلا دی۔

سدھولی جہاں سے سیتاپور کے لیے مجھے بس ملتی ابھی دور تھا۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکہ کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکہ والا ہاتھ جوڑے مجھ سے کہہ رہا تھا ۔۔۔۔ میاں ۔۔۔۔ ای شاہ جی بھسول کے ساہوکار ہیں ان کے یکہ کا بم ٹوٹ گیا ہے، آپ برا نہ مانو تو ای شاہ بیٹھ جائیں۔

میری اجازت پا کر اس نے شاہ جی کو آواز دی۔ شاہ جی ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے اور یکے والے نے میرے اور ان کے سامنے "پیتل کا گھنٹہ" دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے کے پیٹ میں مونگری کی چوٹ کا داغ بنا تھا۔ دو انگل کے حاشیے پر سوراخ میں سوت کی رسی پڑی تھی۔ اس کے سامنے قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ کا چاند اور ستارے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے اور یکے والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکے والے سے رہا نہ گیا

اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کا شاہ جی گھنٹہ بھی خرید لایو؟۔"

ہاں کل شام معلوم نائی، کا وقت پڑا ہے میاں پہ کہ گھنٹہ دے ذہین بلانے کے ایٔ-----"

ہاں وقت وقت کی بات ہے ___ شاہ جی ناہیں تو ای گھنٹہ -----

"اے گھوڑے کی دم راستا دیکھ کے چل"-----یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔

میں-----میاں کا برا وقت------چوروں کیطرح بیٹھا ہوا تھا-----مجھے معلوم ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پہ پڑا ہے۔

دھندلے آئینے

ابھی اس دن کے آنے میں کئی برس باقی تھے جب میں نے داڑھی بنانے کے شوق میں داڑھی بنائی تھی اور خون خرابہ کر لیا تھا اور ڈانٹا گیا تھا۔ ابھی وہ الکشن نہیں آیا تھا جس نے دلوں میں لہو کی دیواریں کھینچ دی تھیں۔ میں سیتاپور کے اس اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا جو اب کالج ہوگیا ہے۔ ایک عزیز کی موت کے سلسلے میں گاؤں گیا تھا۔ عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ آنگن میں بستر لگے تھے۔ میں بہت دکھی سا چپ چاپ پڑا تھا۔ اماں چوکی پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ پہریدار پاسی اپنی کھٹیا اور لاٹھی لے کر دوسری منزل پر جا چکا تھا کہ نقارہ بجنے لگا۔ نوٹنکی کا نقارہ بجنے لگا۔ میں نے چونک کر سنا۔ پھر ذرا سا اس کر دونوں تکیے پشت سے لگا لیے اور نقارہ سننے لگا جس کی گونجیلی آواز نے میرے دل پر چھائے ہوئے غبار کو جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

"تمہارا جی چاہے تو جا کر نوٹنکی دیکھ آؤ مگر اپنے چچا جان سے پوچھ لینا۔"

اماں پچھلے دو دنوں سے میری افسردہ صورت دیکھ رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ میں بوڑھوں کیطرح گم سم رہنے کے بجائے لڑکوں کیطرح چونچال ہو جاؤں۔ میں نے ایک ایک لفظ کو بجا بجا کر پرکھا کہ کہیں کھوٹے تو نہیں ہیں۔ مجھے کبھی نوٹنکی دیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ میں سیتا پور میں سینما دیکھتا رہا تھا لیکن نوٹنکی دیکھنے کی حسرت اس طرح دل سے بندھی ہوئی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے اور پیروں میں جوتے بدکاتا ہوا باہر نکل گیا جہاں چچا مرحوم دس بیس آدمیوں میں گھرے بیٹھے تھے اور زمینداری کی باتیں کر رہے تھے۔ میں تو خیر ان کا اکلوتا بھتیجا تھا۔ دور دور تک اچھا اچھا آدمی ان کے نام سے کانپتا تھا۔ پرانے جابر زمینداروں کیطرح بات بات پر بندوقیں نکالتے تھے اور قدم قدم پر فوجداری کراتے تھے۔ میں ان کی آرام کرسی کے پاس حقے کے برابر کھڑا ہوگیا۔ کپڑوں پر کھڑی ہوئی استری کی لکیریں دیکھ کر انھوں نے میری طرف منھ کر کے ابرو اچکا دیے۔ میں نے اپنی گذارش اور اماں کی سفارش پیش کر دی۔ تھوڑی دیر چپ چاپ حقہ پیتے رہے

پھر آدمیوں کو میرے ساتھ جانے کا حکم دیا اور پانچ روپے نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیے اور تاکید کی کہ میں نوٹکی کے "جوکر" کو دے دونگا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ ٹیڑی کیطرح بھاگا۔ تختوں کے چوکے کے نیچے دری کے فرش پر سازندے بیٹھے تھے۔ میری کرسی کے لئے مجمع کو پھاڑ کر انھیں کے پاس جگہ بنائی گئی۔ میں اس پر تک کر دیکھنے لگا گویا پوری نوٹکی اٹھا کر آنکھوں سے نگل جانے کی کوشش کرنے لگا۔ چوکے کے پیچھے ایک مکان کی دیوار تھی۔ دونوں بازوؤں پر آدمیوں کی قطاروں کے حاشیے تھے۔ سامنے بڑی دور تک آدمی ہی آدمی دھنسا ہوا تھا۔ سارا مجمع زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کناروں پر کہیں کہیں اکا دکا چار پائیاں اپنی ہڈیاں تڑوا رہی تھیں۔ چوکے (ڈانس) پر ایک آدمی بہت لمبے چمر ودھے جوتے پہنے الٹا سوٹ ہاگانے پیٹھ پر ٹاٹی باندھے چھوٹے موٹے چھپوے کے برابر ٹانٹ کیپ لادے، بغل میں بڑی بھاری لاٹھی مارے پاٹ دار آواز میں گا رہا تھا۔ جب ایک مصرعہ گا چکتا تو نقارہ ایک دھن بجاتا۔ اس وقفے میں وہ انگریزی بولتا اور لوگ ہنستے ہنستے دوہرے ہوجاتے۔ میرے تو آنسو نکل آنے تھے۔

پھر چوکے (ڈانس) پر سورج چڑھ آیا تھا۔ ایک بھاری بدن کی پوری پکی عورت شاید دنیا کی سب سے خوبصورت عورت آئی اور چھمچھمانے لگی۔ اس کے ایک ایک انگ سے روشنی پھوٹی پڑ رہی تھی جیسے آتش بازی کا درخت چھٹ رہا ہے۔ اس کی سرخ کامدار چولی کی چنبی ہوئی آستینوں پر بانکڑی ٹکی ہوئی تھی۔ سفید گول بازو میں جوشن اور کلائیوں میں زیور پھنسے تھے۔ سرخ جالدار لہنگے پر ایک زرکار کپڑا بندھا تھا، جس نے بدن کا کساؤ اور ابھار دیا تھا۔ اوڑھنی کا ایک سرا فرش پر لوٹ رہا تھا۔ گردن کا ستلڑا ہار گریبان میں بند چاندی کے کبوتروں کے جوڑے پر کانپ رہا تھا۔ ناک میں بڑی سی تھہ کی زنجیر کرن پھول کے پاس بندھی ہوئی تھی۔ ٹیڑھی مانگ کے دونوں طرف پھولے گپھے تھے جس میں ایک طرف چاند اور دوسری طرف جھپکا چمک رہا تھا۔ کاجل کے دنبالے کان تک چلے گئے تھے۔ موٹی چوٹی کمر کے نیچے جھوم رہی تھی۔ فاختہ جیسے پیروں میں گھنگھروؤں کے گچھے چھنک رہے تھے۔ کتھک ناچتے ناچتے اس نے ایک جھوک لیا تو اس کا لہنگا مور کے بازوؤں کیطرح پھیل گیا اور سرخ سائن کا چوڑی دار پانجامہ چمک اٹھا جس سے نکلی ہوئی پنڈلیوں کی مشعلوں نے آنکھیں چوندھیا دیں۔ سارا مجمع جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ مجھ پر اس کا نشہ چڑھ چکا تھا۔ گھنگھور نشہ چکا تھا۔ میں دھت بیٹھا ہوا تھا۔ میرا ایک ہاتھ تنزیب کے کرتے کی جیب میں

پانچ روپے دبائے سو رہا تھا۔ انتہائی آرزو کے باوجود یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ روپے اس کی خدمت میں پیش کردوں۔ وہ ناچتے ناچتے ڈائس کے پیچھے غروب ہو گئی۔ سارے میں اندھیارہ پھیل گیا۔ گپ اندھیارہ۔ میری تو جیسے آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر ایک عورت ساڑی باندھے ہوئے آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک صاحب بھی آدھمکے جو لانبا مخملیں کوٹ پہنے تھے جس کے کالر اور کفوں پر کلابتوں کے بیل بوٹے بنے تھے۔ بر جس پر کرمچ کے جوتے تھے۔ کمر میں تلوار اور سر کی اونچی ٹوپی پر کلغی لگی تھی۔ آتے ہی داہنا گھٹنا موڑ کر کھڑے ہو گئے یا بیٹھ گئے۔ دایاں ہاتھ دل پر اور بایاں تلوار کے قبضے پر رکھ کر گانے لگے۔ وہ جو محترمہ کھڑی ہوئی تھیں آپ ہی آپ ناچنے اور گانے بھی لگیں۔ وہ آپس میں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چونکہ دونوں مادرزاد شاعر تھے اس لیے باتیں کرنے کے بجائے باتیں گاتے رہے (ایسا مشاعرہ پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا)۔

انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ پھر اچانک روشنی ہوگئی۔ بھری دوپہر کوئی چار پانچ فٹ کے فاصلے پر تھر کنے لگی۔ وہ ناچ رہی تھی اور میں دم بخود بیٹھا تھا پھر کہاں سے مجھ میں یہ ہمت نصیب ہوگئی کہ میں نے جیب سے وہ ہاتھ نکال لیا جو روپے دبائے ہوئے تھا اور بیٹھے بیٹھے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ناچتے ناچتے تھم گئی مسکرا کر اس طرح دیکھا جیسے مائیں اپنے شریر بچوں کی شرارت سے خوش ہو کر دیکھتی ہیں۔ وہ چھم چھم کرتی میرے پاس آ گئی۔ تسلیم کر کے روپے لے لیے۔ آرسی انگشتانے اور انگوٹھیوں سے جڑا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ سے مس ہو گیا۔ وہ پہلا جان لیوا لمس آج تک اس ہاتھ کے کلیجے میں دھڑک رہا ہے۔ اس اچھوتی یاد کیطرح دفن ہے جس پر آج تک میری سماعت کا سایہ نہ پڑ سکا۔ انگلیوں میں جو آگ لگی تھی دھیرے دھیرے سارے بدن میں پھیل گئی اور میں بیٹھا ہوا پھنکتا رہا۔ سورج نکلتے نکلتے جب کھیل ختم ہوا اور مجھے اٹھایا گیا اس وقت میں اٹھا تو لیکن اسطرح کہ میرا سب کچھ وہیں چھوٹ گیا۔

میں اٹھ کر چلا تو آیا لیکن پیروں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے گیتوں کی نغمگی سے میرے کان لبے ہوئے تھے اور آنکھوں میں اس کے جسم کے ان گنت زاویوں کا ایک شہر آباد تھا۔ اس کی پختہ خوشبو سے میرے کچے حواس بدحواس تھے۔ میں زمین پر چل رہا تھا لیکن پاؤں آسمان پر پڑ رہے تھے۔ مجھ کو رات بھر کے جاگے ہوئے بستر پر لٹا دیا گیا لیکن میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ مجھ پر جو احساسات چھائے ہوئے تھے ان کی لطافت الفاظ کی متحمل

نہیں ہو سکتی ۔ گھنٹوں لیٹے رہنے کے بعد بھی میں تھکن سے چور تھا۔اس دن کی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے سوااس کے کہ میں رات کے انتظار میں جوان ہو گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ نوٹنکی ایک بکر قصاب کی بیٹی کی برات (بارات) کے ساتھ آئی ہے اور لڑکی دو دن کے بعد رخصت ہوگی ۔بابل کے آنسوؤں اور جہیز کے صندوقوں کے ساتھ نوٹنکی بھی اکھاڑ لے جائیگی ۔اس دوسرے اور آخری دن تماشا دیکھنے کی اجازت ملنا جان جوکھم کا معاملہ تھا۔ لیکن میں تلا بیٹھا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہی سے انتظار شروع کر دیا کسی نے پوچھ گچھ نہ کی ۔ آخر چلتے وقت میں اماں کی پٹی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ۔جب ان کی نگاہ اٹھی تو میں نے تیز سے کہہ دیا کہ چچا جان نے کہا تھا کہ جب نوٹنکی دیکھنے جانا تو بھابی سے دس روپے لے لینا ۔انھوں نے کچھ سوچ کر روپے میرے حوالے کر دیے ۔میں جیب جھنجھناتا باہر نکلا تو چچا جان مرحوم سے ٹکر ہو گئی ۔میں نے گھبرا کر خود ہی کہہ دیا۔

کہ اماں نے کہا ہے جب نوٹنکی دیکھنے جانا تو یہ روپے دے دینا ۔یہ کہہ کر میں نے روپے ان کے ہاتھ پر رکھ دیے ۔انھوں نے روپے میرے حوالے کیے ۔ایک لمحے کیلئے ٹھٹکے پھر کسی کو حکم دیا کہ میرے لئے کرسی بھجوادی جائے اور آدمی ساتھ کر دیے جائیں ۔

جب میں اپنی جیب میں قارون کا خزانہ بجاتا ہوا پہونچا تو سارا میدان آدمیوں سے بھرنے لگا تھا ۔ تختوں کا چوکا خالی پڑا تھا ۔جو ملازم میری سنگت میں آئے تھے انھوں نے مجھے کرسی پر گلدستے کیطرح رکھ دیا اور خود مختلف ضرورتوں کا بہانہ کر کے چلدیے ۔بڑے انتظار کے بعد میرے نصیب کھلے ۔ وہ سیاہ کامدار جوڑا کیا برسات کی تاروں بھری رات پہنے ہوئے تھی اور بجلی کیطرح چمک رہی تھی ۔"بھتیا نمت" کی طرح برس رہی تھی ۔ایک ایک آدمی کے دماغ سے ایک ایک خیال دھل گیا تھا ۔خوابوں کی بستیاں ،امیدوں کی فصلیں ،ماضی کے کھلیان ،مستقبل کے گھروندے سب بہہ گئے تھے ۔۔یہاں سے وہاں تک صرف اس کی ذات تھی جو موجود تھی ، ثابت تھی قائم تھی ۔میں آنکھیں کھولے خواب دیکھتا رہا ۔ ساری رات میری آنکھیں عبادت کرتی رہیں ۔

صبح میں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ کھیل ختم ہو گیا ۔ کھیل تو اب شروع ہونے والا تھا ۔میں اپنی کرسی پر اسی طرح بیٹھا رہا ۔سورج کی شریر کرنوں نے درختوں کی پھنگیوں پر کھیلنا شروع کر دیا ۔ آدمی اکتا کر میری شکایت پر آمادہ نظر آنے لگے ۔اس وقت میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کیلئے اٹھا ۔اپنے ان دوستوں کو طلب کیا جو پرائمری

اسکول میں میرے ساتھ پڑھتے تھے ۔ میری تختی دھوتے تھے اور پہاڑے لکھتے تھے ۔ باہر چرتے ہوئے گھوڑے پکڑ کر میری سواری کیلئے لاتے تھے باغوں کو اجاڑتے تھے اور کھیتوں کو نوچتے تھے اور ہر اس لڑکے کی مرمت کر دیا کرتے تھے جو مجھ سے گستاخی کی جسارت کرتا تھا ۔ جب سے میں سیتاپور انگریزی پڑھنے گیا تھا ان سے دور ہو گیا تھا لیکن یہ مجھ سے اور قریب ہو گئے تھے اور جب ملتے تھے تو پہلے سے زیادہ وفاداری کا اظہار کرتے تھے ۔ میں ان کو سمیٹ کر اس پھاٹک کے بغلی کمرے کے پر اسرار اندھیرے میں جا بیٹھا جس کا نشان اب باقی نہیں رہا ۔ میں اپنے یاروں کے سامنے کھل گیا جو شاید سب کے سب شادی شدہ تھے اور اپنی ننھی منی دلہنوں یا منگیتروں کے ہجر و وصال سے آسودہ تھے ۔ جھبر و جو قوم کے نائی تھے تڑ سے بولے ۔

"نام او کا جہرہ (زہرہ) ہے اور وار نڈی ہے نخلئو (لکھنو) کی ۔"

نجپھلی (ان کا نام نجف علی تھا جو بگڑ کر نجپھلی ہو گیا تھا) خاندانی گروہ بند گدیوں کے بیہڑ لہجے میں تسکین دی اور تعویذوں سے بھرے ہوئے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ۔

جب آپ حکم دے دو ..... تب ملانے دیں .....اور تین پانچ کرے تو مار لٹھن سسری کا گرانے دیں ۔"

جلیل فوراً گدی سے عقل نکال کر بولے ۔

"یو تو خیر سب ٹھیک ہے مل (مگر) بڑے بھیا (چچا مرحوم) کا ڈنڈا چلے گا تو؟ ۔"

تو کھن سیاہ ظالم پاسیوں کی مشہور آنکھیں چمکا کر چنوتی دینے والے لہجے میں گرجا "کون سالا بڑے بھیا سے کہے جا سکت ہے" ۔

میں یہ سب کچھ سن رہا تھا سوچ رہا تھا لیکن بدحواس تھا کیونکہ نوٹنکی والے اسی رات کے دو بجے بارات کے ساتھ جانے والے تھے ۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ اسی آدھے دن اور آدھی رات میں کر گذرنا تھا ۔ بڑی دیر کے بعد طے ہوا کہ نجپھلی (یہ سب میں بڑے اور نک سک سے درست تھے) چاندنی والی قمیض چاندی کے بٹن لگا کر پہنیں ۔ نیچی کنار دار دھوتی باندھیں ۔ پمپ جوتا ڈاٹ کر اور مہندی سے لال لاٹھی باندھ کر زہرہ سے ملنے جائیں اور میرا حال بتائیں ۔

"اگر جہرہ (زہرہ) بھڑک گئیں تو نجپھلی بنا لاٹھی چلائے مانے گا نہیں اور سب بگڑ جائے گا"۔

اس بات پر نجیھلی بگڑ گئے ۔ کعبے شریف کیطرف داہنا ہاتھ اٹھا کر قرآن مجید کی قسم کھائی کہ چاہے زہرہ ان کی ماں بہن کی گالی تک دے ڈالیں مگر وہ کان دبائے سنا کریں گے ۔ خفیہ مجلس اور چلتی مگر پہرے پر کھڑے ہوئے ریاضو نے خبر دی کہ رام دین مجھ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں ۔ رام دین تو تھے قوم کے پاسی اور میری آراضی کے نگراں لیکن ان کے اقبال کا یہ عالم تھا کہ اندر عورتیں ان کا لحاظ کرتی تھیں اور باہر چچاجان مرحوم تک ان کا کہا مانتے تھے ۔ ہم سب تتر بتر ہو گئے ۔

خیالوں کے منہ زور گھوڑوں پر اڑتا ہوا اندر آیا اور اپنے پلنگ پر گر پڑا ۔ اپنے یاروں کی یاری پر بھروسہ تھا ۔ اس اعتماد نے دل کی ڈھن پر مرہم رکھ دیا تھا ۔ لیکن ایک بات مجھے اندر ہی کھائے جا رہی تھی کہ زہرہ ایک رنڈی ہے ۔ طوائف ہے ۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ۔ وہ طوائف ہرگز نہیں تھی ۔ طوائفیں میں نے بھی دیکھی تھیں ۔ ہر عید بقرہ عید پر میرے گھر سلام کرنے آتی تھیں اور کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑتی تھیں ۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں اشارے کر کر کے روپے مانگتی تھیں ۔ برسات میں جب گھر گر جاتے تو پھوس اور جھانکر اور لکڑی کے لیے میرے سسیر بانوں کی خوشامدیں کرتی تھیں ۔ میں نے ان طوائفوں کو بھی دیکھا تھا جو میرے دادا کے پاس رہتی تھیں اور جن سے میرے گھر کی تمام عورتیں پردہ کرتی تھیں ۔ میں نے اس طوائف کو بھی دیکھا تھا جسے چچا مرحوم نے دالان کے ستون میں بندھوا کر مرمت کرائی تھی ۔ زہرہ طوائف نہیں تھی وہ کچھ اور تھی ۔ کوئی آسمانی مخلوق تھی جسے کہانیوں کی شہزادی کیطرح نوٹنکی کے دیو پکڑ لائے تھے اور ایک نیک بخت شہزادے کیطرح یہ میرا فرض تھا کہ میں اسے چھڑا لاؤں ۔ دوسری منزل کے سنسان ویران کمروں کو آراستہ کر کے اس سے آباد کروں ۔ اس سے باتیں کروں ۔ اس کے دکھ سنوں ۔ اس کے کام آؤں ۔ اور جو شخص یا دیو میرے اور اس کے راستے میں حائل ہو اس سے تلوار چلاؤں اور لڑتا ہوا مارا جاؤں ۔ لیکن اسطرح کہ جس جگہ میرا سر کٹ کر گرے وہاں سے بارہ کوس تک صرف میرا دھڑ گھوڑے پر سوار تلوار چلاتا دشمنوں کی صفیں الٹتا چلا جائے ۔ پہلی بار میرے وجود میں کوندتی ہوئی آرزو واضح ہو کر میرے سامنے آئی ۔ یعنی جسطرح بھی بن پڑے میں اپنا آپ اس پر وار دوں ۔ اپنی جان نچھاور کر دوں ۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب میں اس سے تنہائی میں مل سکوں ۔ اس کے دل میں اتر سکوں ۔ وہ نشہ اس پر قربان ہو جانے کا نشہ ۔۔۔۔ الفاظ کی گرفت میں

نہیں آسکتا ۔۔۔۔۔۔موت کہیں الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے ۔ حکم کی تعمیل میں دستر خوان پر بیٹھا تو کھانا کڑوااور پانی کھاری معلوم ھوا۔

بھری دوپہر میں گھر سے نکل بھاگنے کے سب جتن کر ڈالے ۔لیکن ممکن نہ ھوا۔ عمر قید کیطرح زخمی خوابوں کی زنجیر پہنے زندگی کا حکم پورا کرتا رہا ۔ شام ہوتے ہی باہر نکلا ۔ میرے یار منہ کی ہتھیلیوں میں خبریں بھرے ادھر ادھر دبکے ہوئے تھے لپک کر آگئے ۔ہم اسطرح تنہائی کیطرف بھاگے جیسے دن بھر کے بھوکے بچھڑے شام کو اپنی ماؤں کے تھنوں پر گرتے ہیں ۔لانبا تڑنگا بجھلی جامدانی کا گریبان کھولے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اپنے خالی کاجوں کیطرف اشارہ کرکے بولا۔

"جب زہرہ اپنے ہاتھ سے پان بنا کے دیئں تو ہم کا بھی کچھ دینا پڑا ۔جیب تو خالی ہوئے ہے ۔چٹ سے چاندی کے بٹن نکال کر تھالی میں ڈال دیے ۔"

پھر اس نے اپنا منہ کھول کر دکھایا جو لال تھا ۔ وہ یہ سرخی دکھلانے کے لیے منہ سنبھال کر رکھے ہوئے تھا ۔ میں دیوالی کے چراغوں کے مانند جلتی ہوئی چار جوڑ معصوم اور مسرور آنکھوں میں گھرا کھڑا تھا کہ بجھلی نے مجھے دوبارہ زندگی نصیب ہونے کی بشارت دی ۔یعنی عشاء کی نماز کے بعد وہ مجھے زہرہ کے گھر پہنچا دے گا ۔بجھلی نے بٹنوں کی بات چھیڑ کر ایک اور مصیبت کھڑی کر دی تھی ۔خیر میں دادی بی کے گھر گیا ۔ وہ تخت پر بیٹھی مغرب کی نماز کیلئے وضو کر رہی تھیں ۔ میں نے ان کی پیٹھ پر چڑھکر گلے میں بانہیں ڈالدیں ۔ پھر ان کی انگلی سے وہ انگوٹھی نکال لی جس پر نیلم کی چھوٹی سی مچھلی جڑی ہوئی تھی اور جسے میں گھنٹے آدھ گھنٹے کیلئے پہن لیا کرتا تھا ۔اور اس عرصے میں ایک آدمی مجھ پر پہرہ دیا کرتا تھا ۔ انگوٹھی بیچ کی انگلی میں دھانس کر میں گھوڑے کیطرح ہنہناتا ھوا بھاگا ۔ اب تک میرے لئے ہر رات ماماسے بھری ہوئی نرم نرم گودھوا کرتی تھی لیکن اس رات نے کینچلی بدل لی تھی اور داستانوں کی سوتیلی ماں کیطرح ڈائن ھو گئی تھی ۔ سارے میں کفن پہنے ہوئے کمبخت چاندنی پھیلی پڑی تھی ۔ کنوار کا چاند کو توال کیطرح گیس جلانے ستاروں کی سپاہیوں کی فوج لئے پہرے پر کھڑا تھا ۔ ٹھنڈی ہوا زہرہ کی خوشبو کی قبا پہنے اٹھلاتی پھر رہی تھی ۔ اتنی رات ہوگئی تھی کہ کبھی کبھی مرغوں کی بانگوں سے کان گونجنے لگتے ۔لیکن میرے گھر سے لگی ہوئی مسجد کا کاہل موذن کسی طرح اذان ہی نہ دے چکتا ۔ خود میرے گھر میں ادھر ادھر کی آئی ہوئی عورتیں سکون سے صروطے چلا رہی تھیں اور باتیں کر

رہی تھیں ۔ اماں اسطرح اطمینان سے بیٹھی تھیں جیسے آج رتجگہ ہو ۔ پروگرام کے مطابق جھبرو نے دروازے بانگ لگائی ۔ پوچھنے پر بتلایا کہ میلاد شریف ہونے جا رہا ہے ۔ بھیا سے کہنے کہ آنے جائیں ۔ اماں کسی بین الاقوامی مسئلے پر الجھی ہوئی تھیں ۔ سازش کو بھانپ نہ سکیں ۔ میں ان کی خاموشی کو رضامندی مان کر نکل کھڑا ہوا ۔

املیوں کی اندھیاری چھاؤں میں پہنچا تھا کہ نجیچلی نکل آیا ۔ دور کچے مکان کے برونٹھے میں جلتے ہوئے لال لال چراغ کیطرف اشارہ کر کے کہنے لگا ۔

"ای ماں ہے ۔۔۔۔۔ مزے میں چلو ۔۔۔۔۔ معاملہ سب چوکس ہے ۔۔۔۔۔ بڑے بھیا نہر پہ نہلنے گئے ہیں ۔"

دروازے پر قدم رکھتے ہی پیٹ میں درد ہونے لگا ۔ کنپٹیوں میں آگ لگ گئی ۔ زبان سوکھ گئی ۔ جیسے تیسے صحن پار کیا ۔ داہنی طرف چھپر پیال کے فرش پر کئی آدمی بے سدھ پڑے تھے ۔ ان کے سرہانے نقارے بڑے بڑے دھبوں کیطرح رکھے تھے ۔ بائیں طرف دیوار کے نیچے بکریاں اپنی ٹانگوں میں منہ دیے پڑی تھیں ۔ میں سامنے کے کمرے میں داخل ہو گیا ۔

فرش پر سوتی قالین بچھا تھا ۔ اس پر وہ گاؤ سے لگی بیٹھی تھیں ۔ بل میں لٹکتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں جگمگا رہی تھیں ۔ میں نے ان کو سمیٹ کر آنکھوں میں رکھ لیا ۔ وہ سفید ساڑی پہنے ہوئے تھیں ۔ ان کے بدن پر کوئی زیور نہیں تھا ۔ کھلائی ہوئی مانگ کے دونوں طرف گچھے بکھرے ہوئے تھے ۔ چاندی کی انگلیوں میں مہندی سے لال ناخن تھے جیسے یاقوت کے نگینے جڑے ہوں ۔ کالی لانبی چوٹی گود میں پڑی تھی ۔ سفید پاندان ان کے زانو سے بھڑا رکھا ہوا ۔ پھر انھوں نے نگاہ اٹھائی وہ آنکھیں آج تک میری آنکھوں میں محفوظ ہیں ۔ جیسے بجلیوں کی کئی ہوئی سفیدی کو صدیوں کی راتوں کا عطر نکال کر جما دیا گیا ہو ۔ وہ بے پناہ نگاہ آج تک میری راتوں کے کلیجے میں کھٹکا کرتی ہے ۔

"تشریف رکھئے"

دھونکنی کیطرح چلتی ہوئی میری سانس رک گئی ۔ میں ایک کونے پر بیٹھ گیا ۔ پاندان کھلا ۔ انگلیاں نرت کرنے لگیں ۔ دو گلوریاں پاندان کی کلھیا کے ڈھکنے پر رکھ کر مجھے پیش کیں ۔ میں نے اٹھا کر منہ میں رکھ لیں اور اپنی بیچ کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر ڈھکنے میں ڈال دی ۔ وہ انگوٹھی دیکھتی رہیں ۔ میں ان کو دیکھتا رہا ۔ پھر انھوں نے کنکھیوں سے مجھ

کو دیکھا ۔میں قالین کے کالے پھول دیکھنے لگا۔انھوں نے گاؤں سے پشت نکالی ۔دونوں ہاتھ داہنے گھٹنے پر باندھ لیے ۔میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے مجھے کیا کچھ کہہ ڈالنا ہے لیکن کچھ یاد نہیں آرہا تھا ۔مجھے کچھ معلوم بھی نہیں تھا سوااس کے کہ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے اور آنکھوں کے بٹوے میں بند آنسوؤں کی لڑیاں اس کے دامن پر بکھر جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہیں کہ دروازہ ایک دیو سے بھر گیا ۔میں نے تڑپ کر دیکھارام دین کھڑا تھا۔ آنکھیں ہوش میں بھی نہ آپائی تھیں کہ کانوں پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"درجن بھر آدمی تم کا ڈھونڈت گھوم رہے ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہو ۔چلو آج دیکھو تمری کیسی گندی ہوت ہے ۔"

میں نے اٹھاتے جاتے وقت اس کی آنکھیں دیکھنے کی ناکام کوشش کی ۔

گرم لہو میں غلطاں

ان کے طباق ایسے چوڑے چکلے زرد چہرے پر چھوٹی بڑی شکنوں کا گھنا ڈھیلا جال پڑا ہوا تھا جیسے کوری مارکین کا ٹکڑا نچوڑ کر سکھا دیا گیا ہو۔ دھندلی دھندلی آنکھوں سے میلا میلا پانی رس رہا تھا جیسے ان کی سیاہ گندے ناخونوں والی موٹی موٹی انگلیاں کاندھے پر جھولتے میلے چکٹ آنچل سے بار بار پونچھ رہی تھیں اور سامنے رکھے بڑے سے طوق کے ڈھانچے کو برابر نہارے جا رہی تھیں جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کا سونا دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ پھر انھوں نے پاس رکھے ہوئے حمیدہ نے اور منی کے پینڈے والے حقے کو جھکا کر بانس کی سر منی نے موٹے موٹے لرزتے ہونٹوں میں دبالی اور ایک پھسپھسا کش لیا اور میرا سارا حافظہ جھنجھنا گیا۔ شادی کا بھرا پرا گھر، مہمان عورتوں اور ندیدے بچوں کی پرشور آواز کے تھپیڑوں سے ہل رہا تھا اور میں ڈولتا ہوا ان کے قریب سے گذرا جا رہا تھا۔ میں نے جاتے جاتے ان کی طرف پلٹ کر دیکھا جیسے مارکین کے ٹکڑے پر بجھتے کوئلوں کا عکس لپک گیا اور انھوں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں۔" اور میری آنکھوں کے سامنے یادوں کے ورق اڑنے لگے۔ ابھی نہ ہندوستان آزاد ہوا تھا اور نہ پاکستان پیدا ہوا تھا۔ نہ زمینداری ختم ہوئی تھی اور نہ آم کی فصلیں روزی کا وسیلہ بنی تھیں۔ سب کچھ اسی طرح موجود تھا جسطرح صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ انگریز خدا اپنے گدھوں کو سونے کے توبڑوں میں خشکہ نہیں بریانی کھلا رہا تھا اور اس سال آم کی فصل اسطرح ٹوٹ کر آئی تھی کہ گلی کوچے پھلوں سے سڑنے لگے تھے۔ تخمی باغوں کے باغبانوں کی لین ڈوری پھاٹک سے ڈیوڑھی تک سروں پر چنیدہ آموں کے جھوے لادے کھڑی رہتی۔ تیسرے درجے کے مسافروں کیطرح انھیں کوئی نہ پوچھتا۔ ہاں قلمی باغوں کے باغبان فرسٹ کلاس کے مسافروں کیطرح فضیلت سے نوازے جاتے اور ان کے آم ہاتھ کے ہاتھ گنا لیے جاتے۔ دور تک پھیلے ہوئے اونچی چھتوں اور موٹے ستونوں والے لق ودق دالانوں میں کچے پکے آموں کی جازم بچھی رہتی۔ بوڑھی بدصورت اور کنگھنی

عورتیں ہاتھوں میں لمبی لمبی لکڑیاں لئے ندیدے لڑکوں اور ہتھ لگی عورتوں کو گالیاں اور کوسنے بانٹا کرتیں ۔ اس روز اندر سے باہر تک جیسے ساری فضا بدلی ہوئی تھی ، دھلی دھلائی سی لگ رہی تھی ۔ ڈیوڑھی میں نہ جھوے ، نہ کدالیں ، نہ کھرپے اور نہ وہ مانوس بھنانا ، صاف صفیلا آنگن ، اندرونی دالان کے چوکے اور گاؤ تکیے صندوق سے نکلے تخت پوش اور غلاف پہنے میاں بوت بنے بیٹھے تھے ۔ ماہی پشت والے نواڑی پلنگوں پر آدھے آدھے سوتی قالین پڑے تھے ۔ پان خوروں کے منہ کیطرح لال لال اگالدان انگریزوں کے منہ کیطرح صاف صاف رکھے تھے مراد آبادی پاندان اور لوٹے اور سرپوش سب اجلے اجلے کپڑے پہنے سلیقے سے اپنی جگہ کھڑے بیٹھے تھے ۔ چھت میں جھولتے بھاری پنکھے تک کو دھلا جوڑا پہنا دیا گیا تھا ۔ بالکل عید بقرعید کا سا ماحول تھا ، لیکن بقرعید کا سا شور نہ ہنگامہ ۔ کمرے کے پانچوں دروازوں پر پڑے ہوئے خس کے موٹے موٹے بدوضع پردوں کے نیچے پانی کے چھوٹے چھوٹے سے تھالے بن گئے تھے ۔ اندر چھت کے دوہرے پنکھوں کی اکلوتی رسی لوہے کی گراری پر تیز تیز چل رہی تھی جیسے چڑیوں کے کئی جوڑے ایک ساتھ چوں چوں کر رہے ہوں ۔ میں نے ذرا جھجک کر پردا اٹھایا تو محسوس ہوا جیسے یہاں سے وہاں تک سارا کمرہ ان کی روشنی سے جھم جھما رہا ہے ۔ میں انھیں دیکھ رہا تھا جیسے امام باڑے میں رکھا ہوا چاندی کا تعزیہ دیکھا جاتا ہے جیسے دسہرے کی جھانکی دیکھی جاتی ہے کسی آواز نے ٹھونکا دیا تو میں بیدار ہوا ۔ اپنی کم عمری کے باوجود مجھے خوشی ہوئی کہ وہ مجھ سے مخاطب تھیں اور جان کر رنج ہوا کہ وہ بول لیتی ہیں کہ میں نے کبھی تعزیہ اور جھانکیوں کو بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ۔ لیکن میں خاموش رہا کہ میرے حواس مبہوت ہو چکے تھے ۔ سن ہو چکے تھے ۔ جب وہ کھانے کیلئے دوسرے کمرے میں جانے کو اٹھیں تو میرا سارا وجود میری آنکھوں میں سمٹ آیا تھا ۔ میں انھیں دیکھ رہا تھا ۔ گھور رہا تھا ۔ ان کے بدن کے ایک ایک حصے اپنی کمسن آنکھوں کی چھوٹی چھوٹی بانہوں میں سمیٹ رہا تھا ۔ ان کی بھاری بھرکم اور بلند و بالا شخصیت کی وجاہت اور شکوہ اور غرور اور تمکنت کے سامنے حسن کے تمام مروجہ معیار اور میزان ہیچ تھے کہ حسن بدن کے اعداد و شمار کی قید اور ، خدوخال کے تناسب کی تعریف کی پابندی سے آزاد بھی ہوتا ہے بلند بھی ہوتا ہے ۔ وہ ململ کا کامدار کرتا اور فرشی پائجامہ پہنے اسطرح چل رہی تھیں جیسے مٹی کے کھلونوں کی دوکان میں کوئی رانی بھٹک کر آ گئی ہو ۔ کوئی عورت ان کے ہاتھ دھلا رہی تھی اور قاش میں ان کے ہاتھوں سے گرتا ہوا پانی گلابی معلوم ہو رہا تھا ۔ میں دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا لیکن

نہ کھانے کی خواہش تھی اور نہ کھانے میں مزہ ۔ وہ سر کو دوپٹے سے ڈھانکے ایک زانو پر بیٹھی کھانا نہیں کھا رہی تھیں کھانے کو قبولیت سے مشرف کر رہی تھیں ۔

اندھیارے باغ کے کچے کنوئیں کی گراری میں رسی سے بندھی منتخب آموں کی جھال جو صبح سے پڑی تھی نکالی گئی اور برف کے چورے سے بھری ہوئی لگنوں میں آم لگائے گئے ۔ بھائی جان نے درجنوں تخمی باغوں کا سب سے نفیس آم انھیں پیش کیا ۔ انھوں نے ڈنٹھل توڑ کر ملائم کیا اور صرف ایک بار منہ لگا کر چھلکوں کے طباق میں ڈال دیا ۔ چند دانوں کے بعد بھائی جان نے قلمی آم پیش کئے ۔ بڑے اصرار اور تکلف کے بعد ایک لنگڑا اٹھایا ۔ آم کے درمیان چاقو سے حلقہ بنا کر اوپری نصف ڈھکن کیطرح اتار لیا بقیہ نصف میں جمی ہوئی گٹھلی کھینچ کر پھینک دی اور دونوں حصوں کے ننھے ننھے سبز وشاداب آبخوروں کو چمچہ سے نکال کر کھا لیا ۔ میں مسحور سا بیٹھا ہوا تھا ۔ جب خاصدان پیش ہوا تو انھوں نے سرسری لہجے میں اپنی عورتوں سے کہا کہ وہ بھائی جان سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہیں اور بھائی جان بھی انھیں کے ساتھ کچھ احکام دیتی باہر چلی گئیں ۔ میں اپنی جگہ پر جما ہوا تھا کہ بھائی جان نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں بھی اپنے پیروں پر اپنا بوجھ لادے باہر نکل آیا ۔ لیکن ڈیوڑھی تک پہنچتے پہنچتے انھیں دیکھنے کے شوق نے پانو پکڑ لیے ۔ تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا ۔ پھر پورے آنگن کا چکر کاٹ کر دوسری سمت کے دروازے پر کھڑا ہو گیا ۔ پردے کی جھری سے دیکھا وہ میری طرف پشت کیے بیٹھی تھیں ۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے بھائی جان کے صرف پیر نظر آرہے تھے ۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھیں ۔ ان کی آواز تازہ پھولوں کی چادر کیطرح میری سماعت پر بچھی جا رہی تھیں ۔ "تم میاں کی فکر مت کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میاں کل شام لکھنؤ کیلئے سوار ہو گئے اور ان کو معلوم ہے کہ میں صبح مقبول میاں کی زیارت کیلئے خیرآباد جا رہی ہوں ۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ رات ہی میں سوار ہو گئی اور راستے میں دولہن کی عیادت کیلئے تمہارے گھر اتر گئی ۔ سب جانتے ہیں کہ زینب اپنے کمرے میں سو رہی ہو گی ۔

"ہوں"

"اگر تم کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے ۔ میں واپس"

"آپ کیا فرما رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو آپ کے متعلق"

"لاش ہے کہاں؟"

"میرے بستر بند میں"

"ہوں ----- آپ مطمئن رہیں ----- سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور جیسے خاموشی ہو گئی میں کچھ سمجھ گیا کچھ نہیں سمجھ سکا لیکن ڈر بہت گیا اور پھر اچانک جیسے پیٹ میں درد ہونے لگا اور بڑھتا گیا۔ پھر میں باہر جا کر پڑ رہا۔ پھر چوران کی تلاش میں اندر گیا۔ بھابی جان پاندان کھولے بیٹھی تھیں اور پاس کھڑی ہوئی عورتوں کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے رہی تھیں۔ میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک طرف سے وہ آگئیں اور میں سر سے پاؤں تک جھنجھنا گیا۔ ان کے داہنے ہاتھ پر ایک ساری پڑی تھی اور بائیں ہاتھ میں رنگے ہوئے چنے ہوئے دوپٹے کا گولہ تھا۔ انھوں نے ساری بھابی جان کی طرف بڑھائی۔

اور بھابی جان نے سلام کر کے جیسے ہی دوپٹے کا گولہ ہاتھ میں پکڑا وہ بچوں کی طرح چیخ کر بولیں۔

"فراموش دس ہزار"

بھابی جان نے ہنستے ہوئے دوپٹہ کھولا تو اندر سے سیندوری رنگ کا فراموش ٹپک پڑا۔ ابھی سب ہنس رہے تھے کہ بھائی جان آگئے اور وہ چمک کر چہکیں۔

"میں پورے دس ہزار آم لونگی گنے ہوئے اور چنے ہوئے۔"

"جی ہاں۔ دس ہی ہزار آم پیش کئے جائیں گے۔ گنے ہوئے اور چنے ہوئے۔"

رات کے کھانے کے بعد دوسری منزل کے صحن میں ان کے سفید بستر کے سامنے جب حقہ لگا اور انھوں نے بالکل بھائی جان کی طرح گڑ گڑا کش لیا تو پہلی بار مجھے ان سے ڈر لگا۔ وہ ڈر بھی کچھ عجیب سا تھا۔ جیسے کوئی شخص آدھی رات کے وقت تن تنہا تاج محل میں کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نام نہ تھا لیکن میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ نیچے کا پورا صحن خالی پڑا تھا۔ پورے چبوترے پر صرف ایک بھائی جان کا بستر باہر سے لا کر لگا دیا گیا تھا اور ان کے کتے اس کے ارد گرد بیٹھے ہانپ رہے تھے میں اسی پر لیٹ گیا اور مچھر دانی کے پردے ڈال لئے۔ پھر ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی مایوس آواز آئی۔ پھر آموں کے جھوے آنے لگے۔ اور چبوترے کے نیچے ڈھیر ہونے لگے۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ سوچتا رہا ڈرتا رہا۔ پھر آوازیں بجھنے لگیں اور خاموشی طلوع ہونے لگی۔ میں جاگتے جاگتے تھکنے لگا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ پھر آہستہ سے بولا۔ بھائی جان اندر آئے۔ چبوترے پر چڑھتے ہی ٹھٹھک گئے

میرے پلنگ کی پٹی کے پاس کھڑے ہوئے ۔ مجھے آہستہ سے پکارا لیکن میں گبر بنا لیٹا رہا۔ انھوں نے پردہ ہٹا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر آواز دی لیکن میں اسی طرح دم سادھے پڑا رہا۔ بھائی جان تھوڑی دیر چبوترے پر ٹہلتے رہے پھر آواز دی ۔ کئی آدمی اندر آگئے ۔میں سب کو جانتا تھا پہچانتا تھا ۔ بھائی جان نے جیب سے کنجی نکال کر ایک کو پکڑا دی ۔اس نے دالان کی بغلی کوٹھری میں پڑے ہوئے پنسیری بھر کے تالے کو کھولا۔دوسرے آدمی نے لالٹین کی بتی اونچی کی ۔ وہ کوٹھی سے نکلا تو چمڑے کا سیاہ بھاری ہولڈال اس کے ہاتھوں میں لٹکا ہوا تھا ۔ دالان کے بیچوں بیچ رکھ کر ایک آدمی نے اس کے دونوں تالے مروڑ دیے اور وہ بریف کیس کیطرح کھل گیا۔اس نے جھک کر ایک لڑکی نکال کر زمین پر رکھدی ۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیاں گردن کے پاس رکھی تھیں ۔مڑے ہوئے گھٹنے پیٹ سے لگے تھے ۔اس کا چہرہ میری طرف گول گول صاف صاف بند آنکھوں کی سیاہ لانبی کمان دور تک کھنچی ہوئی تھی ۔ میں نے اس کے بولنے رونے اور چیخنے کا انتظار کیا لیکن جب اس کو آم کے خالی بورے میں داب کر بھر دیا گیا اور اس کے باوجود وہ خاموش رہی تو میں نے چیخنا چاہا لیکن میرے منھ سے بھی آواز نہ نکلی اور میں ہانپنے لگا اور جب بورا اٹھا کر آدمی چلے گئے اور وہ تابوت نما ہولڈال بھی رخصت ہو گیا اور بھائی جان کی آواز آئی کہ ڈیوڑھی بند کر لو تو اچانک جیسے میری آواز پر پڑا ہوا پنسیری بھر کا تالا کھل گیا اور میں اتنے زور سے چیخا کہ خود مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے اور پھر آناً فاناً سب میرے پلنگ کے ارد گرد جمع ہو گئے اور میں نے انھیں آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ گلے میں بیلے کے ہار ہاتھوں میں گجرے اور کانوں میں پھولوں کے جھمکے پہنے مجھے گھور رہی تھیں میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور میں نے جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ان کے بدن کی بے کارمٹی کے ڈھیر کے نیچے وہی لڑکی کھڑی ہوئی ہے ۔اس کے ہاتھ اور پیر کھلے ہوئے ہیں بالوں کی چوٹیاں گندھی ہوئی ہیں آنکھوں میں ڈھیروں کاجل لگا ہے اور اس کی مسکراتی نظریں ان کی بجھتی ہوئی چلم کو گھور رہی ہیں ۔

———— • ————

نیا قانون

لکھنو کے سر پہ اختر نگر کا تاج رکھا تھا جس کے ہیرے کمہلانے اور موتی سنولانے لگے تھے۔ آہستہ خرام گومتی امام باڑہ آصفی کے چرن چھو کر آگے بڑھی تو ریزیڈنسی کے سامنے جیسے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ موجوں نے بے قراری سے سر اٹھا اٹھا کر دیکھا لیکن پہچاننے سے عاجز رہیں کہ ریزیڈنسی نواب ریزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی کے بجائے انگریزوں کی چھاونی معلوم ہو رہی تھی۔ تمام برجوں اور فرازوں پہ توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ راؤٹیوں اور گزلیوں کا پورا جنگل لہلہا رہا تھا۔ حصار پہ انگریز سواروں اور پیدلوں کا ہجوم تھا۔ دونوں پھاٹکوں کے دونوں دروں بندوقیں تنی ہوئی تھیں۔ پھر راہ چلتوں نے دیکھا کہ قیصر باغ کیطرف سے آنے والی سڑک حیدری پلٹن کے سواروں سے جگمگانے لگی جن کی وردیاں دولہا کے لباسوں کیطرح بھڑکدار اور ہتھیار دولہن کے زیوروں کیطرح چمکدار تھے۔ ریزیڈنسی کے جنوبی پھاٹک پہ چھلبل کرتے سواروں کے پردے سے وزیر اعظم نواب علی نقی خاں اور وکیل السلطنت موتمن الدولہ کے بوچے برآمد ہوئے جن کے درمیان دس پندرہ سواروں کے اردل کا حجاب تھا اور سامنے انگریز سپاہیوں کے ہتھیاروں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ دیر کے انتظار کے بعد افسر التشریفات نے آکر ان کو سواریوں سے اتارا اور اپنے اردل کے حلقے میں پاپیادہ پیش دالان تک لے گیا جس کی سیڑھیوں پہ سر سے پاؤں تک اچکن پہنے ہوئے گارڈز کا دستہ کھڑا تھا جیسے زینت کے لئے مجسمے نصب کر دیے گئے ہوں۔ کشتی دار تکیوں کی آبنوسی کرسی پہ وہ دونوں پڑے سوکھتے رہے۔ اپنے ذاتی محافظ رسالے کے متعلق سوچتے رہے جو پھاٹک پہ روک لیا گیا تھا اور مغربی دروازے سے داخل ہونے والی توپوں کی گڑ گڑاہٹ سنتے رہے۔ پھر فوجی افسروں کے جھرمٹ میں وہ ریزیڈنٹ کی اسٹڈی میں باریاب ہوئے۔ ریزیڈنٹ بہادر اسی طرح کرسی پہ جڑے رہے۔ ابرو کے اشارے پہ وزیر اعظم اور وکیل السلطنت اس طرح بیٹھ گئے جیسے وہ ریزیڈنٹ کی اسٹڈی میں نہیں واجد علی شاہ کے دربار میں کرسی نشینی سے سرفراز کئے گئے ہوں۔ تامل کے بعد صاحب بہادر نے اپنے پہلو میں کھڑے

ہوئے میر منشی صلابت علی کو سر کی جنبش سے اشارہ کیااور میر منشی ایک خریطہ کھول کر پڑھنے لگااور جب اس کے منہ سے یہ فقرہ ادا ہوا۔

"کمپنی بہادر نے پچاس لاکھ سالانہ کے وظیفے کے عوض میں سلطنت کاالحاق کرلیا"

تو وکیل السلطنت کہ سپاہی بچہ تھا ہر چند کہ سپہ گری کے سبق بھول چکا تھا تاہم نیزے کیطرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ ناممکن ہے"

ریزیڈنٹ نے کھڑے ہو کر اسے گھورا۔ایک ایک لفظ کو توڑ کر ادا کیا۔

یہ گورنر جنرل بہادر کا حکم ہے اور تم کو اس دستاویز پر دستخط کرنا ہیں۔

ریزیڈنٹ کا لہجہ جلاد کی تلوار کیطرح بے امان تھا اور اس کے لفظوں میں بارود کے بگولوں کا اشتعال تھا۔

"یہ ہر گز نہیں ہو سکتا۔"

دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

جواب میں صاحب بہادر نے کمر سے کرچ کھول کر میز پر ڈال دی۔

وکیل السلطنت نے اس بھانڈ وزیراعظم کو دیکھا جس کی انگلیاں طبلے کی سنگت کی عادت کی جگالی کر رہی تھیں اور اس نے خود اپنی آواز سنی۔

اس کا فیصلہ تو آج سے بہت پہلے بکسر کے میدان میں ہو چکا تاہم اتنے بڑے حکم کی تعمیل کے لئے کم از کم دس دن کی مہلت۔

"ناہیں ممکن ناہیں"

"تین ہی دن بخش دینے جائیں"

"ناہیں ----چوبیس گھنٹے کے بعد عمل در آمد شروع ہو جانے گا۔"

اور وکیل السلطنت کا تھر تھراتا ہوا ہاتھ قلمدان کیطرف بڑھنے لگا۔

وزیراعظم نے قیصر باغ کے شمالی پھاٹک کیطرف مڑتے ہوئے سواری کے آئینے میں دیکھ لیا کہ موتمن الدولہ کا بوچہ روشن الدولہ کی کوٹھی کیطرف مڑ رہا ہے۔نوبت خانے پر دوسری نوبت بج رہی تھی اور لال بارہ دری کے باب عالی پر چتر طوغ کھڑا جہاں پناہ کی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا وزیراعظم نے دوسری ڈیوڑھی پر خان ساماں داروغہ معتبر علی خاں کی کمر سے تلوار کھول کر ہاتھ میں لے لی اور تیسری ڈیوڑھی کے گھونگھٹ پر گلے میں

پہن لی اور حاضر دربار ہو کر ہاتھ باندھ لیے ۔ بادشاہ پنج گوشیہ تاج پہنے جواہرات میں ڈھکا ہوا
سونے کے تخت پر بیٹھا تھا اور مشہور زمانہ سازندوں کے فن کار ہاتھوں سے غنا کے بادل
برس رہے تھے اور سدھے ہوئے بجے ہوئے کڑھے ہوئے گوشت پوست کی زندہ بجلیاں
تڑپ رہی تھیں ۔ ایک بار نگاہ اٹھی تو وزیراعظم تسلیمات پیش کر رہا تھا ۔ چلتے ہوئے
ہاتھ کے برابر تلوار جھول رہی تھی ۔ بادشاہ کا ہاتھ اٹھا اور سازوں اور مضرابوں اور گھنگھروؤں
تک کی سانس رک گئی اور دوسری جنبش پر سارا ہال خالی ہو گیا جیسے صبح کا آسمان ۔

"کیا ہے"

غلام نواب ریزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی سے آرہا ہے ۔

شاہ منزل کی پہلی سیڑھی پر قیصری پلٹن کے رسالدار کے ہاتھ سے بندوق لے لی
معائنہ کرتے رہے پھر نواب علی نقی خاں وزیراعظم کو اسطرح دیکھا کہ نگاہیں اس کے پار
ہو گئیں ۔

یہ بندوق جلد بھرنے اور فیر کرنے میں انگریز کی بندوق سے بدرجہاں بہتر ہے
لیکن اس کے چلانے والے کندھے غدار اور انگلیاں نمک حرام ہیں اور ایک ایک سیڑھی
اسطرح چڑھی جیسے ایک ایک دنیا پیچھے چھوڑ آئے ہوں ۔

چاندی کے ستونوں پر لاجوردی زربفت کا شامیانہ کھڑا تھا ۔ اس کے وسط میں مرصع
نگیرے کے سائے میں چھتر شاہی کے نیچے تخت سلطانی کے بائیں جانب مومن الدولہ
سلطنت کے دوسرے دولاؤں کے ساتھ مغرور بے نیازی سے کھڑا تھا ۔ تخت کے قریب
پہنچنے پر ریزیڈنٹ نے اسطرح سلامی دی جیسے بازاری آدمی اترے کو توال کو سلام کرتے
ہیں ۔ اس کے سرخ کوٹ کے شانوں پر زری کے جھبے جھول رہے تھے ۔ پتلے جھبے کے سفید
اونچے گول ہیٹ میں جڑاؤ کلغی لگی تھی اور کمر میں لگی لانبی سیدھی تلوار سرخ چرمی ساق پوش
کے تھپکیاں دے رہی تھی ۔ بادشاہ نے تخت پر بیٹھے ہی ریزیڈنٹ کو مخاطب کیا ۔

"-----اب ریزیڈنٹ بہادر کو ایسی لڑائی دکھلائیں گے جس کی نظیر دنیا کا کوئی
دربار پیش نہیں کر سکتا۔"

اشارہ ملتے ہی سیمیں کٹہرے کے بازوؤں پر کھڑے ہوئے چوبداروں نے
جھنڈے ہلا دیے اور نیچے دریا کے اس پار رمنوں باغوں اور جنگلوں کے پورے علاقے میں ہلچل
سی مچ گئی ۔ تھوڑی ہی دیر میں شمالی اور جنوبی گوشوں سے ڈھولوں کے پیٹنے ہانکنے والوں کے

للکارنے اور سینکڑوں برچھیوں کے کڑکنے کا طوفان مچ گیا۔ لوہے کی جالیوں اور تول کے پردوں کے عقب ایک مستطیل کٹہرے کے شمالی دروازے پر ایک دیو پیکر چھکڑا ڈھکیلتا ہوا لایا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک غیر معمولی طور پر سفید اونچا اور بھاری گھوڑا انتہائی غضبناکی سے ہنہناتا ہوا داخل ہوا۔ کبھی ہاتھوں سے زمین کھرچتا کبھی پیروں پر کھڑا ہو کر پورے جسم سے تڑپتا۔ اس کی کنوتیوں سے چنگاریاں اور تھنوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور اس کی جولانیوں کی مار سے پورا کٹہرہ ہل رہا تھا مگر جنوبی دروازہ بھی کھل گیا اور دوسرے چھکڑے سے ایک شیر اندر داخل ہوا۔ گرجتا دہاڑتا کٹہرے کے وسط تک جا کر تھما۔ ساتھ ہی یکساں آوازوں کا یکمشت گولہ اس پر گر پڑا اور وہ بھڑک کر اٹھا اور ستے ہوئے بدن سے اڑ کر گھوڑے پر گرا۔ گھوڑے نے پوری مشاقی سے اپنے اگلے بدن کو سمیٹ کر اتنا کاری وار کیا کہ شیر کا چہرہ بگڑ گیا۔ پورا کٹہرہ اس عجیب و غریب اور بھیاونی لڑائی سے اتھل پتھل تھا اور گرد و باد کے بادلوں میں ڈوبتے اور ابھرتے جانور ایک دوسرے کی قضا کیطرح ایک دوسرے پر مسلط تھے کہ ہزاروں آنکھوں کے سامنے شیر نے پیٹھ دکھائی اور اپنے چھکڑے سے پناہ مانگی اور فاتح گھوڑا کاوے کاٹ رہا تھا چیخ چیخ کر اپنی فتح کا اعلان کر رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے مٹی اڑا رہا تھا کہ بہت سے برچھیت اپنے برچھوں میں دھڑ دھڑاتی مشعلیں جلانے اور کمندانداز وں کا دستہ اپنی کمندیں کھولے لپکا اور گھوڑے کو گرفتار کرنے کے جتن کرنے لگا۔

بادشاہ ابھی ریزیڈنٹ کا چہرہ پڑھ رہا تھا کہ عقب کا پردہ اٹھا۔ زہرہ بدن اور ثریا لباس کنیزیں نقل کی کشتیاں اور شراب کی صراحیاں اٹھائے نرت کرتی حاضر ہوئیں۔ ریزیڈنٹ کا سر ابھی داد میں ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھ سے حیرت اور دوسری سے بے اعتباری ٹپک رہی تھی کہ بادشاہ نے مخاطب کیا۔

جانوروں میں شیر بادشاہ ہوتا ہے اور گھوڑا تاجر ۔۔۔۔۔ مشاہدہ ہے کہ شیروں کے مصاحب لکڑبگھے اور بھیڑیے تک گھوڑوں کا شکار کر لیتے ہیں لیکن جب دنیا پرانی ہو جاتی ہے تو نئی دنیا کیلئے نئے قانون وضع ہوتے ہیں اور اب زمانہ آگیا ہے کہ تاجر گھوڑا بادشاہ شیروں پر غالب ہوتا جائے گا کہ آج یہی قانون قدرت ہے۔"

اور ریزیڈینٹ نے اپنا گلاس اٹھالیا۔

———— • ————

لالہ امام بخش

رموا پور کے لالہ دیبی بخش جب مچھر ہٹہ پہنچے تو دیکھا کہ ان کا "موکل" ملو بھرجی لائی کا تعزیہ بنا رہا ہے۔ ہندو بھرجی کو مسلمانوں کے کرم کرتے دیکھا تو جل کر رہ گئے۔ چنے کیطرح چٹختی آواز میں مقدمے کی پیروی کو بقایا کا تقاضہ کر دیا۔ ملو بے چارہ للو چپو کرنے لگا۔ اور بتلاتے بتلاتے وہ منت بھی بتلا گیا جو اس نے امام حسین سے مانگی تھی اور پانی تھی لالہ لاٹھی کی منھیا پر ٹھڈی رکھے کھڑے سنتے رہے اور سنتے سنتے اپنی سوکھی ماری للائن کی ہری گود کے مہکتے سپنوں میں کھو گئے۔ جب جاگے تو چوکے میں تھالی پروسی دھری تھی اور للائن بدن کی اکلوتی دھوتی کے پلو سے مکھیاں اڑا رہی تھیں۔ پہلے وہ جھوٹ موٹ منھ چھوتی رہیں پھر پھیل گئیں اور لالہ کو ملو بھرجی کا حال بتانا پڑا۔ للائن نے چپ سادھ لی۔ وہی چپ جس کے جادو سے چاندی ایسی دلہن مٹی کے مادھو سے نکاح قبول کر لیتی ہے۔

جب سوچتے سوچتے لالہ دیبی بخش کی کھوپڑی تڑخ گئی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور مچھر ہٹہ میں بجتے ہوئے محرمی باجوں کی دھمک ان کے سنسان آنگن میں منڈلانے لگی تب لالہ دیبی بخش اپنی کھٹیا سے اٹھے۔ چراغ کی ٹھنڈی پیلی روشنی میں جھاویں سے مل مل کر خوب نہائے اور دھوبی کا دھلا ہوا جوڑا پہنا جیسے ڈٹ کر مسرکھ اور سیتاپور کی کچہریوں میں وہ ٹکے ٹکے پر مقدمے لڑاتے ہیں۔ دروازے سے نکلتے نکلتے للائن کو جتا گئے کہ میں رات کے گئے لوٹوں گا۔ جیسے جیسے مچھر ہٹہ قریب آتا جاتا اور باجوں کی گھن گرج نزدیک ہوتی جاتی ویسے ویسے ان کے دل کی دھیرج بڑھتی جاتی۔ جوگی اپنے چوک پر رکھی ہوئی ضریح کے آگے اچھل اچھل کر ماتم کر رہے تھے اور مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ گلستاں بوستاں چاٹے ہوئے لالہ دیبی بخش نے آدمیوں کی دیواروں میں اپنا راستہ بنایا اور کھڑے پگھلتے رہے۔ نیم سار کے مندر میں درگا میا کی مورتی کیطرح سامنے ضریح مبارک رکھی تھی۔ لالہ نے کانپتے ہاتھوں کو سنبھال کر جوڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جب وہ وہاں سے ٹلے تو چاندنی سنولانے لگی تھی سڑکیں ننگی پڑی تھیں روشنیوں کی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔ باجے سو گئے تھے۔ دوکانوں

نے پلکیں موندلی تھیں ۔ اور وہ خود دیر تک سو کر اٹھے ہوئے بچے کیطرح ہلکے پھلکے اور
چونچال ہو گئے تھے ۔

پھر ان کی تعزیر نے بھی ملو بھرجی کی کہانی دہرادی ۔ گھر کے اکلوتے کمرے
کی کنڈی میں پانی بھرنے والی رسی میں پرویا ہوا جھوا جھولنے لگا جس میں ایک گل گوتھنا بچہ
آنکھوں میں کاجل بھرے ہاتھ پیروں میں کالے تاگے پہنے اور ڈھیروں گنڈے تعویز
لادے ہمک رہا تھا ۔ لالہ کو بھائی برادری کے خوف نے بہت دہلایا لیکن وہ مانے نہیں اور اپنے
سپوت کا نام لالہ امام بخش رکھ ہی دیا ۔ یہ چھوٹے سے لالہ امام بخش پہلے امامی لالہ ہوئے پھر
ممولالہ بنے اور آخر میں مموال لالہ ہو کر رہ گئے ۔

لالہ نے مموال لالہ کو پھول پان کیطرح رکھا ۔ ان کے پاس زمینداری یا کاشتکاری جو
کچھ بھی تھی تیس بیگھے زمین تھی جسے وہ جوتتے بوتے تھے لیکن اسطرح کہ جیتے جی نہ کبھی
ہل کی منٹھیا پر ہاتھ رکھا اور نہ بیل بدھیا پالنے کا جھگڑا مول لیا ۔ لیکن کھلیان اٹھاتے تھے کہ گھر
بھر جاتا تھا ۔ کرتے یہ تھے کہ ایسے ایسوں کو مقدمے کی پیروی کے جال میں پھانس لیتے
تھے جو ہل بھی چلاتے اور پانی بھی لگاتے ۔ لالہ کی کھیتی ہری رہتی اور جیب بھری ۔ مموال
لالہ بڑھتا گیا اور لالہ کا آنگن پاس پڑوس کے الاہنوں سے بھرتا گیا ۔ کسی کو گالی دے دی ۔
کسی کا بیل بدھیا کھول دیا کسی کا کھیت نوچ لیا کسی کا باغ کھسوٹ لیا ۔ لالہ دیبی بخش
سب کے ہاتھ پاؤں جوڑتے ۔ بیگار بھگتتے ۔ پیسے کوڑی سے بھرنا بھرتے لیکن لاڈلے کو پھول
کی چھڑی بھی نہ چھلاتے ۔ جب مموال چہارم میں تین مرتبہ لڑھک گیا تو لالہ اسے مقدمہ بازی
سکھانے لگے ۔ تحصیل یا صدر جاتے تو مموال کو ٹانگ سے باندھ لیتے ۔ لیکن مموال کے لچھن ہی
اور تھے ۔ دیوانی فوجداری کی الف ب بھی نہ پڑھ پایا تھا کہ لالہ دیبی بخش چلتے بنے ۔ ان کا
کریا کرم کر کے لالائن ایسا تھکیں کہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندلیں ۔ اب تو مموال کے سچ
مچ پر نکل آئے ۔ ہاتھ پیروں میں نہیں زبان میں ۔ ایسی ایسی اڑاتا کہ سننے والے سناٹے میں رہ
جاتے اپنا ہی جلاتے پرائے بغلیں بجاتے ۔

وہ کام دھام سے منہ چرانے باپ کا لوند جوڑا جمع جتھا دونوں ہاتھوں سے اڑانے
لگا ۔ پھر گھر کا الا بلا پاس پڑوس میں پہنچ گیا ۔ تیس بیگھے زمین زمینداری کے شوق میں کٹھیا
بتاشے کیطرح ادھیا پر بٹ گئی ۔ اب مموال اپنے بھائی بندوں کو جنھوں نے اس کی زمین
جوت لی تھی "اسامی" کہنے لگا ۔ گھر کے دھلے کپڑے پہن کر بانس کی چھڑی ہاتھ میں لے کر

خالص زمیندارانہ انداز میں کھیتوں کا معائنہ کرنے نکلتا۔ چھیڑ چھیڑ کر الجھتا۔ چھڑی چمکاتا اور گالیاں بکتا۔ زمانے کے سرد و گرم جھیلے ہوئے اور گرجتے برستے زمینداروں کا تیہہ دیکھے ہوئے ٹھنڈے کسان سنی کو ان سنی کرتے رہے اس لیے اور بھی کہ ان کو لالہ دینی بخش کا چلن یاد تھا۔ مموں لالہ دھیرے دھیرے پتنگ کیطرح اونچا ہوتا گیا۔ گاؤں کے ٹیڑھے ترچھے جوان مموں کو سنجیدگی سے منہ نہ لگاتے کیونکہ نہ اس کی بانہوں میں بل تھا نہ باتوں میں رس نہ کھوپڑی میں مت اور جیب میں جس۔ بڑے بوڑھوں کے پاس وہ خود نہ بھٹکتا اس لیے کہ وہ بات بے بات نصیحتوں کے حقے گڑگڑانے لگتے جن کی کڑواہٹ سے مموں کا دم الجھنے لگتا۔ جس دن قرب و جوار میں کہیں کوئی واردات ہوجاتی اس دن مموں کا نصیب کھل جاتا۔ جھٹ اجلے کپڑے ٹیڑھی ٹوپی اور تیل پلایا زری کا جوتا پہن کر ایک ہاتھ میں بیڑی دوسری میں چھڑی داب کر پہنچ لیتا۔ ہر جملے میں سرکار، حضور، غریب پرور، آپ کا اقبال سلامت آپ کا دشمن روسیاہ وغیرہ کے پیوند لگاتا رہتا۔ اگر کوئی نام پوچھتا تو اکڑ کر کہتا لالہ امام بخش۔ تھانے کے منشی، تحصیل کے گرداور نہر کے پٹرول اس کی باتوں پر ریٹ جاتے۔ جہاں بھاری بھاری کاشتکار دم سادھے کھڑے رہتے وہاں مموں پلنگ پر چڑھتا اور دم پر دم بیڑی دھونکے جاتا۔ مسلمان اہلکار اس کا نام ہی سن کر ریجھ جاتے۔ رہے ہندو تو وہ بھی چکنے چپڑے ہاتھ پاؤں اجلا پہناوا اور توم تڑاق دیکھ کر کچھ نہ کچھ ملائم ہو ہی جاتے۔ پھر رموالپور گاؤں بھی اپنے علاقے میں نرالا تھا۔ زمین بھی معمولی تھی اور کاشتکاروں کے پاس تھی بھی تھوڑی تھوڑی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی کو روٹی دال کے چکر سے نکلنے کی فرصت بھی نہ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ مموں کو میدان صاف ملا۔

پھر ایک ڈگی بجی اور زمینداریاں پرانی چٹائیوں کیطرح لپیٹ کر کونے میں کھڑی کردی گئیں۔ مموں لالہ کی تیس بیگھے زمین بھی جس پر بھائی بندوں کی روٹی کا سہارا تھا جھگڑے میں پڑ گئی۔ دلارے امیر کے مرتے ہی رموالپور کی پردھانتا بھی خالی ہو گئی۔ گاؤں والوں نے مموں سے معاملے کی بات کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر وہ زمین سے ہاتھ دھوئے تو پردھان کی پگڑی سر پر باندھ دیں گے نہیں تو زمین کو گیا جانو اور پردھانی مرتے مرتے نصیب نہیں ہونے کی۔ کام کا چور اور بات کا راجہ مموں پہلے تو بہت اچھلا کودا پھر گردن ڈال دی۔ پردھانی نے اس کی زبان پر ایسی باڑھ رکھدی کہ کاٹے نہ کٹتی تھی۔

گاؤں میں جو کچھ بھی ہو لیکن باہر تو وہ رموالپور کا پردھان ہی تھا۔ اچھے اچھے مان

دان کرنے لگے اور وہ ہر گھڑی دو بوتل کے نشے میں رہنے لگا۔ تحصیل تھانہ اس کے ہاتھوں میں آیا دیکھ کر اکڑتے براتے جوان اور ٹھنڈے مضبوط بوڑھے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

ساون کا مہینہ اور چیت کی گروی فصل کا نشہ تھا۔ حافظے کے کچے کسان بھنوت کے وہ دن بھول چکے تھے جب دو وقت کھانے کے بجائے ایک وقت کی روٹی ملتی۔ بھرچنے میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ کوٹھیوں میں غلہ اور جیبوں میں پیسہ بھرا تھا۔ زمیندار کی بے گارتھی نہ اہلکار کی تو تکار۔ چھکے ہوئے جانور رسیاں تڑاتے تھے۔ چڑچڑے آدمی بربے گاتے اور ٹھٹھول کرتے تھے۔ کٹکھنی عورتیں لڑنے والی باتوں پر ٹھٹھے لگاتی تھیں۔ ہری پتاور کے جھولے اور کھنگھنیوں کے تحفے گھر گھر پڑے تھے لال لال چڑیوں کے لہریے اور پاجی گیتوں کے کالے سارے گاؤں میں لہراتے پھرتے تھے۔ آسمان پر کالے بادل دودھاری بھینسوں کے ریوڑ کی طرح چر رہے تھے۔ یہاں سے وہاں تک دھان کے کھیتوں کا فرش بچھا تھا جن میں نکائی کرتے پتھریلے جسموں اور موہنی صورتوں کے گلدستے لگے تھے۔ مموال اپنے ڈھنڈھار گھر کے سونے بر دمچے کے تخت پر ننانوے کے پھیر میں کھویا ہوا تھا۔ رموا پور کا بازار نیلام ہوا تھا۔ ٹھیکیدار چہارم کی رقم گنا گنایا تھا جس سے جیب چھنچھنا رہی تھی۔ وہ بھی گاؤں والوں کی طرح اپنے دلدر گھورے پر ڈال آیا تھا اور سکھ کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔ ابھی کل ہی جاج پور کا ناؤ سندیسہ لایا تھا کہ جاج پور کے لالہ ہر نرائن اسے اپنی بٹیا دینے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ ادھر تھوڑے دنوں سے اپنے ہاتھ کی سینکی روٹی کڑوانے لگی تھی۔ دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا لیکن بوندیوں کی تال پر ناچتی راتیں پہاڑ ہو جاتیں۔ گھڑیال کی طرح ننگی چارپائی منہ پھاڑے پڑی رہتی اور وہ خیالوں کے سدا بہار باغوں کے کنجوں میں بیٹھا گھٹنوں پر سر رکھے الم غلم سوچا کرتا پھر پاس پڑوس کے سنسنائے جھولوں سے برستے ہوسناک گیت اسے جھنجھوڑ ڈالتے اور وہ چاہنے لگتا کہ کسی ایسی کو بارہ کہاروں کی پالکی بٹھا کر لے آتا جس کے مہندی سے لال ہاتھوں میں لاکھ کی لال چوڑیاں گنگناتیں اور جوڑے کی مست خوشبو میں بسے ہوئے بدن پر سرخ چنری سرسراتی اور وہ خود کیسری جامے پر صافہ باندھے گھوڑے پر سوار کہاروں کی ہاق کے تال سم پر قدم قدم چلا آتا۔ یہاں تک آتے آتے اس کے کلیجے پر گھونسہ لگتا اور وہ خیال بانٹنے لگتا۔ اس حوالدار کے لیے ۱۰۹ کی شہادت ڈھونڈنے لگتا کہ اسی گھڑی کسی کے بیر بہوٹی ایسے پیروں کے کھنکتے جھنکتے بچھوے ڈنک مار کر چلے جاتے۔ اس کا منہ اکرانے لگتا۔ دل بھننے لگتا اور خالی مکان کاٹنے لگتا۔ اچانک ایک

آواز نے اسے ٹھوکا مار کر کھڑا کر دیا۔

چھنگنو چوکیدار خالی کوٹ پہنے پیٹی کندھے پر ڈالے لال صافہ لپیٹتا لاٹھی کڑ ھلاتا ننگے پاؤں دھم دھم بھاگتا چلا جارہا تھا۔ اس کا راستہ کاٹ کر جگنو پاسی نکلا اور ہانک لگائی۔

"گردھاری مہاراج مار ڈالے گئے"۔

ممواں کو جیسے برات کھانے کا نیوتہ مل گیا۔ اس نے جھٹ اشنان کر کے بالوں میں تیل چپڑ کر جوڑا پہنا۔ ٹوپی چپکائی اور بیڑی سلگاتا باہر نکلا۔ دوارے دو چار آدمی جمع ہو گئے تھے ایک آدمی ہانپنے لگا۔

"گردھاری مہاراج قرضہ بانٹنے گئے تھے کہ ابھی ابھی خون لتھڑا ہوا ٹٹو آیا اور کہار مچ گئی۔"

گردھاری مہاراج وہی تھے جنھوں نے پچھلے سال تالاب کی نیلامی میں ٹانگ اڑائی تھی اور ممواں کی بھانجی ماری تھی۔ اس پر تکرار بھی ہو گئی تھی۔ لاٹھیاں بھی نکل آئی تھیں لیکن بڑے بوڑھوں نے بیچ میں پڑ کر ممواں کی آبرو بچائی تھی۔ وہ ان سب کو لے کر گرام پنچایت کی پکی عمارت کی طرف چلا۔

رموا پور اور جاج پور کے بیچ یہ پہلا قتل تھا جو بیس برس میں ہوا تھا۔ اس کی ہیبت نے ممواں کو سن کر دیا تھا۔ گردھاری کی لاش کی بھیانک خیالی صورت اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ گردھاری کو کون قتل کر سکتا ہے۔ چار چار گاؤں کے ہیکڑ آدمیوں کی صورتیں اس کے سامنے سے گذرگئیں لیکن کسی پر دل نہ جما۔ اس کو یقین تھا کہ پولس والے سراغ رسی میں اس کا مشورہ مانگیں گے۔ وہ چاہتا تھا کہ مشتبہ آدمیوں کی فہرست اپنے ذہن میں رکھ لے لیکن ایک نام بھی نہ ملا۔ اس نے سوچا کہ اگر بہت دباؤ ڈالا گیا تو وہ ان لوگوں کو لکھوادے گا جن سے اس کی ان بن رہتی ہے۔ لیکن اب ممواں کو ضمیر نے جھنجھوڑ ڈالا۔ قتل کے جرم میں کسی بے گناہ کے پھنسنے کا مطلب جانتے ہو؟ ممواں لالہ! پھانسی یا عمر قید۔ ممواں کانپ اٹھا۔ پنچایت گھر میں بھیڑ لگی تھی۔ سب ایک ساتھ بول رہے تھے اور صرف اپنی آواز سن رہے تھے۔ ممواں لالہ کو دیکھ کر ذرا شور کم ہوا، بیڑیاں سلگانے کے بعد کسی شوخ لڑکے نے پوری آواز میں للکارا۔

"سال بھر نائیں بیتا اور ممواں لالہ نے اپنا چکتا وا کر لیا۔"

کسی نے ٹھٹھہ لگایا۔بہتوں نے سنگت کی اور مموا‌ں لالہ کا منہ دیکھا جو بند تھا آنکھیں کہیں اور تھیں ۔ایک دوسرے آدمی نے بات آگے بڑھائی ۔

" کاغذ کی ناؤ ہمیشہ تھوڑی چلت ہے .بھائی "

" کھبو گاڑی ناؤ پہ اور کھبو ناؤ گاڑی پہ -----۔وخت وخت کی بات ہے ۔"

مموا‌ں ٹس سے مس نہ ھوا۔

"اوں ہوں سوسنار کی ایک لہار کی ۔"

" کا سر جو کا کا تم کو بتانیے دیں ۔انڈیا بھر کی پولس بے آویں ۔مل لاس ناہیں ملت ۔"

"اور کالالہ امام بخش کچی گولی نہیں کھیلتے ہیں ۔"

"مموا‌ں لالہ خفانہ ہوئیں تو ہم بتانے دیں ۔"

اب پانی سر سے گذر چکا تھا ۔مموا‌ں لالہ نے بیڑی پھینک کر آنکھیں چمکائیں اور جیسے پوری سبھا جگمگا اٹھی ۔

"بتاؤ"

" گردھاری مہاراج کنیا کے جنگل میں کٹے پڑے ہیں ۔"

ایک دبلے پتلے لڑکے نے اس جملے کی بندوق داغ تو دی لیکن خود بھی اس دھماکے سے سمٹ کر رہ گیا ۔تھوڑی دیر کے لیے سب سناٹا کر رہ گئے ۔مموا‌ں چپکے سے ہنس دیا جیسے گرو کسی چیلے کی ایسی ویسی بات پر مسکرا دے ۔

"اور کریب (قریب) آئے جانی ؟"

وہی لڑکا ڈھٹائی سے بولا

"آنے جاؤ"

مموا‌ں اسی طرح سر نیچا کئے بولا۔

"آنیے جانی ؟"

اس نے چھان پھٹک کرتی آواز میں پوچھا

"اب آنے بھی چکو"

اور اس نے لال بھبھوکے لہجے میں تڑ سے کہا

تو پھر سن رکھو مموا‌ں لالہ گردھاری مہاراج دھندھاری کے پل کے نیچے لیٹے ہیں۔

مموں نے گردن جھکالی ۔ نئی بیڑی سلگا کر دھواں سینے پر چھوڑا ۔ گردن ہلائی کچھ کہنا چاہا کہ جاج پور کے آدمی آگئے بات آئی گئی ہو گئی ۔

سورج بیٹھتے بیٹھتے جاج پور میں پولس آگئی ۔ مموں لالہ پہلے ہی سے پہنچا ہوا تھا ۔ تھانیدار کی گھوڑی دیکھتے ہی پلنگ ڈلوانے اور قالین بچھوانے لگا ۔ حقے پانی کی فکر کر کے کھانے دانے کا بندوبست کرنے لگا ۔ جاج پور کا پردھان نچنت بیٹھا رہا ۔ بوڑھے گدھ کے مانند سیاہ رات جاج پور پر اتر آئی تھی ۔ سارا گاؤں پھٹی آنکھوں، لٹکے ہوئے لمبے چہروں اور بھینچے ہوئے ہونٹوں کا چلتا پھرتا قبرستان ہو کر رہ گیا تھا ۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کا ایک آدھ آدمی پولس کی پوچھ گچھ کے چکر میں نہ آگیا ہو ۔ بس ایک لالہ ہر نرائن تھے جو اپنا دروازہ بند کیے بیٹھے تھے اس لیے کہ ہونے والا داماد مموں لالہ پولس دھر پکڑ میں سپاہیوں سے زیادہ جوش دکھلا رہا تھا ۔ رات کے بارہ بجے کے قریب تھانیدار نے پونم کہار کو کھانا پروسنے کا حکم دیا ۔ وردی پہنے پہنے جب وہ کھانے پر بیٹھا تو ایک اور کھانا منگوالیا اور مموں لالہ کا کندھا پکڑ کر اپنے سامنے بیٹھالیا ۔ مموں نے اپنا یہ مرتبہ دیکھا تو تھوڑی دیر کے لئے کھوپڑی بھک سے اڑ گئی ۔ دورگیس کی مٹیالی روشنی میں لرزتے سائے اپنے پیاروں کی خیر خبر لینے آئے تھے ۔ مموں نے ان جاندار پرچھائیوں کو اپنی بڑائی بتانے کے لیے پوری آواز میں باتیں شروع کر دیں ۔ کھانا کھا کر تھانیدار نے مموں کو اپنی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر پکڑا دی ۔ مموں مٹھی میں دبا کر لمبے لمبے دم لینے لگا تھا ۔ بڑی دیر تک وہ تھانیدار کی شکر گذاری میں بیٹھا رہا ۔ جب جماہیاں آنے لگیں تو تھانیدار کی گردن اٹھنے کا انتظار کیا جو رجسٹر کھولے لکھتا جا رہا تھا ۔ آخر کار مموں پلنگ سے اٹھ پڑا ۔ نگاہ ملتے ہی اس نے سینے پر ہاتھ جوڑ لیے ۔ شین قاف سے درست اردو میں بولا ۔

"غریب پرور اب حکم دیجئے ۔ صبح سورج نکلتے حاضر ہو جاؤنگا ۔"

تھانیدار نے رجسٹر بند کیا ۔ سگریٹ جوتے سے مسلی دونوں ہاتھ کرسی پر ----- پھیلا کر زہریلے لہجے میں بولا ۔

"دھندھاری پل کے نیچے سے گردھاری کی لاش نکال لی گئی اس کو بھی دیکھتے جاؤ امام بخش !"

"کا غریب پرور"
وہ کچھ اور کہتا کہ پیچھے کھڑے حوالدار نے اس کے چکنے چپڑے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

— * —

دیوالی

پورب کا تمام آسمان گلابی روشنی میں جگمگا رہا تھا جیسے دیوالی کے چراغوں کی سیکڑوں چادریں ایک ساتھ لہلہا رہی ہوں۔ اس نے السا کر چٹائی سے اپنے آپ کو اٹھایا۔ چیتلے مٹیالے تکیے کے نیچے سے بجھی ہوئی بیڑی نکالی اور پاس ہی رکھی ہوئی مٹی کی نیائی میں دبی اپلے کی آگ سلگائی۔ جلدی جلدی دو دم لگانے۔ جیسے ہی وہ چڑچڑا کر بھڑ کی اس نے منہ سے تھوک دی اور دور سے آتی ہوئی آواز کو غور سے سننے کی کوشش کی جیسے رات میں چوکیدار قدموں کی چاپ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب وہ مالک کی آواز میں غصے سے بھنے ہوئے لفظوں کے پٹاخے سننے لگا۔

"میکوا"

"ابے میکوا کے بچے"

"کیا سانپ سونگھ گیا"

وہ مانگے کی جلدی میں ہڑبڑا کر اٹھا اور لال اینٹوں کے بنے ہوئے اس کمہار کیطرف چلا جو ہرے بھرے فارم کے بیچوں بیچ اکڑوں بیٹھا تھا جیسے دھان کے کھیت میں حفاظت کے لیے لکڑی کے پتلے پر چنری لپیٹ دی گئی ہو۔ دھارے کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتے ہی بالکل اس کے کان کے پاس پٹاخوں کی ایک لڑ اسطرح داغ گئی تو اس کے کانوں کی جلد بارود سے جھلس گئی۔

"اتنی دیر سے گہرانے جا رہے ہو۔۔۔۔۔ لیکن کانوں میں تیل ڈالے پڑے اینڈ رہے ہو۔۔۔۔۔ سنائی نہیں پڑتا بالکل۔ کہا تھا کہ آج دیوالی کے دن تو ذرا بھور ابہر سے اٹھ پڑتے اپنے آپ۔ یہ ساری صفائی ستھری کرنے تمہارا باپ آوے گا گنگاجی سے۔"

"مالک"

"مالک کے بچے۔۔۔۔۔ یہ بانس اٹھا۔۔۔۔۔ اس میں جھاڑو باندھ کے جالے چھڑا۔ مالک۔۔۔۔۔ بنو"۔

اس نے زمین پر لیٹے ہوئے ہرے ہرے بانس کی گانٹھوں کو نہارتے ہوئے اس کی پھننگ میں ایک پرانی سی جھاڑو پروئی اور سامنے کے کمرے میں گھس گیا۔ جالے جھاڑتے جھاڑتے سامنے کی دیوار کے بیچوں بیچ بڑے سے طاق میں سجی ہوئی لکشمی جی کی تصویر پر نگاہ پڑی تو اس نے جلدی سے بانس کاندھے سے لگا کر ہاتھ جوڑ لیے۔ جب آنکھ کھولی تو جیسے دیوار ایک طرف سے پھٹ گئی اور اس کی اپنی لکشمی اپنی پھمی لال لال دھوتی باندھے دونوں ہاتھوں میں تھالی سنبھالے گھونگھٹ میں چراغ جلانے کھڑی تھی۔ وہ وہ بڑی دیر تک اسی طرح پتھر کا بنا گھورتا رہا اور جب ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں رینگنے لگیں تو وہ جیسے جاگ پڑا۔ کاندھے سے بانس اٹھا کر وہ پھر مشین کیطرح شروع ہو گیا۔

ایک ایک کمرہ چندن ہو گیا۔ ایک ایک اینٹ اجلی ہو گئی۔ ایک ایک انگل زمین دیوا ستھان کیطرح جیسے پلکوں کی جھاڑو سے جھاڑ دی گئی۔ اور وہ جب ٹیوب ویل کے پاس سے گذرا تو اس کا جی چاہا کہ لمبے چوڑے حوض میں گرتی ہوئی پانی کی موٹی سی دھار کے نیچے اپنے آپ کو ڈال دے اور تھوڑی دیر چپ چاپ سادھے پڑا رہے۔

لیکن مالک؟

اور وہ اپنی ناک سے جالوں کے بال جھاڑتا ہوا ٹیوب ویل کے انجن کیطرف چلا اور اس کے پہیوں پر جمے ہوئے مٹی لوندے چھڑانے لگا اور جب آٹا پیسنے والے اور دھان کوٹنے والے انجن تک نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر کھڑے ہو گئے اور تھکن اس کی ہڈیوں کے گودے میں سرسرانے لگی تو اس نے باہر نکل کر آسمان کو دیکھا جو دکھوں کے گٹھر باندھ باندھ کر دکھیوں کی کھوپڑیوں پر لادا کرتا ہے۔ نگاہ زمیں پر اتری تو اپنی لمبی سی پرچھائیں پر ٹھٹھک گئی۔ شام کا سنہرا رتھ آسمان کے پچھم کی روسے گذر رہا تھا۔ وہ وہیں اسی جگہ دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا اور مالک کے طاق میں رکھے کھلے بنڈل سے چرائی ہوئی دوسری بیڑی سلگانے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا تو چتنی مہیتا نظر آئے۔

"پائیں لا گن مہاراج"

"تم کا آشیر واد دینی یا شراپ۔ رہو تم کشل منگل۔"

چتنی مہیتا کے ہونٹوں پر چھائی ہوئی مونچھوں کی چھپریا سے بول اس طرح ابل پڑے جیسے اولتی سے پانی برستا ہے۔ مہیتا نے اپنے کرتے کی پتلی پتلی آستین کہنیوں پر الٹ لیں اور ہاتھوں کے بالوں کے کھچڑی کے چاول گلابی دھوپ میں دمک اٹھے۔

"بیڑی سے چھنکارا پاؤ تو ہماری بات بھی سن لیو۔"
"دھنیہ ہو مہاراج ۔۔۔۔۔ اسیر سے سانجھ ہونے رہی ہے بھٹکی۔ بھر گز کے علاوہ ایک کھیل تنک اڑ کے پیٹ میں نا ئیں گئی۔"
بیل بدھیا تنک سویرے سے جوتے جاتے ہیں تو دوپہر ہوتے ہوتے کھول دیے جاتے ہیں۔ دانہ کھلی اگر نہیں ملتا ہے تو گھنٹہ دو گھنٹہ چارا بھونسہ کھاتے ہیں۔ ہم کے سستاتے تب سانجھ کو گھڑی دو گھڑی کے لیے جوتے جاتے ہیں اور ایک ہم ہیں وہی ہم سے اچھے۔
"کون سے نیتا کا بھاشن سنے رہے۔ جہان ہے کہ بالکل طوفان میل۔ ٹیسن پہ ٹیسن چھوڑتی چلتی جانے رہی ہے۔ ایں۔"
"تیج تیوہار کیا کوئی روج روج آتے ہیں پھر پکی خوراک اور مٹھائی اور پرسادائی سب کا پیڑن مان لگت ہیں کہ توڑ توڑ تھارے منہ میں ڈال دیں جائیں۔"
"تو اب ساتھ ہی ساتھ مہاراج لمو بانچ دیو کا حکم ہے۔
حکم دے دائے تو گئے ہیں سیر کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ ہم سے بتانے کہہ گئے ہیں کہ ان کے لوٹنے تنک سب کام کاج فٹ کر کے چھوڑیں۔ تو بھین جلدی سے سیڑھی لگاؤ۔ دیا بتی ہم سب تیار کرانے لیا ہے تم رکھنا شروع کرو۔
"پار سال تو مہاراج یو کام سورج ڈوبتے ڈوبتے ہوار ہے۔"
"او ہوں۔ پار سال آدمی تو رہین درجن بھر۔"
"تو آج اوئی سب آدمی کہاں کھونے گئے۔"
"کھونے کہاں جاتے۔ ہیں سب اپنی اپنی جگہ۔ مل ان کی مجدوری ہونے گئی ہے دگنی۔"
"اور مالک کا آؤ بکا ہے ادھیا پہ۔"
"سوبوری دیوالی دکھیامیکو کے متھے بہت گئی۔"
دکھیا میکو ہوویں چاہے مکھیا میکو اپنی کتھا انھانے رکھیں۔ کونوں اور دن کے لیے اور بھرتی سے سیڑھی لگانے لیں
چتنی مہیتا نے پیٹھ گھمائی اور اوسارے کیطرف چلے۔ جہاں بھاری بھاری نہائی دھوئی بھیسیں اجلی اجلی گھنٹیاں پہنے پتلی پتلی مونچھوں سے موٹی موٹی مکھیاں اڑا رہی تھیں۔

وہ تھوڑی دیر اکڑوں بیٹھا رہا۔ پھر اپنے پورے بدن پر ایک نگاہ ڈالی جیسے پہلوان اکھاڑے میں اترنے سے پہلے اپنے اوپر نرم نرم تازی مٹی ڈالتے ہیں اور جب گڑھ جیت کر وہ سیڑھی سے اترا اور چتنی مہاراج نے چمرودھے جوتے سے پاؤں نکال کر ڈنڈے پر رکھا۔ اس وقت تک سانجھ جیسے ایکا ایکی جوان ہو چکی تھی۔ وہ اپنی پنڈلیوں پر اپنا آپ گھسیٹتا ہوا حوض پر آیا اور بلا کچھ سوچے سمجھے جھم سے پھاند پڑا۔ بیساکھی کی دھوپ میں تھکن سے بلبلاتے ہوئے بھینسے کیطرح گردن ڈالے دم سادھے دیر تک کھڑا رہا اور منڈیروں پر جلتے ہوئے دیوں کی تھرتھراتی ہوئی لوؤں کا تماشہ دیکھتا رہا۔ جادو کی سی روشنی کا یہ تماشا دیکھتے دیکھتے اسے اپنی چھاتی میں ہونکتے ہوئے سنسان اندھیرے کا سراغ مل گیا جہاں دور دور تک وہاں تک جہاں نگاہ پہنچ سکتی ہے کوئی چراغ نہ تھا، کوئی جگنو نہ تھا کوئی چنگاری نہ تھی۔ اگر کچھ تھا تو ایک عورت کے چہرے کی مسکان تھی جس کی گرمی جیسے دل کی دھڑکن ابھی زندہ تھی۔ سلگتے ہوئے اپلے کیطرح بھر بھری راکھ میں دبی ہوئی مدھم سی آگ تھی جو زیادہ سے زیادہ سینے کی دھونکنی کے سہارے ایک بیڑی سلگا سکتی تھی اور کچھ بھی نہیں۔

"مکھیا میکو"

"چتنی مہاراج کی آواز کا جوتا بھڑ سے اس کے کان پر پڑا۔"

"نہانے چلکن مہاراج"

وہ چھپر چھپر کرتا باہر نکلا اور اس کی کوٹھری کیطرف چلا جس کے ایک دروازے اور ساڑھے تین دیواروں پر ٹین کی پتلی سی چھت بہت سی اینٹوں کے نیچے کچلی ہوئی رکھی تھی۔ کونے میں دھرے گھڑے سے اپنی اکلوتی قمیض اور دھوتی جو تیوہاروں پر دھروہر کیطرح نکلتی نکالی اور بھیگے انگوچھے سے ٹمنوں کے بنے بالوں سے ٹپکتے پانی کو پونچھنے لگا پھر سج بن کر نکلا۔ پورا کمہار پوجا کی تھالی کیطرح چراغوں سے جگمگا رہا تھا اور مالک کا بڑا لڑکا ایک نوکر کے ساتھ بھینسوں کے پاس کھڑا مہتاب چھڑا رہا تھا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے پاؤں اٹھایا تو معلوم ہوا کہ پاؤں اس کا اپنا پاؤں نہیں ہے کسی نے جان چھڑانے کے لیے منگنی میں دے دیا ہے۔ وہ ذرا سا جھول گیا پھر سنبھل کر دالان میں آرام کرسی پر ڈھیر مالک کے سامنے آیا۔ اس نے جھک کر پاؤں چھو لیے۔ پھر ایک کہار اندر سے آیا اور ایک بڑا سا پتل اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ پوریوں اور کچوریوں کی ڈھیریوں کے بیچ میں تھوڑی سی مٹھائی نگینوں کیطرح رکھی تھی وہ اسے لے کر اپنی

کوٹھری کیطرف چلا کہ چتنی مہاراج کی آواز نے بریک لگا دیا۔
"پرساد تو لیتے جاؤ میکو مکھیا"
اس نے جھک کر ایک دھوتی میں لپٹے ہوئے سارے سموچے مہاراج کو دیکھا اور ڈھاک کے تازہ ملائم پتل کی چھوٹی سی پڑیار کھ لی۔ کوٹھری کا اندھیرا سینکڑوں چراغوں کی لہر میں لپٹی روشنی میں ذرا مدھم ہو گیا تھا۔ اس مدھم روشنی میں اس نے ایک پوری میں ترکاری لپیٹ کر منہ میں رکھی تو اس کے ذائقے سے کوٹھری میں دیوالی کے کئی چراغ چمک اٹھے۔ اس نے دو پوریوں کے ساتھ پوری مٹھائی اور پرساد کا دونا بنالیا اور ایک پتل ڈھک کر سینکوں سے سی لیا اور جو کچھ بچا اسے اپنے پیٹ میں انڈیل لیا اور لوٹا بھر پانی پی کر بیڑی ڈھونڈنے لگا کہ باہر سے ایک آواز اس کے پاس آئی اور گردن پکڑ کر لے گئی۔ مالک حکم دے رہے تھے۔
"آج رات ذرا احتیاط سے سونا ہاں"
اور ساتھ ہی مالکن نے ایک بول کا پرساد دیا۔
"اگر بھوکا رہ گیا ہے تو کہار سے دال بھات مانگ لے اچھا۔"
اس نے نگاہ بھر کر مالکن کو دیکھا جو کپڑوں اور گہنوں میں بنی سنوری دیوی کی مدرا میں کھڑی تھیں اور پھر کبھی ایسا ہوا کہ جہاں دیوی کھڑی تھی اسی جگہ اسی مدرا میں اس کی پتھمی آ کھڑی ہوگئی اور اس کا جی چاہا کہ عبیر اور چندن اور گلابی کو اس ڈھیر کو اپنے آپ میں سمیٹ لے لیکن دوار سے جیپ کا انجن بھینس کیطرح ڈکرا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں گڑو گڑو کر ہر طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ لکڑی کے پیروں پر گھسٹتا ہوا دالان میں پہنچا۔ مالک کی کرسی کے نیچے سگریٹ کا بڑا سا ٹرا پڑا تھا۔ ایک چراغ سے سلگا کر ایک دم لگایا تو جیسے جی ہلکا ہو گیا۔ دکھ کی تمام چڑیاں اڑ گئیں۔ وہ وہیں کھمبے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اس کا بازو پکڑے چتنی مہاراج کھڑے تھے۔
"کا سونے گوارے"
"نائیں تو۔ آپ بیٹھ جاؤ۔ ایک بات ہے۔"
"آج ہم کا چار گھنٹے کی چھٹی دے دو آپ۔ گھنٹہ بھر جانے کا گھنٹہ بھر آنے۔ او دو گھنٹے درسن کا اور پھر گھڑی دیکھ لیو۔"
"کہاں جاوے گا رے؟"

"سیتاپور"

"بھانگ کھانے گوا ہے۔ سیتاپور کونی یہاں دھرا ہے۔ دس کوس ڈاٹ کے ہے

"ہوا کرے۔ تمری سائیکل پہ دس کوس ہمین میکوا کے لئے گھنٹہ بھر کی ہے۔"

تیل باتی کا انتظام

دیکھو مہاراج ای منگل کا چار مہینہ ہونے در سن کا۔

چتنی مہاراج نے اپنی گردن کندھوں سے آگے نکال دی

"اور مالک؟"

"اب مالک تم ہو ہمرے اور ہم ہیں دکھیا۔" اور اس نے مہاراج کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔

"آج چھٹی دے دیو پھر جون حکم دینا پورا ہوئی۔"

بوے تو سانچ ہے مل آج کی رات آدمی کون ملی۔ آج کی رات چور چکار اپنا گن جگاتے ہیں اور جیسے بنے ویسے کر لیو مل۔

تو اگر تم تیار ہو تو دس پانچ روپیہ کھرچ کر کے کوئی بندوبست کریں۔

"دس پانچ روپیہ"

ناہیں بھائی۔ تم جب گیہوں بووا جانے تو رات میں ہل چلانے دیو دو چار داؤ۔ اس نے سیدھی انگلی سے دو چار لکیریں بنائیں اور حکمی آواز میں بولا۔

منظور مہاراج ہم چار راتیں چلاوے پر تیار۔ پکی بات ہے۔

ایک بات اور

وہو بول دیو

مالک کا پتہ نہ چلے نہیں تو......

کانوں کان پتہ نہ چلی کوئی کا

تو پھر منظور۔ اٹھو اور ایک داؤں دیا پتی کا دیکھ لیو۔ جانے کے لئے وہ اس طرح اٹھا جیسے ابھی ابھی جیل کا پھاٹک کھلا ہے۔

بارہ بجنے میں دیر تھی لیکن وہ چتنی مہاراج کی سائیکل بغل میں مار کر اوکھ کے سانے سانے چراغوں کی اندھرائی آنکھوں سے راستہ ٹٹولتا نہر کی پٹری پہ آ گیا اور پچھمی کا دھیان کر کے سائیکل پہ سوار ہو کر پیڈل اونٹنے لگا۔ جب تھکن چڑھنے لگتی تو وہ دیکھتا کہ پچھمی

دوارے سے آرتی لئے چراغ جلائے، پھول مٹھائی اور پان لیے اس کی راہ دیکھ رہی ہے اور پھر جیسے اس کی بیڑی چارج ہو جاتی۔ لیکن جب سائیکل کے اگلے پہیے نے پھمی کے دوارے سے ٹکر ماری تو پھمی کے بجائے ویرانی اندھیرے کی آرتی میں تنہائی کا چراغ جلائے اس کے سواگت میں کھڑی تھی۔ اس نے دوبارہ ہاتھ سے دستک دی۔ پھمی کی ماں کی کھانستی آواز نے کون کون کی رٹ لگا دی۔ دروازہ کھلا تو اس نے اپنی چندھی آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا لیکن وہ اسے راستے سے ہٹاتا ہوا سائیکل سمیت گھر میں داخل ہو گیا۔

"پھمی کہاں ہے دائی؟"

او پھمی کی ماں نے پھونک مار کر اس کے بدن کے تمام جلتے چراغ بجھا دیے۔

وا تو بڑی دیر کی گئی ہے تمرے گاؤں

"ہمرے گاؤں"

ہاں آج سبیرے سے انتظام کر رہی تھی۔ دوپہر میں روٹی کھانے بھی نہیں آئی۔ سانجھ کو جب آئی تو رونے لگی کہ مالک چھٹی نائن دے رہے ہیں ہم سے رونا نائن دیکھا گیا تو؟ ہم نے بھیلی سے کہارات کی خدمت پر تم چلی جاؤ۔

"بھیلی"

"ہاں"

بھیلی جانے پر تیار نائن رہے کا ہے سے کہ او کا گونا آنے والا ہے مل ہم بڑی کھوسامد کیا۔ تب رووت دھووت وا گئی او پھمی منہ جھٹال کی ساری پوری مٹھائی باندھ کے۔

وہ دھپ سے اسی جگہ بیٹھ گیا۔ گردن سے انگوچھا اتار کر دونا کھولنے لگا تو معلوم ہوا مانو اس کی انگلیاں جھڑ گئی ہیں۔ پاؤں گر گئے ہیں اور کندھوں پر کاٹھ کی ہنڈیا رکھی ہے ہے۔ اس نے لکڑی کی زبان کو بڑی محنت سے ہلایا۔ بھیلی کے سسرال والے اگر جان گئے تو؟ بند ہوا مزدور کی لڑکی کے پاس بیٹا چھپانے کو ہوت کا ہے جو چرانے چھپانے کی فکر کی جائے

اور جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے پھمی دیواستھان سے گری اور لڑھکتی ہوئی گھورے میں ڈھیر ہو گئی۔

کتابیں

آسمان سے آنسو برس رہے تھے ۔ برآمدے کے ٹین پر مدھم مدھم گھنگھرو بج رہے تھے جیسے ذہن کی گولک میں یادوں کے پیسے جھنجھنا رہے ہوں ۔ بڑے لال ریشم کے پھولوں والا غلاف پہنے تکیہ دیوار سے لگا تھا ۔ جس پر اس کی چوڑی چکلی گداز پیٹھ رکھی تھی ۔ تین دروازوں والے کمرے میں دوسرے پلنگ پر اداس بستر پڑا تھا ۔ لالٹین کی لال روشنی میں نئی قلمی کا تازہ کفن پہنے سامنے کی دیوار کھڑی تھی ۔اور اس اجلے پردے پر نیم عریاں رقص کو پلک جھپکانے بغیر نگل لینا چاہتی ہیں ۔ ایک ایک جنبش سے لذت کے ایک ایک قطرے کو نچوڑ کر پی لینا چاہتی ہیں ۔

اس کے شوہر کا چوتھا فاتحہ تھا ۔ مہمان عورتیں ابھی دستر خوان پر بھنک رہی تھیں کہ بھائی جان آگئے ۔ اس کے سفید دوپٹے سے ڈھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے ۔" یہ جو باہری کمرہ ہے اسے پندرہ روپے ماہوار پر میں نے اٹھا دیا ہے وہ میرے اسکول میں ماسٹر ہے ۔ نیک اور شریف آدمی ہے ۔

"اس بلی کو بھی کمبخت ۔یہی گھر ملا ہے رونے کو"

کیسا شفیق اور گرم لمس تھا ان کے ہاتھ کا پھر اس دن دستک ہوئی ۔ اس نے رشو کو بھی اپنے ساتھ چھپا لیا اور کمرے کی چلمن سے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا سانولا سلونا لڑکا سا آدمی بڑے پانجامہ اور تنزیب کا خالی کرتا پہنے اندر آیا ۔ آنکھیں نیچی کیے صحن سے گذر کر غسل خانے میں چلا گیا ۔ پھر ایک دن بھائی جان کی سفارش کے ساتھ اس نے پچیس روپے بھجوانے اور دونوں وقت کھانا کھانے لگا ۔ کھانا لے کر وہ خود جاتی اور بڑھا کر پکڑا دیتی اور اپنا آپ چھپائے رکھنے کی فکر میں دال سالن کا پیالہ چھلکا دیتی ۔

اور اس دن تو جیسے گردن تک. بھری ہوئی پتیلی الٹ گئی ۔ ایسی ہوئی دوپہر تھی
وہ دن چڑھے تک چولھا بناتی رہی تھی اور جب دن ہاتھ سے نکلنے لگا تب وہ جلدی جلدی پکانے
بیٹھی ۔ پہلی روٹی توے پر گئی تھی کہ اس نے دروازے پر دستک دی اور وہ سمجھی کہ رشو
کے اسکول کی مہرن چوری کی ترکاری بیچنے لائی ہے ۔ کچی پکی روٹی توے سے اتار کر وہ
جھپاک سے دروازے پر پہنچی اور دروازہ کھول دیا ۔ سامنے ماسٹر صاحب کھڑے تھے ۔ ایک
فٹ کے فاصلے پر دونوں ایکدوسرے کو تکتے رہ گئے ۔ پھر اس نے سنا "میں اپنے ------
کمرے کی کنجی کہیں. بھول آیا ہوں -----------

جب ہوش آیا تو وہ باورچی خانے میں کھڑی ہانپ رہی تھی ۔ اپنا جائزہ لیا تو شرم
سے نڈھال ہوگئی ۔ وہ آدھی تو رشو کی قمیص جمپر میں بندھی ہوئی تھی اور آدھی رشو کی شلوار
میں پھنسی ہوئی تھی ۔ اس نے الگنی سے دوپٹہ اتارا اور داؤنی کیطرح اوڑھ لیا ۔ پھر کھانا پک
گیا ۔ لیکن ماسٹر صاحب کے لئے نکال کر بے جانے کی ہمت نہ ہوئی وہ رشو کا انتظار کرتی رہی

اللّٰہ ماسٹر صاحب اسکول سے ایک آدھ کتاب لادیجئے ---۔ آخر بے کار بیٹھی رہتی
ہوں دن بھر "دیکھا اور لجاجت سے حامی بھر لی ۔ اور بڑی دیر تک وہ اپنی جگہ پر بیٹھی بولتی
رہی ۔ ماسٹر صاحب کی نگاہوں کی گتھی سلجھاتی رہی ۔ رشتے کی بہنوں. بھائیوں اور رازدار
پڑوسیوں سے سنی ہوئی کتنی ہی چٹ پٹی کہانیاں مردانے کپڑے پہن کر بانکی سجیلی چھیڑ
چھاڑ کرنے لگیں ۔ اور وہ ایک انجانی ذہنی لذت سے گلے گلے تک ڈوب گئی ۔

میرے خیال میں تو دس بج گیا ہوگا ۔ ابھی تک تو کوئی نہیں آیا ۔ پانی بھی تو
کمبخت دم نہیں لیتا ہے ۔ اور اس دن جب وہ کھانا لے کر گئی تو ماسٹر صاحب نے گذشتہ
دنوں کیطرح ایک ہاتھ سے سینی تھام لی اور دوسرے ہاتھ سے کتاب پکڑادی ۔ اور وہ باورچی
خانے ہی میں عادتاً ورق الٹنے لگی اور لفظ لفظ سے ٹپکتا ہوا نشہ اس کے بدن پر چڑھنے لگا ۔
جب رشو نے کنڈی بجائی تو وہ چونکی ۔ ہائے اللّٰہ ظہر کا وقت ہوگیا ۔ کھانا کھا کر وہ چولہے
کے پاس سے کتاب اٹھالائی اور اپنے تکیے کے غلاف گھسیڑ دی ۔ رشو دیکھ لے گی تو کیا کہے گی
جوان جہاں لڑکیوں سے ایسی کتابیں ------

لالٹین پھنکنے لگی اس نے دیوار سے اتار کر آڑ میں رکھ دی اور چادر شانوں تک
گھسیٹ لی ۔

اس رات ایسی کسل مندی رہی کہ عشاء کی نماز کھینچنا دو بھر ہوگیا ۔ ہزارہ تسبیح کو

جانماز میں لپیٹ کر وہ چوکی سے اتر آئی ۔ رشو اپنے تنے ہوئے چادرے میں چھپی ہوئی سو رہی تھی ۔ وہ لالٹین پر جھک کر پڑھنے لگی ۔ ایک ایک ورق ایک ایک سطر اور ایک ایک فقرے کو نچوڑ کر پینے لگی ۔ کتاب ختم ہوئی اور جیسے رشو کے ابا اپنے پلنگ سے سانپ کیطرح اٹھ کر اس کے پلنگ پر آ گئے اور کان کی لو منہ میں لے لی پھر بولے ۔

"سدو تم نے تو صدیوں کی بنی بنائی کہاوت جھٹلا دی"

"کیا"

"مرد ساٹھا پاٹھا ----- عورت بیسی کھیسی"

"سولہ برس ہو گئے بیاہ کو ----- میں تو جیسے بھول گیا بالوں پر راکھ جم گئی ۔ دانت ہلنے لگے آنکھوں پر عینک چڑھ گئی ۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے چکر آنے لگتے ہیں لیکن تم اللہ کی قسم اسی طرح کوری چارپائی کیطرح کسی ہوئی ہو ۔ رشو تو تمہاری چھوٹی بہن معلوم ہوتی ہے ۔ بس اگر تم تمباکو نہ کھاتی ہوتیں اور کالی کالی تختیں نہ پڑتیں اور لچکے گوٹے کے کپڑے پہن کر بیٹھ جاتیں تو معلوم ہوتا کہ ابھی ڈولی سے اتری ہو ۔"

اور جب ان کی حالت خراب ہوئی تو کیسی حسرت سے ہاتھ مل کر کہا تھا ۔

سدو میں تو جا رہا ہوں ۔ رشو کے بیاہ کا تنکا تنکا جمع کر کے رکھ دیا ہے ۔ اللہ بھائی جان کو زندہ رکھے کسی کھاتے پیتے لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دیں گے ۔ لیکن تمہارا ----- تمہارا کیا ہو گا سدو ؟ تم بیٹھنا بھی چاہو گی تو یہ بدن تمہیں بیٹھنے نہ دے گا ۔ اس کو دیکھنے والے تم کو بیٹھنے نہ دیں گے ۔

اور اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے آنکھیں بند کر لیں جیسے کوئی برمے سے سر میں سوراخ کئے دے رہا ہو پھر ہوا کا ایک تند جھونکا آیا اور دروازہ دھڑاک سے کھل گیا ۔ دیوار پر لٹکی ہوئی شیروانی پھڑ پھڑا رہی تھی جیسے وہ اپنے خیالوں کی مٹھی میں تڑپ رہی ہو ۔

اور اس وقت جب ماسٹر صاحب کا کھانا لے کر گئی تو کسی نہ کسی طرح اگل دیا ۔

"ماسٹر صاحب ویسی کتابیں لائیے جیسی پہلے لائے تھے ۔"

ماسٹر صاحب نے پھر مسکرا کر دیکھا اور وہ دوہری ہو گئی ۔ جب وہ مڑنے لگی تو ماسٹر صاحب نے تقریباً کمرے سے نکل کر اس کی گود میں رکھ دی اور وہ اپنے بوجھ سے لچکتی ہوئی چلی آئی اور دھڑام سے پلنگ پر گر کر صفحے الٹنے لگی تصویریں ۔ مردوں اور عورتوں کی تصویریں ۔ تصویریں ہی تصویریں ۔

اس نے جلدی سے کتاب بند کی اپنے ہی گھر کا چوروں کیطرح جائزہ لیا۔ ماسٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ باہرکواڑ پہ زنجیر لگی تھی۔ آنگن میں دھوپ اور کمرے میں سناٹے کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اس نے مطمئن ھو کرکتاب کھولی۔ دیکھتی رہی پڑھتی رہی اور مدھوش ہوتی گئی رشو آ گئی تو اس نے کتاب تکیے میں رکھ دی۔ نل سے پانی بھرا اور نہانے چلی گئی۔ ظہر کی نماز بڑے خلوص قلب سے پڑھی۔ دیر تک وظائف کا ورد کرتی رہی۔ پھر بھائی جان آگئے۔ جب رشو چائے بنانے باورچی خانے میں چلی گئی تو انھوں نے سر گوشی میں پوچھا۔

"یہ ماسٹر صاحب کیسے ہیں"

اس کا دل اچک کر حلق میں آ گیا۔ کتاب لوہے کے بانٹ کیطرح تکیے سے نکلی اور اس کے سر پہ گر پڑی۔

" جانے بوجھے گھر کا لڑکا ہے۔ میں نے نوکری دلادی ہے بے چارہ دبا ھوا ہے جانتا ہے کہ مستقلی میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے رشو کے ہی خیال سے اس میں دلچسپی ہے۔"

بھائی جان چلے گئے۔ مغرب کی اذان ھو گئی۔ ماسٹر صاحب نے کھانے کے برتن دے کر دروازہ بند کر لیا۔ رشو عشاء کی نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی لیکن وہ سمجھ نہ پائی جیسے پیچ میں پڑی ہوئی پتنگ کی ڈور الجھ جائے۔ ساری رات وہ آنکھیں کھولے خواب دیکھتی رہی۔ تعبیریں بنتی رہی اور کھولتی رہی اور صبح کے ابھی فجر کا اول وقت رشو نے بھرپور انگڑائی لی کسمسا کر انھی کلمہ پڑھتی اور چپل گھسیٹتی نل کے پاس چلی گئی۔ صحت خانہ بند ہونیکی آواز پہ اس کی نگاہ رشو کے تکیے پہ پڑی اور اچھل گئی۔ اس نے لپک کر تکیہ اٹھا لیا۔ غلاف میں ہاتھ ڈالا تو وہی کتاب جسے پڑھکر وہ بدحواس ھو گئی تھی اس کے سامنے تھی۔ صفحوں کے کونوں پہ اس کی انگلیوں کے نشان زندہ تھے اور پھر ایک خط نکل پڑا۔ اس نے لرز کر وہ خط اپنے گریبان میں اڑس لیا اور کتاب تکیے میں رکھ دی۔ جب رشو اسکول چلی گئی تو اس نے وہ خط پڑھا۔

"چاند"

"تم بلاوجہ ڈر کر چلی گئیں تمھاری امی جب سوتی ہیں کروٹ تک نہیں بدلتیں۔ کل رات جب تم آؤ گی تو میں تم کو بہت عمدہ کتاب دونگا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا

ھو گااور میں اندر ہی لیٹونگا۔"

اور وہ سر پکڑ کر پلنگ پر دھم سے گر پڑی اور زند گی سانپ کیطرح پھن کاڑھکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس نے دیکھا کہ گلابی جاڑے آگئے ہیں اور آنگن میں خوشگوار دھوپ کی چاندنی پر تولی فرش بچھانے اور رشو کے کپڑے قطع کئے جارہے ہیں ۔تین کے دالان میں ڈھولک رکھی ہے اور گیت گائے جارہے ہیں اور لیل پردے کے پیچھے رشومایوں بیٹھی ھے اور باورچی خانے سے تازے گلگلوں کی مہک آرہی تھی اور خود اس کے پیروں میں پہیے لگے ہوئے تھے ۔ پھر اسی نے اس تصویر کو آنکھوں سے نوچ کر پھینک دیااور دیکھا کہ ماسٹر صاحب آگئے ہیں ۔شیروانی اتار کرکھونٹی پر ٹانگ دی اور لوٹا لئے کھڑی منہ دھلارہی ھے پھر ماسٹر صاحب اس کے کرتے کے دامن سے منہ پونچھ رہے ہیں اور دامن چھوڑتے چھوڑتے چٹکی بھر لی ہے اور وہ سی کر کے دوہری ہو گئی ہے اور ماسٹر صاحب کی بانہوں میں پھڑ پھڑانے لگی ھے کہ اسی وقت کسی طرح سے بھائی جان آگئے ہیں ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رھے ہیں ۔انھوں نے حقارت سے زمین پر تھوک دیااور پاؤں پٹختے باہر چلے گئے پھر باہری دروازہ ایک برقعہ پوش عورت سے بھر گیااس نے نقاب الٹ کر ناک پر انگلی رکھی اور ڈنک مارا۔

"جیتی رہو۔۔۔۔۔لڑکی کے خون سے رنگاھوا سہاگ سلامت رھے"

اور پھر رشو حمام سے نکلی اورصحن میں کھڑی ہو کر بھیگے بال سلجھانے لگی تو اس نے جھڑک کر کہا

"اے رشو۔۔۔۔۔۔۔۔۔اندر جا کر بال بناؤ"

اور رشو نےنفرت سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ھومیں تمہاری بیٹی ضرور ھوں لیکن تم جیسی نہیں ھوں اسی وقت ایک طرف سے رشو کے باپ کراہتے ہوئے نکلے اور دانت پیس کر کرجے ۔

"ڈائن مجھے کھا کر بھی تیرا کلیجہ ٹھنڈانہ ھواجو میری یتیم بچی کو چبا گئی"

اس نے کانپ کر کروٹ بدلی اوراب

رشومہندی لگی انگلیوں سے سرخ برقعے کے بند باندھ رہی تھی ۔ماسٹر صاحب ایک بچے کی انگلی پکڑے کھڑے تھے ۔ سامان رکشے پر رکھا جاچکا تھا۔ پھر اس نے رکشے پر سوار ہوئی رشو کو گلے لگایا۔ جھولی بھر کر دعائیں دیں اور ماسٹر صاحب کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر

رخصت کیا اور جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو اکیلے ڈھنڈھار گھر کے ہولناک ویرانے میں پڑی رہی ۔ چاروں طرف تنہائی کی چڑیلیں ناچ رہی تھیں ۔سکوت کے بھوت قہقہے لگا رہے تھے اور وہ دن دہاڑے خوف سے چلا چلا کر لوگوں کو پکار رہی تھی ۔لیکن کسی آواز نے اس کی ڈھارس نہ بندھائی اس کی دلداری نہ کی ۔ وہ اسی طرح چیختی چلاتی رہی اور وہ بوڑھی ہوگئی ۔ اس کے بال سفید ہو گئے ۔جسم پھوس کی گھڑی بن کر رہ گیا اور رشو بولی کیطرح اپنے پتوں میں الجھ کر رہ گئی ۔ اور وہ کمرے کے چھونے سے کرانے کا گز لئے تیس دن کے لمبے بھوکے فاصلے کو ناپتی رہی ۔ تھک کر گر پڑی بھوک سے بلبلا کر رو دیتی اور موت کی رحمت کی دعائیں مانگتی رہتی ۔

اس روز وہ کوئی کام نہ کر سکی ۔ کھچڑی چڑھا کر کھٹولے پہ پڑ رہی ۔ رشو کے لئے دروازہ کھولا گردن نکال کر دیکھا اسکول کی مہرن جارہی تھی اس نے پکار لیا رشو کمرے میں کھڑی برقعہ اتار رہی تھی مہرن سے کہہ رہی تھی ۔

"مہرن ----- تم ذرا مغرب کے بعد آجانا"

تیسرے پہر جب رشو نہا کر نکلی تو وہ بھی گھس گئی ۔ پانی کی ٹھنڈی دھار سر پہ گری تو معلوم ہوا دماغ کی تنی ہوئی رسیاں ڈھیلی ہو گئیں وہ دیر تک بیٹھی ہوئی گھڑے انڈیلتی رہی لیکن بدن میں کھولتا ہوا لاوا ٹھنڈا نہ ہوا بلکہ اور کھولنے لگا ۔

وہ ماسٹر صاحب کو کھانا کھلا کر باورچی خانہ بند کر رہی تھی کہ مہرن آگئی ۔اس نے مہرن سے کہا کہ ذرا ماسٹر صاحب کے پاس سے دیا سلائی لادے ۔اس نے آکر جواب دیا کہ ماسٹر صاحب کا کمرہ بند ہے پھر اس نے اطمینان سے رشو کو پکارا اور حکم دیا کہ تم اپنا برقعہ پہنو اور بھائی جان کے یہاں چلی جاؤ انھوں نے تم کو بلایا ہے کل اتوار ہے پرسوں صبح آجانا ۔ رشو نے آنکھیں جھکا کر یہ حکم سنا اور مرتے مرتے قدموں سے کمرے میں برقعہ پہننے چلی گئی ۔ مہرن کے ساتھ رشو کے باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ بند کیا ۔ ماسٹر صاحب کے کمرے کے سامنے الگنی پہ چادر ا پھیلایا آنگن میں دونوں بستر لگانے اور وضو کر کے جانماز پہ بیٹھ گئی جب نماز پڑھکر اٹھی تو ماسٹر صاحب کے کمرے سے کچھ رکھنے اٹھانے کی آوازیں آئیں ۔ وہ چپکے سے اپنے پلنگ پہ چلی گئی اور خراٹے آہستہ آہستہ لیکن متواتر متوازن ۔ رشو کے ابا سے ان خراٹوں پہ کتنی لڑائیاں ہوئی تھیں جیسے میں جان بوجھ کر خراٹے لیتی ہوں ۔ پھر دیر کے بعد اٹھی لالٹین گل کی رشو کے چپل پہنے ہوئے ہوئے قدم رکھتی دروازے پہ گئی

کانپتے ہاتھ کی ہلکی سی تھپکی دی اور کھڑی اپنے آپ کو سنبھالتی رہی چپکے سے دروازہ کھل گیا وہ اندھیرے سے گپ کمرے میں بدن کو سمیٹ کر داخل ہو گئی اور دو بانہیں اس کی کمر میں لپٹ گئیں اور گرم نرم تیز سانسیں اس کے چہرے پہ رینگنے لگیں۔ جب ماسٹر صاحب لذت کے سمندر میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے تو اس نے آہستہ سے لالٹین جلانے کو کہا۔
ہانپتے کانپتے ماسٹر صاحب نے لالٹین جلائی شیشہ چڑھا کر اس کی طرف مڑے تو جیسے سکتے ہو گیا۔ وہ ان کے سامنے لیٹی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی پیدا ہوئی ہو۔ پھر ماسٹر صاحب نے سنا

"تم نے میرا رنڈاپا برباد کر دیا.......... تو کیا میں تم کو اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گی۔ میں اسی طرح پڑی رہوں گی اور شور مچاؤں گی اور محلے والے تم کو نوچ پھینک دیں گے۔"

"خدا کے لیے.......... آپ جو حکم دیجئے میں حاضر ہوں"

"میں خاموش اس لیے رہی کہ عورت ذات گھر میں اکیلی ہوں اگر تم جان لینے پہ تل گئے تو کیا کر لوں گی"

وہ اسی طرح قدموں میں پڑا تھا۔

"آپ جو حکم دیجئے..... جو سزا دیجئے..... میں حاضر ہوں۔"

"تم شادی کرو گے"

"اب "جی" کو بھی منہ سے نکالنے کا یارا نہ رہا"

"جلدی بولو..... ورنہ"

"اگر آپ کا یہی حکم ہے تو میں حاضر ہوں"

"اچھا اٹھو.....اندر گھر میں چلو"

پھر نکاح ہو گیا۔ پاس پڑوس کی عورتیں جو مدتوں سے بھول کر نہ پھٹکتی تھیں چادرے اوڑھ اوڑھ کر نازل ہو گئیں۔ نگاہوں کی کمینی ہنسی کے ساتھ طعن تشنوں میں ڈوبی مبارکبادیوں کی بھیک دینے لگیں رشو تو جیسے بدل گئی اور خاموش اور سنجیدہ ہو گئی۔ وہ اپنی بیٹی سے ڈرنے لگی۔ پھر دستک ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی ہلکی ہلکی بوندوں میں بھیگتی ہوئی دروازے تک گئی۔ زنجیر کھلتے ہی ماسٹر صاحب اندر داخل ہو گئے۔ رشو برقعہ کے دامن سمیٹ کر رکشے سے اتری اور دروازے میں نقاب الٹ دی۔ کچھ چھینٹیں اڑ کر اس کے منہ پہ پڑ گئیں۔

"بھائی چائے بناؤ..... میں بالکل بھیگ گیا ہوں"

ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے وہ آدھے آنگن سے باورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔ وہ ٹوٹے پنکھے سے کوئلے دہکا رہی تھی اور اپنے اندیشوں پہ شرمندہ سی ہنس رہی تھی۔

———— • ————

مالکن

۱۹۵۰ میں جو سیلاب آیا تھا اس نے سیتا پور سے لے کر نعیم پور کھیری تک کے سارے " گانجر " کے علاقے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا ۔ لیکن گھاگھرا نے تو کمال ہی کر دیا ۔ صدیوں کا بنا بنایا راستہ چھوڑ کر سات میل پیدل چل کر آئی اور سڑک کو مٹنے والے انجن کیطرح چھوٹے موٹے دیہاتوں کو زمین کے برابر کرتی ہوئی رونق پور میں داخل ہو گئی ۔ رونق پور پہلے ہی سے خالی ڈھابلی کیطرح ننگا پڑا تھا ۔ سارے گاؤں میں بس حویلی کھڑی تھی ۔ حویلی کی کھڑکیوں سے اکا دکا بدحواس آدمیوں کے چہرے نظر آجاتے تھے جیسے شہد کی مکھیوں کے بڑے چھتے لٹک رہے ہوں ۔ حویلی کچی تھی لیکن کوئی سو برس سے گھنگور برساتوں کے خلاف سینہ تانے کھڑی تھی ۔ اس کی دیواروں کی چوڑان پر جہازی پلنگ بچھائے جاسکتے تھے مشہور تھا کہ ایک نوسکھیا چور رونق پور کے نجیب الطرفین کا مہمان ہوا ۔ رال ٹپکاتی نظروں سے حویلی کو دیکھ کر ہتھیلیاں کھجلانے لگا اور کنکھیوں سے ہاتھ کی صفائی دکھانے کی اجازت طلب کرنے لگا ۔ میزبان کو دل لگی سوجھی ۔ اس نے کچھ اتا پتا بتا کر آدھی رات کو رخصت کر دیا ۔ مہمان ایک دیوار پر سابر لے کر جٹ گیا ۔ کھودتا رہا ۔ یہانتک کہ فجر کی اذان ہو گئی ۔ دیوار اسی طرح کھڑی تھی ۔ اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی ۔ وہ بے چارہ نامراد واپس ہوا ۔ لیکن بنانے والوں نے حویلی بنائی تھی " تجل بھون " نہیں بنایا تھا ۔ اوپر سے " ہتھیا نکھت " برستا تھا اور نیچے بر جھائی ہوئی مست ہتھنی کیطرح گھاگھرا چوٹیں کر رہی تھی ۔ پہلے پھاٹک گرا پھر دیوان خانہ ۔ جب ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کے کئی درجے بیٹھ گئے تب چودھری کی نمک حلالی کو غیرت آئی ۔ علاقے بھر کے نامی نامی کہاروں اور مچھیروں کی چھوٹی سی فوج بنائی اور اور ان کے بازوؤں کے بجرے پر چڑھکر تھان گاؤں سے نکلے اور

رونق پور کی حویلی میں اتر گئے۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کو کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔

"حضور اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے ـــــــ حکم دیجئے تو جان پر کھیل کر پالکی چڑھالاؤں اگر سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ گھا گھرا کی پاگل موجوں کی دل ہلا دینے والی بھیانک آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ چودھری گلاب نے آہستہ سے پھر کہا تو آواز آئی۔

"تم کیسی بات کرنے لگے چودھری گلاب۔ خدا نہ کرے میں اپنی زندگی میں حویلی کے باہر پاؤں نکالوں اور مرنے والے کے نام پر سیاہی لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے یہیں جہاں حویلی کھڑی ہے۔ یہاں رونق پور کا قلعہ تھا۔ اسی گھا گھر کی موجوں کیطرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں۔ ان سے آگ برستی تھی اور قلعہ جل کر خاک ہوگیا تھا تو کیا ہم بھاگ گئے تھے؟ ہم مٹ گئے تھے؟ ہم آج پھر مٹ جائیں گے!!"

چودھری کھڑے رہے اور مالکن کے ہچکیوں کی کڑ کڑاہٹ سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ میر محمد علی بیگ مر چکے تھے۔ میر محمد علی کی بیوہ رونق پور کی "مالکن" پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی تھی۔ میر محمد علی بیگ نے نقدی میں چھوڑا ہی کیا تھا؟ اور انھیں کچھ چھوڑنے کی پڑی ہی کیا تھی۔ نہ آل نہ اولاد۔ ایک میاں بیوی اور اتنی بڑی جائیداد۔ مالکن نے گہنے پاتے بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں۔ برسوں کی لکھلٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری الہ آباد سے یہ پروانہ لائے کہ حکومت نے مان لیا ہے کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں۔ وہ رات عجیب رات تھی۔ مالکن ساری رات جا نماز پر بیٹھی رہیں ---- ساری رات شکرانے کی نمازیں پڑھتی رہیں اور صبح ہوتے ہی حویلی کے سامنے پٹواری نے ڈگی پیٹ کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ پھر تو جیسے لوٹ مچ گئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں اور باغ و درخت سب کھٹیا بتاشے کیطرح بٹ گئے۔ جیسے بندوق کا فائر ہوتے ہی پرندوں کے غول اڑ جائیں مگر مالکن نے ہمت نہ ہاری۔ چودھری گلاب کو ہدایتیں دے دے کر ان گنت مقدمے لڑاتی رہیں۔ جیسے حضرت محل نے غدر میں فوجیں لڑائی تھیں۔ شکست تو حضرت محل کیطرح رونق پور کی مالکن کو بھی ہوئی لیکن حضرت محل کیطرح رونق پور کی مالکن نے شکست نہیں مانی۔ مگر کب تک؟ ایک ایک کر کے آدمی

بکھرنے لگے۔ عورتیں نکلنے لگیں۔ آخر آخر چودھری گلاب نے بھی آنا جانا کم کر دیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے تیرے میرے کے مقدمے لڑانے لگے۔ بولی دیوالی پہ آتے۔ پاؤ آدھ سیر مٹھائی کا دونا نذر میں بھیجتے اور اسطرح وضع داری کو نبھانے جاتے۔

مقدمے جونک کیطرح لگ گئے اور مالکن کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اندر سے باہر تک سب اجڑ گیا۔ گانے، بیل، شامیانے، پھولداریاں، جاجمیں، قالین، دیگ، پتیلے، کرسی، میزیں، پلنگ، پیڑھی سب باورچی خانے کو زندہ رکھنے کے لیے جل گئے۔

پھر ایک دن جب وہ نماز پڑھکر اٹھیں، مونج کی پٹاری کے پاندان سے کھجور کی گھٹلیوں کے دو ڈبے اور پتی کی تمباکو کا پھنکا لگایا اور کھنڈر کے اس حصہ کیطرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا۔ بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے کونے کے کمرے میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کے منہ دیکھے جوان کے پیٹ کیطرح خالی تھے۔ گھٹنوں پہ ہتھیلیاں جما کر آہستہ آہستہ جھکتی ہوئی وہیں زمین پہ بیٹھ گئیں جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کی لنگڑاتی ہوئی نگاہیں اس سنسان لق و دق کھنڈر میں رینگتی رہیں جس کی چھتیں گر چکی تھیں، دھنیا جل چکی تھیں، دروازے بک چکے تھے اور جس کے در و دیوار خدمتگذار انسانوں کی مودب پرچھائیوں کے رنجگوں کو ترستے تھے اور شاید ترستے ترستے بھول چکے تھے ان کی بھو کی آنکھوں سے دو میلے میلے آنسو گرے اور پیوند لگے ہوئے موٹی تنزیب کے کسیلے دوپٹے میں کھو گئے۔ پھر انھوں نے ایک انجانی آہٹ محسوس کی اور کسی نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا، وہ کانپنے لگیں لیکن کانوں سے ٹکراتی ہوئی اس مقدس آواز کو سنتی رہیں جس سے ماماتا کارس ٹپک رہا تھا۔

"زیب النساء بیگم ------! تم ان شریف زادیوں کی اولاد ہو جن کی تلوار نے سلطنتوں کی تقدیریں لکھی ہیں اور تخت و تاج کے فیصلے کئے ہیں۔ تم ان درویشوں کی بیٹی ہو جن کے قلم نے قرآن شریف نقل کیے ہیں اور پیٹ بھرا ہے۔ تم تلوار نہیں بلا سکتیں ------ تم قلم نہیں اٹھا سکتیں ------ لیکن تم سوئی تو چلا سکتی ہو۔ تمہارے ہاتھ کے انگرکھے پہن کر میں نے "چھترمنزل کلب" کی میموں کے ساتھ ڈنر اڑائے ہیں، لنچ کھائے ہیں ------ کیا کہا تم نے؟ اب انگرکھے کون پہنتا ہے؟ ------ اب انگرکھے نہیں پہنتا تو کوئی نہ کوئی کرتے ضرور پہنتا ہو گا ------ تم کو یاد ہے؟ میں نے لکھنو کے کناؤ کے جو کرتے سلوائے تھے ان کی سلائی اس زمانے میں کیا تھی؟ ------ پانچ روپیہ فی کرتا ------ تم

ویسا کرتا دو دن میں سی سکتی ہو؟"۔

جب وہ اٹھیں تو ان کی بے پناہ بے قراری کو قرار آچکا تھا جیسے ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اٹھی ہوں ______ جیسے سارے بدن کی سخت محنت کے بعد ٹھنڈے پانی سے خوب دیر تک نہا کر نکلی ہوں ۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اٹھا رہی تھیں کہ اس طرف سے آواز آئی جہاں کبھی ڈیوڑھی ہوا کرتی تھی ۔ انھوں نے دوپٹے کو اس طرح بنا کر اوڑھا کہ تمام پیوند ادھر ادھر ہو گئے اور چنیاں کچے آنگن میں آہستہ آہستہ رگڑتی ہوئی اس ویران بیکھے کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں جو کبھی ڈیوڑھی کے گرانڈیل منقش دروازے کا سہارا تھا۔

"میں ہوں مالکن ----- گلاب لال"

"اچھے ہو ----- چودھری گلاب؟"

"مالکن کرپا ہے -----"

"کیسے آگئے؟"

"ایک سندیسہ آیا ہے"

"کیا"

"پاکستان سے خان صاحب آئے ہیں -------------- وہ جو بڑی مسجد کے پچھواڑے رہتے تھے۔"

"ہاں ہاں منے خاں ----- جن کا بھتیجا ہمارے یہاں سپاہیوں میں تھا۔"

"جی ہاں جی ہاں وہی ۔ ان کے بڑے رتبے ہیں پاکستان میں ۔ سب لڑکے ان کے بڑی بڑی جگہوں پر ہو گئے ہیں۔"

"اچھا -----!"

"جی ہاں --------------- موٹر پر آئے ہیں وہ لکھنو سے ۔ کہتے ہیں کہ آپ کے بھائی افضل مرزا صاحب جو آجکل کراچی میں بڑے کمشنر ہیں انھوں نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ چلی آویں۔"

"افضل مرزا میرا بھائی تھوڑی ہے مُوا -------------- میرے ایک رشتے کے چچا کا بیٹا ہے"۔

"تو انھوں نے آپ کو بلایا ہے ----- بلکہ خان صاحب تو کہتے تھے کہ ان کو پاسپورٹ بھی انھوں نے اس لئے بڑی دوڑ دھوپ کر کے دلایا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ

لے آویں۔"

"مجھ کم بختی کی ماری پر ایسے بیمبری وقت پڑ گئے ہیں کہ مونے ایروں غیروں کے ساتھ دوسرے ملک سدھار جاؤنگی۔اس سے کہنا کہ اپنے ہوتوں سوتوں کو سمیٹ لے جانے اپنے ساتھ پاکستان ۔۔۔۔۔ مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے۔جب تک حکم نہیں آتا تبھی تک بیٹھی ہوں۔"

"وہ کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔"

"کوئی مارو چودھری گلاب۔۔۔۔ کہنا سنا کا ہے کا۔۔۔۔"

"جی بہتر ہے۔۔۔۔۔"

"ہاں میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی۔"

"حکم"

"یہاں رونق پور میں یا۔۔۔۔ کسی اور گاؤں میں کوئی۔۔۔۔۔"

"جی ــــــ"

"میں نے کہا سر کار میں سمجھا نہیں"

"کوئی کرتے پہنتا ہے"

مالکن نے ایسی بھرائی ہوئی ۔۔۔۔۔چیخ مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی خبر سن کر پھٹ پڑی ہو۔بوڑھا چودھری گلاب سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

"کرتے۔۔۔۔؟"

"ہاں تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب۔تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے واقف ہو۔تم تو حویلی کی دائی گیری کر چکے ہو اور دائی سے کیا پیٹ چرانا۔آدمی حق سب چلے گئے۔عورتیں ادھر ادھر ہو گئیں۔اتنے بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی کوے ہنکایا کرتی ہوں۔رات تو روتے گذر جاتی ہے مگر یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں۔نانے نہیں ٹلتے کوئی کرتا رتا ہو تو سینے پرونے میں دل اٹک جاتا۔"

حویلی کے بوڑھے رازدار کے تخیل کی آنکھیں بھو کی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور اس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔

"تم کھڑے کھڑے تھک گئے ہو گے چودھری گلاب ــــــ"

"نہیں مالکن ـــــــ میں شام تک آجاؤنگا۔"

"مگر دیکھو ـــــــــ کسی ایسے ویسے کا کرتا نہ لے آنا میرے پاس۔"

"نہیں مالکن ـــــــــ"

"میرا نام نہ لینا کسی سے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے مالکن؟ میں کوئی آج حویلی میں نوکر ہوا ہوں؟"

سڑک کے کنارے املی کے پیڑ کی جڑ سے چودھری گلاب نے اپنا ٹٹو کھولا اور سوار ہو کر بغیر خان صاحب سے ملے ہوئے تھان گاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر دیر تک بیٹھک کے تخت پر بیٹھے سلفہ گڑگڑاتے رہے۔ جب سورج سر پر آ گیا تب چودھرائن نے دروازے سے جھانک کر "چوکے" کے تیار ہونے کی خبر دی۔ وہ اونگھتے ہوئے اٹھے۔ آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے پکے کنویں کی چبوتریا پر کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ نہانے اور سر جھکائے چوکے پر بیٹھ گئے۔ چودھرائن روٹی سینک سینک کر رکھتی جا رہی تھیں مگر وہاں پہلا نوالہ ہی ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔

"کا تمرا کچھ جی ماندہ ہے۔"

"ہاں"

"تو تھوڑا بہت تو کھائے لیو"

"تمرے پاس کتنے روپیہ ہیں۔"

"روپے؟ مورے پاس اپنی ایک چھدام نائیں ہے۔ بڑے بھیا کے کچھ دام دھرے ہیں۔"

"کتنے ہیں بھلا؟"

"ہیں کوئی دس گھاٹ پچاس"

"لے آؤ"

"ابھیں"

"ہاں"

"پہلے روٹی کو کھالیو"

"پہلے لے آؤ"

چودھری گلاب نے مارکین کی تھیلی سے چالیس روپے کاغذ نکال کر گنے اور تھالی چوم کر کھڑے ہو گئے۔ چودھرائن پہلے آنکھیں پھاڑے دیکھا کیں پھر بکنے جھکنے لگیں لیکن

چودھری گلاب نے ان کی بکواس پہ کان نہ دھرے۔ الگنی سے اپنا کرتا اتار کر پہنا، دھوتی بنا کر باندھی، ٹوپی سر پہ اور انگوچھا کندھے پہ رکھ کر چلے آئے۔ گھاس کھاتے ہوئے ٹٹو کے منہ میں لگام چڑھا دی۔ گھسیٹتے ہوئے تھان کے باہر لائے اور سوار ہو گئے۔ بھوکا ٹٹو اپنی چال بھر چل رہا تھا لیکن چودھری گلاب کے ذہن میں آنا جانے والے کئی انجن دھڑ دھڑا رہے تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زمانے میں منشی تھے لیکن ان کے مرتے ہی جب حویلی اجڑنے لگی اور بڑے چھوٹے مختار شہد کی مکھیوں کی طرح دوسرے باغوں کی تلاش میں حویلی سے اڑ گئے، تب مالکن نے اپنے ایک ایک تنکے کی باقاعدہ دیکھ بھال چودھری گلاب کے سپرد کر دی تھی۔ چودھری ان لوگوں میں تھے جو حال کی جیب سے آنے والے برے دنوں کا منہ بھرنے کیلئے کچھ نہ کچھ کاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ لیکن لڑکوں کی پڑھائی لکھائی اور شادی بیاہ کے جھمیلوں میں سب جمع جتھا پہ لگا کر اڑ گیا۔ ان کا بڑا لڑ کا تحصیل میں اور دوسرا نہر میں چپراسی تھا۔ دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مڈل پاس تھے لیکن چودھری کے لاکھ دوڑ دھوپ کے باوجود نہ کوئی پٹواری ہو سکا اور نہ پٹرول۔ مجبوراً انھوں نے چپراسیوں میں بھرتی کرا دیا۔ اب وہ آئے دن منہ کھولے ہاتھ پسارے ان کے سامنے کھڑے رہتے لیکن چودھری خود ہی کھکھل بیٹھے تھے ان کا بھرنا کہاں سے بھرتے۔ اس وقت گھر والی کی بات سے چکر میں پڑ گئے۔ بڑکنو اتنا گر بست اور سلیقہ کب سے ہو گیا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ یہی سب کچھ الا بلا سوچتے ہوئے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزاز کی دوکان پہ انھوں نے اپنا ٹٹو روکا اور اتر کر بہت بڑھیا والی تنزیب کے تھان پہ کھنے لگے۔ دو کرتوں کا کپڑا بغل میں مار کر وہ سیدھے حویلی پہنچے —— دل ہی دل میں اپنے باپ منشی جھمن لال کی پڑھائی ہوئی ساری فارسی کا آموختہ پڑھکر مالکن سے مخاطب ہوئے اور ان کو یقین دلایا کہ پوری رازداری کے ساتھ وہ چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے کرتوں کا کپڑا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کا حلق سوکھ گیا۔ کانپنے سے پڑنے لگے۔ ساری جان پسینے میں نہا گئی۔ ان کی مٹھی میں دبی ہوئی پچیس روپیوں کی پڑیا بھیگ گئی۔ لیکن ان کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ کر کیا بہانہ بنا کر یہ پچیس روپے مالکن کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ آخر ہار کر اپنے لکڑی کے پیروں پہ اپنے وجود کا منوں بار گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے بنیے کی دوکان پہ آ گئے۔ رام پرشاد گدی پہ بیٹھا گاہکوں کو پڑیاں بانٹ رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد انھوں نے مالکن کا حساب مانگا تو پتہ چلا کہ وہ سو سے اوپر تھے۔ اس لیے تو رام پرشاد نے ان کا سودا بند کر دیا تھا۔ اسی

لیے تو مالکن کا باورچی خانہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ رام پرشاد کی دوکان کے تختے پر بیٹھے ہوئے اپنے پچیس روپیوں کی پڑیا کو نہار رہے تھے۔ بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر اپنے ٹٹو پر سوار ہو گئے جیسے لڑائی میں ہار مان لی ہو۔

مالکن دیر تک کپڑا لیے جھلنگا کھٹولے پر پڑی رہیں۔ انھیں پہلی بار عرفان ہوا تھا کہ کرتا سینے کے لیے صرف ہاتھ کا فن اور آنکھوں کی روشنی ہی کی نہیں، سوئی اور تاگے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جتنے میں سوئی تاگا آتا ہے اتنے میں ایک وقت کا آٹو اور دو وقت کے چنے بھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا نے ان کی سن لی۔ اور ان کی ناؤن ناخن کاٹنے آ گئی۔ وہ ہڑ بڑا کر اپنے خیالوں کی کچی نیند سے چونک پڑیں اور ناؤن سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوئیں جیسے لہجے میں وہ اپنے سنہرے دنوں میں مخاطب ہوتیں تو وہ سارے رونق پور میں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈھورا پیٹ آتی۔

"ارے اے قادر کی دبی"

"جی، بی بی"

"میرا ایک کام کر دو گی اتنے وقت؟"

"بتائیے"

ذرا لپکی ہوئی رام پرشاد کی دوکان چلی جاؤ اور ایک مہین سوئی اور ایک چھوٹی پیچک لے آؤ۔ لیکن اس حرامزادے سے میرا نام نہ لینا نہیں تو ٹکا سا جواب دے دیگا۔ کل میں نے دو پیسے کا نمک، خیر چھوڑو........ تم چلی جاؤ۔

وہ اپنی داہنی کنپٹی پر لیکھ ٹٹولتی ہوئی آنگن پار کرنے لگی۔ مالکن بیٹھی سوچتی رہیں۔ جب ناؤن سوئی تاگا لے آئی تو اسی سے اس کی قینچی منگوائی اور کرتے بیونتے بیٹھ گئیں۔ قینچی چلاتے چلاتے انھیں خیال آیا کہ چودھری چیت پور کے ٹھاکر کی ناپ تو لا نے ہی نہیں۔ کرتا کیسے کاٹا جائے۔ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ تھان گاؤں اچھا خاصا تین چار میل دور تھا۔ اب ایسا آدمی کہاں جڑتا جو اسی وقت چودھری کو بلا کر کہتا۔ پھر انھوں نے دیوار پر چڑھتی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل ہے اور منگل کو رونق پور کی بازار ہوتی ہے، ممکن ہے ٹھاکر آجائیں بازار کرنے۔ اپنے اس وہم پر ایمان لا کر وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے اٹھیں، وضو کے بدھنے میں گھڑے سے پانی انڈیلا وضو کیا اور نماز کے لیے وہ چٹائی بچھائی جس پر کپڑے کے پیوند لگے تھے۔ جیسے تیسے نماز کا فرض ادا کیا۔ چھوٹا سا وظیفہ پڑھ کر لمبی سی

دعا مانگی کہ اے پروردگار عالم اپنی رحمت کے صدقے میں چیت پور کے ٹھاکر گھنشام کے دل میں نیکی ڈالدے کہ وہ آکر اپنے کرتے کی ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل تک ان کا کرتا سی دوں اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ساری رات لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر کرتا سی سکوں۔ وہ گڑگڑاتے نڈھال ہو گئیں۔ اسی جانماز پر ڈھیری ہو کر پڑ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی مہترانی ہمیشہ کیطرح دو وقتی کمانے آئی تھیوہ نئی امید سے تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھیں۔

"بانکے کی بہو"

"بی بی"

"بانکے ہیں گھر پر"

"ہیں بی بی"

"ذرا جلدی سے جا کے بلالا۔۔۔۔۔ کوئی کام نہیں۔۔۔۔۔ بس ایک بات پوچھنا ہے"

وہ الٹے پیروں چلی گئی۔ پھر دروازے پر صدا بلند ہوئی۔

"سرکار کی بڑھتی ہو۔ راج پاٹ بنا رہے۔"

"بانکے"

"سرکار"

"چیت پور تمہاری ججمانی ہے؟"

"ہاں حضور"

"ٹھاکر گھنشیام کو پہچانتے ہو؟"

"ان کا سرکار کون نائیں پہچانت ہے۔۔۔۔۔ دور دور تک ان کا نام باجت ہے۔"

"بازار تو آتے ہونگے"

"برابر مالک"۔۔۔۔۔۔ برابر"

"تو تم ذرا خیال کر کے ان کو میرے پاس بلالانا۔ مجھے ایک کام ہے ان سے۔"

"بہت نیک مالکن۔ انہیں لیو آپ۔۔۔۔۔ کا کچھ دور تھوڑے ہے۔"

بانکے تو اپنا چمرودھا جوتا بجاتا اور رٹی ہوئی دعائیں دیتا چلا گیا لیکن اپنی آواز کی درا کی پر مالکن پچھتاتی رہیں، شرماتی رہیں بیٹھی دعائیں مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے پر نہ آئیں بلکہ کسی نوکر کے ہاتھ اپنا کرتا بھجوادیں، ورنہ میں ان سے کسطرح بات

کرونگی ۔میں کیا کہونگی ۔ وہ کیا کہیں گے یا اللہ کچھ ایسا کیجیو کہ مرنے والے کے سامنے میری آنکھیں نیچی نہ ہوں ۔

بانکے نے اپنی بکری کے سوپ پیٹھ پر باندھے اور بازار کے ایک نکڑ پر بیٹھ رہا جہاں ادھے کھوئے جاتے تھے ۔ تھوڑی دیر بعد بیلوں کے گھنگھرو بجاتا اور دھول اڑاتا ٹھاکر کا ادھا آگیا ۔ وہ اپنے سوپ سنبھال کر اٹھا ہی تھا کہ ایک گاہک پھاند پڑا ۔اس نے گاہک کو ٹالنے کیلئے بڑی بڑی زبان میں بات کی لیکن اس نے پیچھا نہ چھوڑا ۔ آخر پیسے گنتا ہوا وہ ٹھاکر کے پیچھے بھاگا ۔ ٹھاکر آدمیوں کو چیرتے ہوئے رام پرشاد کی دوکان پر پہنچے ۔رام پرشاد نے جلدی سے کھڑے ہو کر سلام کہا اور ایک دو گاہکوں کو ہٹا کر دوکان کے باہری پڑے پر دری ڈالدی ۔ ٹھاکر نے بیٹھ کر تولیے سے اپنا منہ پوچھا ۔ پھر اسی سے چیزوں کی گرد جھاڑی ۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے بانکے جھکا ہوا ڈنڈت کر رہا تھا ۔

"کاہے رے"

"ایک اجر (عذر) ہے ۔"

"مالکن آپ کا بلائن ہے"

"مالکن ؟"

"ہاں -----یہاں کی سرکار کی مالکن ۔"

"اچھا ----- کاہے بلائن ہیں ----- کچھ اتا پتا ہے بھلا ۔"

"یو سرکار آپ جان سکت ہو -----ہم کا نائیں معلوم"

ٹھاکر چیت پور کے نمبری زمیندار تھے اور میر محمد علی بیگ مرحوم کے ہوا خواہوں میں تھے ۔ مرحوم کے ایک ایک فاتحے میں شریک ہوئے تھے ۔اس کے بعد ادھر بھول کر بھی نہ گذرے تھے ۔اب آج اس اچانک پیام سے گھبرا گئے تھے پھر کچھ سوچ کر فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے ۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ چودھری گلاب سے ملاقات ہوئی ۔چودھری گلاب سنگھ نے کترا کر نکل جانا چاہا لیکن ٹھاکر نے دبوچ لیا ۔

"ارے چودھری ای مالکن کاہے بلائن ہے ہم کا"

"چودھری کا خون خشک ہو گیا ۔لیکن بازوؤں پر انگوچھا پھیلا کر بولے ۔

وہ -----وہ ----- دراصل ٹھاکر صاحب مالکن نے آپ کو اس لیے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں انھیں میری ضرورت تھی اور آپ کی سواری تو تھان گاؤں سے

نکلتی ہی ہے اسی لیے آپ کو-----"

"اچھا---میں کہوں کہ ایسی کیا بات آپڑی، پھر ٹھیک ہے-----تو مطلب یہ ہے کہ اب وہاں جانے کی چنتا تو ہے نہیں۔"

"اب آپ کیوں تکلیف کریں گے-----میں تو آہی گیا۔"

ٹھا کر کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا کرتا دیکھتی رہیں جو سن لائٹ صابن سے بھینچا گیا تھا اور سن لائٹ صابن کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ شکنیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ جب رونق پور پہ یہ بیتی ہے تو چیت پور پہ بھی کچھ نہ کچھ تو گذری ہی ہوگی۔ پھر اسی وقت کرتا کاٹنے بیٹھ گئیں۔ جب تک اندھیرا نہ ہو گیا اور ان کی سوئی نظر آتی رہی وہ اسی طرح پرنم آنکھیں جھکائے اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرتی رہیں اور روئی دال کے خواب دیکھتی رہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد انھوں نے پیتل کی وہ لالٹین جلائی جس کی چمنی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بھبھک اٹھتی جیسے مالکن کے دکھ پہ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی ہوں۔ دکھتے ہوئے سر پہ چیتھڑے کی پٹی باندھے رنجور آنکھوں سے کپڑا بھرائے سیتی رہیں۔ اپنے دسترخوان کے چاک کو بھرتی رہیں۔ ارہر کی دال چنتی رہیں اور موتی ایسے صاف گیہوں کے اجلے اجلے آٹے کو گوندھنے کا سامان کرتی رہیں۔ پھر سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سدھ ہو کر بانس کے جھلنگے پہ دہری ہو گئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹین کے بکس میں مہین سلائی کے پھول ایسے سبک سجل کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی، ویسے ویسے ان کے چہروں پہ جھریوں کا جال اور گہرا ہو گیا۔ کھچڑی بال ایک دم سے پک گئے جیسے پلاؤ کے چاول دودھ میں ابال کر تھالی میں ڈال دیے گئے ہوں۔ گھر پہ سوگ سا چھا گیا۔ گھر والی نے پہلے خود چودھری کو سمجھایا پھر لڑکوں لڑکوں کو ان کے حلقوں سے بلا کر اس مورچے پہ لگا دیا۔ پھر تینوں نے ملکر ایک دوپہر کو گھر کے آنگن میں مہابھارت چھیڑ دی۔ جیسے جیسے بات بڑھتی گئی خون گرم ہوتا گیا۔ چھوٹے نے جو تاڑی کی ایک ہی کپی میں بولایا تھا کڑک کر کہا۔

"ارے اماں تم کا جانو-----یو بڈھا اس بڑھیا مالکن سے پھنسا ہے۔"

بوڑھے چودھری گلاب نرائن جن کی جوانی ان کے اپنے سر کیطرح بے داغ تھی

اس الزام ،اس بھیانک الزام کو سن کر دیوانے سے ہو گئے۔ وہ کھڑے ہونے چو ملمی لڑ رہے تھے۔ وہیں زمین پر دھپ سے بیٹھ گئے یا اس طرح گرے کہ بکھر نہ سکے۔ پتھو نالڑ کا ثبوت دے رہا تھا۔

"جب بھیا (سیلاب) آئی ہے اوفی سال تو ای جان پہ کھیل کے او کا بدمعاش کا بچاوے گئے رہیں ...... گئے رہیں کہ ناہیں گئے رہیں؟ تم اپنے منہ سے بتاؤ اماں؟"

چودھری گلاب نرائن کی بے نور آنکھوں نے گھر والی کے چہرے پر یقین کی پرچھائیں دیکھ لی۔ گویا شکاری نے زخمی جانور پر دوسرا فائر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی ٹانگوں پر اپنے وجود کی لاش لے کر اٹھے اور لرزتے ہوئے دروازے سے نکلے ____ اپنی چوکھٹ .... اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر میں ڈالی ہوئی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے چوما اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے، بغیر آنکھوں سے ایک آنسو بہائے اس پختہ کنویں پر چڑھ گئے جس کی جگت آدمی بھر اونچی تھی اور اس طرح ٹوٹ کر گرے جیسے گراری تک آ کر جہازی گھڑے کی رسی ٹوٹ جائے۔ اتنے زور کا دھما کا ہوا کہ سارا تھان گاؤں ہل گیا۔ گاؤں کا گاؤں الٹ پڑا۔ آدمی کنویں کے اندر اتر گئے۔ چودھری گلاب نرائن نکال بھی لیے گئے لیکن وہ تو اسی وقت مر گئے تھے جب اپنے کے منہ سے اپنی مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سنی تھی۔

کہانیوں سے ...... چٹ پٹی کہانیوں سے انسانوں کو .... گاؤں کے ان انسانوں کو جن کے حواس ہر کی طرح بھوک سے بلبلاتے رہتے ہیں ...... جو پیدائشی محبت ہوتی ہے .... جو قاتل محبت ہوتی ہے ،اس محبت نے چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کے خاکے میں رنگ بھر لیا اور مشہور ہو گیا کہ .... مالکن ...... تو چودھری گلاب نرائن پر میر محمد علی کی زندگی میں مرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد تو اور کھل کھیلیں۔ منے خان نے کتنا کتنا کہا لیکن وہ چودھری کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر رضامند نہ ہوئیں۔ پاکستان جانے پر جہاں لوگ اپنی اولاد اپنے محل دو محلے اپنے گاؤں گرام تک چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر مالکن کو علاقے کی وہ آوارہ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر گھورنے لگیں جن کی جوانی کی کالی راتیں عاشقوں کے بوسوں کے چراغوں سے جگمگا چکی تھیں۔ وہ مالکن کو گھور رہی تھیں۔ ادھیر مالکن کی کمر سیدھی تھی۔ ایک سفید لٹ چاندی کے جھومر کی زنجیر کی طرح ان کی پیشانی پر جھولتی رہی۔ نازک خدوخال کے سفید چہرے پر بھوک نے سانے

ڈال دیے تھے لیکن برسوں کی حکومت اور امارت کی بخشی ہوئی تاب، اب بھی جب وہ پلکیں اٹھا کر آنکھیں پوری طرح کھول دیتیں تو مخاطب کی نظریں چوروں کیطرح راستہ ڈھونڈ نے لگتیں۔ نوکرانیوں کے سے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی وہ بیگموں کیطرح جگمگایا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر تو ایسی جھوٹی کہانی بھی سچی معلوم ہوتی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی، بکھری ہوئی، ٹوٹی ہوئی عمارت کی یادگاریں وہ محرم کی ایک "روشن چوکی" کیطرح جھلملایا کرتیں۔ دل دہلا دینے والی یادوں کے مودب قافلے ان کی کم نور آنکھوں کے سامنے سے دبے پاؤں گذرتے رہے۔ چیت، بیساکھ کے جلتے تپتے دن، ساون بھادوں کی گھموبی راتیں ----سب کھوٹے سکوں کیطرح ان کے وجود کی "گولک" میں کھنکھنایا کرتیں اور وہ ان کی بے فیض "جھنا جھن" سے بے نیاز چھوٹی چھوٹی مادی کلفتوں کے ناقابل بیان کرب میں دب کر کراہا کرتیں۔

ایک دن جب وہ چودھری گلاب نرائن کا انتظار کرتے کرتے سوکھ چکی تھیں اور ان دنوں کا، ان بھیانک دنوں کا انتظار کرنے لگی تھیں جو ان کے لیے فاقوں کی سوغات لے کر آنے والے تھے کہ چودھری گلاب نرائن کی خود کشی کی کہانی ٹوٹی ہوئی دیواروں کو پھلانگ کر ان کے کچے آنگن میں چڑیل کیطرح ناچنے لگی، قہقہے لگانے لگی، ان کے منہ پر تھوکنے لگی، رونق پور کی اس مالکن کے منہ پر تھوکنے لگی جس منہ کے سامنے رونق پور کا سارا علاقہ آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ وہ اٹھ کر بغیر دروازوں کی کوٹھری میں گر پڑیں۔ ننگی زمین کے ٹھنڈے فرش پر دوزانو ہو کر اس خدائے قہار کے سامنے گڑگڑاتی رہیں جو اپنے بندوں پر، اپنے پیارے بندوں پر اس لیے مصیبتیں نازل کرتا ہے تاکہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو سکے۔ ان کے ایمان پر صیقل ہو سکے۔ پھر اسی دن رونق پور کی بتیس سال کی زندگی میں پہلی بار انھوں نے چودھری گلاب نرائن کو مردے کے روپ میں دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ حویلی کے اندرونی حصے کے دوسرے درجے کے سیاہ ستونوں والے دالان کے پیچھے لانبے کمرے میں جوٹ کی موٹی موٹی چٹائیوں پر فرشی قالین پڑے ہیں۔ ایک طرف چوکے کے مسند پر گاؤ تکیے سے لگے ہوئے میر محمد علی بیگ مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں۔ دور کونے میں سلگتی ہوئی، مہکتی ہوئی سنک کی کامدار نے ان کے زانو پر پڑی ہے جس کی گنگا جمنی مہنال سے ان کی انگلیاں کھیل رہی تھیں ـــــ نگاہیں دیوار گیری پر جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھی دانت کے نازک کام کی بھاری سی میز ناشتے کی پلیٹوں کا بوجھ اٹھائے

خوبصورت کنیز کیطرح دو زانو ہے ۔ وہ اپنی مسہری سے اٹھیں ۔ ایک ہاتھ میں فرشی پائجامے کے بھاری پائینچے لیے دوسرے ہاتھ سے استنبولی بیل سے جھولتے ہوئے دوپٹے کا پلو سنبھالا ۔ موٹے موٹے زیوروں سے ہلکی ہلکی زریں جھنکار پیدا کرتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور ان کے ململ کے کرتے کی مل ولی آستین پہ انگشتانوں اور انگوٹھیوں سے مرصع ہاتھ رکھ کر بولیں ۔

"تم اتنے اداس کیوں ہو ۔۔۔۔؟"

"اداس ۔۔۔۔۔ نہیں تو"

"نہ تم نے غسل کیا ۔۔۔۔۔ نہ ناشتہ کیا ۔۔۔۔ کتنی دیر سے اسی طرح بیٹھے ہو ۔"

"ہوں"

"ایک بات کہوں"

"ہوں"

"غصہ تو نہ کرو گے"

"آہ ۔ ہوں"

"حکیم ڈاکٹر دوا نہیں کرتے ہیں ۔ نصیبے نہیں بناتے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھ کو کھ جلی کے مقدر ہی میں اولاد نہیں ہے تو حکیم ڈاکٹر کیا کرلیں گے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میری مانو تو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دوسری شادی کرلو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"چپ رہو"

وہ اتنی زور سے گرجے کہ باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی عورتوں کے ہاتھ سوکھ گئے ۔ کتنی ہی دیر تک ویسی ہی بھیانک خاموشی مسلط رہی ۔ پھر ایک عورت سائے کیطرح ہلتی ہوئی تخت کے سامنے کھڑی ہو گئی ۔ مالکن نے اشارے سے پوچھا ۔

"کیا ہے؟"

"تھان گاؤں والا گلاب نرائن ڈیوڑھی پہ کھڑا ہے"

"بلاؤ"

دالان کے پردے بندھے تھے ۔ کمرے کے دروازوں پہ چلمنیں پڑی تھیں ـــــــ تھوڑی دیر کے بعد ایک اوسط قد کا سوکھا سا کھا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا ـــــــ اس کے کرتے کی ایک مونڈھے پہ پیوند لگا تھا ۔ نسبتاً اجلی دھوتی پہ گھٹنے کے پاس بھانک

کی سلی ہوئی تھی ــــــــ دھوتی سے نکلی ہوئی سوکھی ماری پنڈلیا گردمیں اٹی ہوئی تھیں۔ ننگے جوتے میں بندھے ہونے کی وجہ سے صاف تھے۔ اس کا سرگھٹا ہوا تھا۔ ٹوپی میں میل کی گوٹ سی لگی تھی۔ وہ سہما ہوا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک جھولا سنبھالے ہوئے تھا۔

"دوا لے آئے؟"

"ہاں سرکار"

اس آدمی نے گڑ گڑا کر کہا ــــــــ

"دے دو"

اس نے دروازے پہ کھڑی ہوئی عورت کو اسی طرح جھولا پکڑادیا جیسے وہ جھولا نہیں شیشے کا پیالہ ہے اور اس میں لبالب عطر بھرا ہوا ہے ---- پھر آواز آئی۔

"اس کو، گلاب کو دو آنے پیسے اور خوراک دلوادو۔"

اب ان کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے میلوں میں کھو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے آپ کو ملیں تو دھوپ آنگن میں اترنے لگی تھی اور ذہن میں آئے ہوئے جان دینے کے سارے منصوبے دیوالی کے چراغوں کیطرح بجھ چکے تھے۔ وہ باہر نکلی ہی تھیں کہ کمر پہ ٹوکرا رکھے ہوئے اور ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکالے بانکے کی بہو آگئی۔

"ارے تم چیت پور جاؤ گی۔"

"ہاں بی بی جی"

"تو ذرا ٹھاکر سے کہہ دینا کہ شام کو اگر بازار آئیں تو مجھ سے مل لیں۔"

"بہت اچھا"

"مالکن اتنا کہہ کر باورچی خانے کیطرف مڑی ہی تھیں کہ دروازے پہ کچھ تند آوازیں شریر لڑکوں کیطرح اچھلنے لگیں۔ مالکن کا اشارہ پا کر مہترانی گئی اور تھوڑی دیر بعد لانبی دبلی عورت کے ساتھ واپس آئی جو لال کنارے کی سفید دھوتی پہنے تھی۔ مہترانی نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا ــــــــ

"ای تھان گاؤں والے چودھری والے چودھری گلاب کیری چھوٹی بہو ہیں ---- لیلادھر کی دلہن"

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے اعصاب کو سنبھال کر یہ سوچنے لگیں کہ اسے

کسطرح مخاطب کریں اور مدارات کریں کہ اس نے اپنی بغل سے مڑے ہوئے کرتے نکالے اور مالکن کے ہاتھ میں پکڑا کر ہر جذبے سے خالی آواز میں منمنائی۔

"ای کرتا آنپے دھر لیو"

.جملہ پورا کرتے ہوئے وہ تیر کیطرح آنگن ختم کر کے ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی دیواروں کے پیچ و خم میں غائب ہو گئی۔ ذرا دیر تک مہترانی نے ان کا جائزہ لیا اور دوسرا گھر کمانے چلی گئی۔

مالکن پھول سے کورے کرتے داہنے ہاتھ میں اٹھائے آنگن میں کھڑی رہیں ـــــــــ شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے چیت پور کے تھاکر گھنشیام سے مالکن کہہ رہی تھیں۔

اپنے کرتوں کی تنزیب تو آپ بھیجتے رہئے گا لیکن پہلے یہ میرے چاروں کرتے بکوا دیجئے۔

نازو

"چھن چھن"

آواز نے کانوں کو چور چور کر دیا جیسے اس کے سامنے اس کی نازو نے سرخ چوڑیوں سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھ دہلیز پر پٹخ دیے ہوں ۔ دونوں سفید تندرست کلائیاں خون کی چھوٹی چھوٹی مہین لکیروں سے لالوں لال ہو گئیں ۔ کتنی شدت سے جی چاہا تھا کہ اس جیتے جاگتے خون پر اپنے ہونٹ رکھ دوں ۔ آج پھر اس کی زبان نمکین ہوگئی ۔ آنکھیں پتھرا گئیں ۔ دونوں زخمی کلائیاں دو بچوں کی لاشوں کیطرح اس کے پہلو میں جھول رہی تھیں آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے ۔ دھاروں دھار ہونٹ کانپ رہے تھے ۔ عذابوں کی بددعائیں دے رہے تھے ۔ اسے یقین نہ آرہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے اس کی وہی بیوی ہے جس کی بے مزہ قربت کی چکی میں سینکڑوں راتیں پس کر نابود ہوگئیں ۔ طلاق کی چلمن کے پیچھے سے وہ کتنی پر اسرار اور زرنگار لگ رہی تھی ۔

ٹریکٹر پھر چلنے لگا ۔ تھوڑا سا کھیت باقی رہ گیا تھا ۔ گیہوں کی پوری فصل کٹی پڑی تھی ۔ کہیں کہیں بڑے انبار لگے تھے ۔ کہیں چھوٹے چھوٹے ڈھیر ۔ جیسے بیتے ہوئے سال اور مہینے ۔ انھوں نے ایک چھوٹے سے ڈھیر کو اپنی چھڑی سے الٹ دیا سنہرے تنکوں اور ڈنٹھلوں کے ہجوم سے کچھ دانے نکل آئے ۔ زندہ اور چمکدار جیسے گذرے دنوں کے ان گنت لمحوں کے بھوسے میں کچھ یادیں چمک رہی ہوں ---- یادیں ہماری بوئی ہوئی فصلوں کے دانے ۔ ابھی نہ دھوپ تیز ہوئی تھی اور نہ ہوا گرم ۔ لیکن وہ اپنے ادھیڑ جسم کے ساتھ ٹیوب ویل کے پانی سے لبریز پختہ نالی کے کنارے کنارے چلتا ہوا ڈامر کی سڑک پر آگیا ۔ اب انجنوں کی آوازیں دور اور دلکش ہونے لگی تھیں ۔ سڑک کے دونوں طرف اسکولوں کی زرد

عمارتوں میں امتحانوں کے پڑاؤ پڑے تھے اور شرارتوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ بلاک کے دفتر پر بھیڑ لگی تھی۔ تقاوی اور بیسارے کے کاغذات بن رہے تھے۔ اب وہ بھیڑ سے ڈرنے لگا تھا۔ ان کی بے ادب نظروں سے کچلے جانے کے خوف نے اسے ایک گلی میں موڑ دیا، جو کھری اور شاداب آوازوں سے چھلک رہی تھی۔ شور مچاتے زیوروں اور بھڑکدار کپڑوں سے چمک رہی تھی اور ان سب میں شرابور ہوتا اپنے مکان تک گیا جو اس کے آبائی مکان کا حصہ تھا۔ دوسرے حصوں میں ہسپتال ڈاکخانہ اور گورنمنٹ اسٹور تھا۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی تھپکی دی کہ ہسپتال میں انتظار کرتے مریضوں میں سے کوئی جان پہچان والا وقت گذارنے اس کے پاس نہ آجائے۔

پورا گھر جیسے بھونسلے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس نے لانبے پتلے کمرے میں داخل ہو کر پنکھے کا سوئچ آن کیا جو وہاں اجنبی لگ رہا تھا۔ دروازے پر کسی نے آواز دی۔

"مہر دین۔"

اور جب نازو طلاق کے کفن میں لپٹی ہوئی زخمی کلائیوں سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے کے ادھے میں سوار ہوئی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے اس کے قریب گیا۔

"میں تمہارا تمہارے بھائی کو ادا کر دونگا۔"

جواب ملا۔

"وہ اپنی ہونے والی کو میری طرف سے منہ دکھائی میں دید یجئے گا۔" ایک سناٹا سا چھا گیا۔ وجود کے اندر سے باہر تک سب کچھ سنسان ہو گیا۔ نئی دلہن کے خواب میں بال تو اسی وقت پڑ گیا تھا جب اس نے نازو کو آنسوؤں میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا، اس جملے سے چٹخ گیا تھا اور جب اس کی اچانک موت کی اطلاع آئی تو ٹکڑے ہو گیا۔

آج پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔ نازو کے جہیز کی اونچی مسہری کے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا کہ کہیں گر نہ پڑوں اور جب ہاتھ ہٹایا تو بائیں کان کا دُر دامن میں پڑا تھا۔ سونے کے دُر میں بیضاوی موتی دمک رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہا اور داہنا ہاتھ ہمیشہ کیطرح داہنے کان پر لرزتا رہا۔ اس لو میں بھی سوراخ تھا اور اس میں بھی بائیں کان کیطرح دُر چمکا کرتا تھا۔ جس رات وہ کھو گیا تھا۔ کان کی لو کا سوراخ دل میں منتقل ہو گیا۔ ماں نے منت کے دُر اس لئے پہنائے تھے کہ بیٹے نہ جیتے تھے۔ بچپن لڑکیوں کیطرح برتا گیا۔ دوپٹے اوڑھائے گئے۔ گھروندے بنائے گئے۔ ہنڈکلیاں بنائی گئیں۔ گڑیوں کی شادی رچائی

گئیں ۔اور سب کچھ تو بھول گیا،چھوٹ گیا،لیکن کانوں کے دُر شخصیت کا حصہ بن گئے ۔ خدوخال کیطرح وجود میں شامل ہو گئے ۔ وہ نوجوانی میں بھی شوق سے پہنتا رہا ۔ پھر دروازے پر شور سا مچ گیا ۔ باورچی خانے سے بوڑھی عورت نے کوے کیطرح کون کون کی رٹ لگا دی ...... وہ اطمینان سے سوچنے کے لئے خود باہر نکلا ۔ دروازے پر مندر کھڑی تھی ۔ ادھیڑ عمر کی گوری چٹی مندر ! جس کی جوان رانوں میں انھوں نے اپنے بوسوں کے چراغ جلائے تھے ۔

"کیا ہے؟"

"میاں ! آج برات آنے رہی ہے آپ کی بیٹوا کی ۔"

"ہاں ہاں پھر ۔"

"سب انتجام آپ کے ری دعا سے پکا ہے ......مل مسند نا ہن مل رہی ہے ۔"

"مسند ہے تو .....لیکن معلوم نہیں کہاں ہے ۔جب وہ گئیں نہ ضرورت پڑی نہ تلاش کی گئی ۔ تم باہر سے کسی کو بھیجو میں ڈھونڈوا دوں ۔"مندر کے جانے کے بعد اس کے تصور نے فراغت کا سانس لیا۔

برنا پور کی شادی تھی اور اس کی نوجوانی ۔ باپ کی موت کے بعد پہلی بار کسی تقریب میں شرکت کو نکلا تھا ۔ آدھی رات کو کھانا ہوا ۔اور پچھلارے سے دولہا اندر آیا ۔ ٹپوری چلی اور ہنگامہ ہوا ۔

بوڑھی بوڑھی کٹکھنی عورتیں جو بولتے جلوؤں پر بھی کاڑھے بیٹھی تھیں ایک ہی ریلے میں بہہ گئیں ۔

روشنیاں جو دن رہے سے جل رہی تھیں اب سونے لگی تھیں ۔ ۔یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی عمارت کے کئی حصے تاریک ہو چکے تھے ۔ وہ کوئی چیز لینے اپنے کمرے میں آیا جو اندرونی اور بیرونی عمارتوں کے درمیان دوہرے دالانوں میں چھپا کھڑا تھا ۔ وہ دیا سلائی کی روشنی میں لیمپ ڈھونڈ رہا تھا کہ اندرونی عمارت کی صحنچی میں ایک چہرہ چمک اٹھا اور اسطرح کہ دیا سلائی نے اسے جلا دیا ۔ وہ اتنا روشن تھا کہ اگر تھوڑا سا اور قریب آجاتا تو اس کے اپنے کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ رہتی ۔ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی ۔ وہ جیسے جادو کے زور سے کھنچا ہوا چلا گیا ۔ گھاس کے تختوں پر ڈھیر سامان سے بچتا ہوا صحنچی کے سامنے دالان کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا ۔

"میاں سامنے والی کوٹھری میں تو مسند ہے نہیں ۔ کاجی جی صاحب کا بڑا بکس

کھولیں؟"

"ہاں"

صیحنچی اس کے نور سے سنگ مرمر کی بن گئی تھی ۔۔۔۔ سانس پھولنے لگا تھا۔ پہلوؤں میں درد کے نشتر اتر گئے ۔ ار-بی پانجامے کی چوڑیاں پسینے سے بھر گئیں کہ ایک آواز طلوع ہوئی ۔

"آپ"

اور جیسے ہی وہ آگے بڑھا ۔ روشنی ، نور اور رنگ کا ایک پیکر ، ایک ہیولی اس سے ٹکرا گیا ۔ اس پر بکھر گیا ۔ داہنے کان پر کنوال کا تازہ پھول لرز گیا اور اس کا کان اس کے سینے کیطرح خالی ہو گیا اور وہ ایک چھلاوے کیطرح اس کی بانہوں سے نکل گئی اور جب وہ جاگتی آنکھوں کے خواب سے بیدار ہوا تو کمرے میں سپاہی لیمپ جل رہا تھا ۔

"میاں آپ کے داہنے کان کا دُر ۔"

پھر بہت سی روشنیاں صیحنچی دالان اور صحن میں دُر ڈھونڈتی پھریں اور بہت دنوں بعد کسی بنت غم نے اس کے حال پر ترس کھا کر بتلا دیا کہ دیبی پور کی بٹیا نازو سے بیاہ کر لیا ۔ لیکن دیبی پور کی بٹیا نازو نے دلہن بن کر ساری ساری تفتیش کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ میں نے تو وہ صیحنچی دیکھی بھی نہیں اور اسی گھڑی نازو اس کی نگاہ سے گر گئی ۔ خواب جتنا سنگین ہوتا گیا زندہ موجود اور معصوم نازو کی حقیقت اتنی ہی پگھلتی چلی گئی ۔ یہانتک کہ آسودگی اور فراغت سے خواب دیکھنے کی آرزو اور تعبیر کو دوبارہ پالینے کی جستجو میں نازو کو طلاق دے دی گئی ۔

"میاں ! بکس کھل گیا ۔"

میاں چونک کر اٹھے اور خواب میں چلنے لگے ۔ لکڑی کا بڑا سا مٹیالا بکس کھلا پڑا تھا ۔

"اسے کیوں کھول دیا کمبختو؟"

"جی؟"

اب کھول ڈالا ہے تو ڈھونڈو ۔

جازم ، پردے ، توشک ، لحاف ، رضائیاں اور دوشالے نکل نکل کر پھیل گئے ، مگر مسند نہ ملی ۔ پھر ایک چھوٹا سا صندوقچہ نکلا جس میں بڑا سا تالا پڑا تھا ۔ سامان رکھوا کر وہ اپنے کمرے میں آگئے ۔ صندوقچہ کھولا تو چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور گنما کر جاگ اٹھے ۔

گڑیوں کے ننھے منے کپڑے جگر جگر کرنے لگے ۔ سونے کی ٹوٹی ہوئی بالیاں ملیں، جن میں ایک سیں پھول پھنسا ہوا تھا ۔ معلوم نہیں کتنے دنوں بعد وہ پہلی بار تنہائی میں مسکرایا ۔ نازو اور حسین اور قائل ہو گئی ۔ پھر چور خانے سے سونے کا ایک دُر بر آمد ہوا ۔ جس میں بیضوی موتی پڑا تھا ۔ ہاتھ کانپنے لگے ۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا ۔ وہ اگر کھڑے ہوتے تو گر پڑتے ۔ سنبھل کر بیٹھے تو ہاتھ نے کان سے دُر کھینچ لیا، اور اس طرح کہ سارے میں ننھے ننھے خون کے نگینے جڑ گئے ۔ وہ دونوں کو ایک ہتھیلی پر رکھے دیکھتے رہے، دیکھتے رہے ۔ یہاں تک کہ سُن ہو گئے ۔

پرچھائیاں

بہت دور سے کاہی باغوں کے سلسلوں پر گنبدوں کے عمامے اور کلیسوں کی کلغیاں نظر آنے لگتی ہیں ۔ وہ سفید گنبد جس مزار پر رکھا ہوا ہے اس کے پرانے منقش ادھ کھلے دروازے میں ایک کھور کا کھور بوڑھا خادم ڈھیر ہے ۔اس کے سارے بدن پر صرف آنکھیں زندہ ہیں جو بھیک مانگنے والے ہاتھوں کیطرح کھلی ہوئی ہیں ۔مزار کے بائیں طرف پرانی مسجد نئی سفیدی پہنے دوزانو بیٹھی ہوئی ہے ۔ سامنے میدان میں پرانے کاغذوں اور سوکھے پتوں کے علاوہ میلے کچیلے بچے رینگ رہے ہیں جن کی ٹوٹی پھوٹی مائیں مٹی کے ڈھیروں کیطرح ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں ۔ داہنی طرف دور تک پھیلا ہوا ٹوٹا پھوٹا پیلا پیلا مکان ہے جس کے ستونوں، محرابوں، دیواروں، دروازوں اور کھڑکیوں پر چھائی ہوئی نیستی مکینوں کے افلاس کی چغلی کھاتی ہے ۔

"ہال" کی پشت پر ککھوری اینٹوں کی محراب میں ٹاٹ کا پردہ جھول رہا ہے ۔اس کے پیچھے "زنان خانہ" ہے جس کی بدحالی اپنی نام کی تہمت کے نیچے کچلی جارہی ہے ۔ ٹیڑھے دالان میں جس کے کچھ ستون رکوع میں چلے گئے ہیں چھ سات برس کا ریاض تختی لکھ رہا ہے جو ہر جملہ مکمل کرنے پر بڑے زور سے چلاتا ہے اور میاں جو خیر آباد کی باون درگاہوں میں سے ایک بہت بڑی درگاہ کے سجادہ نشین ہونے کی وجہ سے میاں کہے جاتے ہیں اپنے شریر، اکلوتے لاڈلے بیٹے کو چونک کر دیکھ لیتے ہیں اور پھر تعویذ لکھنے لگتے ہیں ان کی انگلیوں پر زرد رنگ کے دھبے ہیں جن کو وہ زعفران کے داغ کہتے ہیں ۔ان کے دبلے پتلے جسم کو میلی بنیائن اور چار خانے کے تہمد نے اور حقیر بنا دیا ہے ۔ خواب دیکھتی ہوئی اداس آنکھوں کے پیچھے سے بے آب سیاہ گول کھردری داڑھی پر زردی مائل سفید بالوں

کی آڑی ترچھی لکیریں کھنچنے لگی ہیں ۔ باورچی خانے سے چپاتیاں پکنے اور ایک ساتھ تین
لڑکیوں کے ریں ریں کرنے کی آوازیں آرہی ہیں ۔ انھوں نے عصر کی نماز کے خیال سے مڑ
کر سورج کو دیکھا جو ان کی ڈوبی ہوئی تقدیر کیطرح ڈوبنے والا تھا ۔ پھر اچانک جیسے ان کے
سارے حواس چمک اٹھے ۔ باہر کسی موٹر کا انجن بند ہوا تھا ۔ وہ المونیم کے لوٹے سے ہاتھوں
کی مٹی دھو رہے تھے کہ ریاض تختی پٹک کر ہارن کی نقل اتارتے ننگے پاؤں باہر بھاگ گیا۔
وہ الگنی سے دھلا ہوا کرتہ اور پانجامہ اتار رہے تھے کہ خادم کی مانوس آواز نے مژدہ سنا دیا
جس کے انتظار میں ان کی سماعت بوڑھی ہونے لگی تھی ۔

"کوئی بیگم صاحبہ چادر چڑھانے آئی ہیں ۔"

"اچھا ______ اچھا آیا"

سال میں کبھی کبھار ملنے والی بھاری نذر کی امید نے ان کی آواز پہ زندگی کی قلعی
کر دی تھی ۔ وہ گریبان کی بیل کی شکنیں مٹا رہے تھے کہ ریاض اپنا بستہ اور تختی لے کر ان
کے پاس سے گذرتے ہوئے اس طرح ٹکرایا کہ سارا پانجامہ کیچڑ میں لت پت ہو گیا ۔ انھوں
نے اپنے چہیتے کو گھور کر دیکھا اور ساتھ ہی ریاض کی پیٹھ پہ چوڑیوں سے بھرے ہاتھ کا
دھموکا چھنک پڑا ۔ معلوم نہیں کب اور کسطرح سے رضو آ گئی تھی ۔ رضو ان کی بیوی ۔ بہت
دنوں بعد آج انھوں نے اپنی بیوی کو دیکھا جو ایک چارہ کاٹنے والی مشین کیطرح کشادہ اور
مضبوط تھی جو دن رات تمبا کو پھانکا کرتی اور گالیاں تھوکا کرتی ۔ وہ اس کی تیوریوں کے
مستقل بل دیکھ رہے تھے ۔ تمبا کو سے نم سیاہ چلتا ہوا منہ دیکھ رہے تھے ۔ خودرو بیل کی طرح
پھیلے ہوئے جسم کو دیکھ رہے تھے جس نے اس کے ہزاروں دن اور ہزاروں راتیں کاٹ کر
پھینک دی تھیں ۔

"اسے کیوں مارتی ہو ------ میں اپنے کپڑے خود دھو لونگا ۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے باہر آئے ۔ مزار شریف کی کرسی کے نیچے ایک
بوڑھی عورت سوٹ کیس کے پاس اکڑوں بیٹھی تھی ۔ اس کے پاس ایک پوری پکی بلند و
بالا عورت سفید ساری پہ سیاہ برقعہ پہنے انھیں آتا ہوا دیکھ رہی تھی ۔ ان کے قدم آپ ہی آپ
لڑکھڑانے لگے ۔ انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے، بھکتے بند کواڑوں سے پھاٹک کے
پاس کھڑی ہوئی ٹیکسی کو دیکھ لیا جس کے قریب ٹہلتا ہوا ڈرائیور بیڑی پی رہا تھا ۔

"تسلیم"

"جیتی رہئے ----- آپ کہاں سے ؟۔"

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں !"

اور نقاب الٹ گیا ۔ جیسے برسوں کے بھاری بھاری پردوں کے پیچھے سے جگمگاتا ہوا شاداب ماضی نکل آیا ہو ۔

"تم"

"قمر --------ہوں ۔"

"ہاں -----سچ مچ ----- قمر ہی ہو ۔"

ایک دوسرے کو دیکھتے ہی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں ۔ پھر وہ ہوش میں آ گئے ۔

"آؤ ۔"

وہ مزار کے قبے کے چاروں گوشوں پر بنے ہوئے حجروں میں سے ایک میں داخل ہو گئے ۔ میلی چاندنی پر کھڑے ہوئے ایک دوسرے کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگے ۔ قمر اپنا برقعہ اتارنے لگی ۔

"شادی کے بعد آج پہلی بار درگاہ شریف پر حاضری کی وجہ سے برقعہ پہنا ہے ۔ بمبئی میں برقعہ کہاں ؟"

"کتنے دنوں بعد دیکھا ہے تمہیں ؟"

"اٹھارہ برس بعد"

"اٹھارہ برس !اٹھارہ برس میں تو لڑکے جوان ہو جاتے ہیں ،جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں ،بوڑھے مر جاتے ہیں اور ہم تو ----- تم نے پہچان کیسے لیا؟"

"جی؟"

تم نے تو سترہ اٹھارہ سال کے گورے چٹے خوبصورت چونچال سے لڑکے کو دیکھا تھا ۔اس کھچڑی داڑھی والے دبلے پتلے کھوسٹ آدمی کو کہاں دیکھا تھا ۔ کیسے پہچان لیا ۔

"آپ اچھے تو ہیں"

اس نے گھبرا کر موضوع بدل دیا ۔

کتنا معلوم لیکن کتنا عجیب سوال ہے ۔اگر زندگی کئے جانے کا نام اچھا ہوتا ہے تو ہم یقیناً اچھے ہیں ۔بالکل اچھے ہیں ۔

".بھابی جان کیسی ہیں ؟"

اس نے پناہ ڈھونڈی ۔

"ہاں ------وہ سچ مچ اچھی ہیں ۔"

" کتنے بچے ہیں ماشے اللہ سے ؟"

"تم ہی سب پوچھ ڈالو گی یا مجھے بھی کچھ بتلاؤ گی ۔ تمہارے شوہر کیسے ہیں ۔ کہاں ہیں ؟ تم خیریت سے تو ہو ؟ -----یہ آج اچانک کیسے آ گئیں ؟"

برسوں کا تھکا ہوا جسم اعصاب کی جھنجھناہٹ کو برداشت نہ کر پایا اور تکیے کا سہارا لے لیا ۔

"وہ تو اچھے ہیں -----میں بد نصیب ہوں ۔"

" کیا ہوا"

پہلی بار قریب سے آواز آئی

" کچھ ہوا ہی تو نہیں -----یہی تو غم ہے ۔"

اب اس نے بھی دیوار سے پیٹھ لگائی ۔

آپ تو جانتے ہیں انھوں نے دوسری شادی اولاد کے لیے کی تھی ۔ میرے گیارہ بھائی بہن جو تھے اور اب کسی کو گود لینا چاہتے ہیں وارث بنانا چاہتے ہیں ۔ وہ لیں یا میں لوں رہے گا تو وہ پرایا ہی ۔ میرا اپنا خون تو نہ ہو گا ۔

"ہوں"

اس درگاہ سے ایک جہان جھولیاں بھر بھر کرلے جاتا ہے کیا میں ہی تمام عمر سلگتی رہوں ۔ تمام زندگی جلتی رہوں ۔ کچھ کیجئے میرے لیے ۔ دعا کیجئے ۔

"ہاں ہاں ----- کیوں نہیں -----چلو مزار شریف چلو"

پھر اسی حجرے کی دروازے سے انھوں نے دیکھا کہ ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگی ہیں ۔ پھر چاندنی میلی ہوگئی ۔ پرندوں کے شور سے ساری فضا کھنکنے لگی ۔ دور سے چکیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں لیکن حجرے کی دیواروں پر اب بھی قمر کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں ۔ عرس میں ہنگامہ مچاتی ہوئی پرچھائیاں ـــــــــ نقلیں اتارتی ہوئی پرچھائیاں ، مشہور قوالوں کی لے میں قوالی میں گاتی پرچھائیاں لنگر لوٹتی اور سبیل تقسیم کرتی ہوئی پرچھائیاں ۔ کانپتی راتوں میں کہانیاں سنتی اور سناتی ہوئی پرچھائیاں ۔ کھرنی کے درختوں کے کنج میں کلیلیں کرتی ، چاندنی راتوں میں نعت پڑھتی ہوئی اور مزار شریف کی جالیوں کے پاس اداس

بیٹھی ہوئی پرچھائیاں ۔ان کو چھیڑتی ہوئی ان سے روٹھتی ہوئی ان کو مناتی ہوئی پرچھائیاں سال بہ سال مختلف ہوتی ہوئی پرچھائیاں ۔ خودبین و خود آرا ہوتی ہوئی پرچھائیاں بے نیاز بے محابا اور بے پناہ ہوتی ہوئی پرچھائیاں ۔ پرچھائیوں کا ایک شہر تھا جو حجرے کی دیواروں پر آباد تھا ۔ انھوں نے آنکھوں میں تیرتے ہوئے خوابوں کو رخصت کردیا ۔ جسم کی ایک ایک خواہش سے اپنے آپ کو جدا کرلیا اور اپنے فیصلے پر غور کیا ۔ مزار شریف کا دروازہ کھولا ۔ پوری پرسوز آواز میں فاتحہ پڑھا آیتوں کے آہنگ اور الفاظ کے پیچ و تاب میں اپنے آپ کو شرابور کرلیا ۔ اندر آئے رضوا ایک لڑکی کو آنکھیں بند کیے دودھ پلا رہی تھی اور دوسری کو تھپک رہی تھی ، غسل خانے کے پردے پر بوڑھی عورت بیٹھی تھی اور اندر سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی ۔انھوں نے قریب جا کر کہا۔

"قمر بی بی نہا کر نکل لیں تو انھیں مزار شریف پر لے آنا۔"

اور ہمیشہ کیطرح ریاض کو جگا کر ،بہلا کر باہر چلے آئے ۔

قمر بی بی حجرے میں آئیں تو جیسے روشنی ہو گئی ۔سب کچھ معطر ہو گیا۔زندہ ہوگیا ۔ انھوں نے آنکھیں جھکالیں ۔ قمر بی بی گھبرا کر ریاض کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں جو رحل پر قرآن شریف کھولے جھوم رہا تھا۔

" کیسا ذہین بچہ ہے"

"ہاں بیٹے تم مزار شریف پر جھاڑو دے آؤ۔"

ریاض نے قرآن شریف بند کیا۔ان کو میڑھی میڑھی نظروں سے دیکھا اور چلا گیا

"قمر"

"جی"

"میں تم کو جس روپ میں دیکھنا چاہتا تھا اس روپ میں نہ دیکھ سکا ۔ دس بارہ سال کی عمر سے جہاں سے میں نے تمہیں دیکھا ہے آج تک میری آنکھوں کے ہر خواب پر تمہارا ہی نام لکھا ہوا ہے صرف تمہارا نام ۔ آج تم اٹھارہ برس بعد آئی ہو ۔ میری سجادہ نشینی کے زمانے میں پہلی بار آئی ہو ۔ کچھ مانگنے آئی ہو ۔ جو کچھ مانگ رہی ہو وہ میرے اختیار میں نہیں ہے اور میرے اختیار میں یہ بھی نہیں ہے کہ تم کو خالی ہاتھ واپس بھیج دوں ۔ محرومیوں اور ناکامیوں کے وہ تمام داغ جن سے میرا سینہ آباد ہے اس تعلق سے دھل جائیں گے کہ تم میری ،بیوی نہ سہی میرے اکلوتے بیٹے کی ماں تو ہو۔"

"جی"

"ہاں میں نے تمہیں ریاض دے دیا"

"آؤ" انھوں نے قمر کا سفید گداز لیکن برف جیسا ٹھنڈا بازو پکڑلیا۔ وہ ان کے سہارے رینگتی ہوئی مزار شریف میں داخل ہو گئی جیسے وہ سجدے میں گری انھوں نے ریاض کو بھی اس کے پہلو میں جھکا دیا اور قبر مبارک کا غلاف ان کے سروں پر ڈال دیا۔

———— * ————

ماڈل ٹاؤن

کانٹے دار تاروں کی گھنی باڑھ دیکھ کر راستہ بھول جانے کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا "ڈی بلاک" کی یکساں یکرنگ چہار منزلہ عمارتوں کا جنگل کھڑا تھا۔ دروازوں دریچوں اور بالکنیوں میں کھڑے ہوئے بچے دور سے رنگ برنگ پھولوں کے گچھوں کے مانند نظر آرہے تھے۔ وہ آدھی عمارت کا چکر کاٹ کر سڑک پر آگیا۔ بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی مسافروں کی لمبی قطار دیکھ کر اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی کہ دو مہینے ہو گئے سڑک ناپتے ہوئے لیکن راستوں کا سبق یاد نہ ہوا۔ بس نظر آتے ہی ٹیڑھی میڑھی لکیر اکہری دوہری اور پھر تہری ہو گئی۔ انسانوں کا ایک سیلاب اترنے والوں کو دھکیلتا ہوا دروازے میں دھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مٹھیاں بند ہو گئیں اور ہونٹ بھینچ گئے۔ جب ہوش آیا تو وہ بس کے اندر تھا۔ نگاہ سیٹ کی تلاش میں جھپٹ رہی تھی کہ کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ قلم اور چشمے سے مطمئن ہو کر پہلو میں بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ انجن کے شور سے پس منظر میں اس نے اپنی آواز سنی۔ ارے آپ؟ ------ ریاض بھائی

اور سڑک پر بھاگتی ہوئی بسوں کیطرح اس کے ذہن میں خیالات اڑنے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی غزالہ کو دیکھ کر اور پسند کر کے واپس آرہا تھا کہ کسی نے اس کے کان میں کہا۔ "غزالہ کی شادی اس کے ماموں اعجاز صاحب ایم۔پی سے کر رہے ہیں۔"

"تو آپ نے پہچان ہی لیا ----- ورنہ"

اور جہیز میں تم کو چار سو روپے کی نوکری دے رہے ہیں اور یہ پاپڑ وہ اس لیے بیل رہے ہیں کہ غزالہ ان کے گھر میں رہتی ہے جو ان کی بیوہ بہن کی بیٹی اور ضدی بیٹے ریاض کی محبوبہ ہے۔ غزالہ اکیلی ڈولی میں سوار نہ ہو گی۔

"دلی میں تو لوگ آنکھوں سے پہچان لیتے ہیں لیکن زبان سے اجنبی بن جاتے ہیں۔
غزالہ کے ساتھ اس کی ماں کے سر کا پہاڑ اور اعجاز صاحب کے دل کا بوجھ بھی کوٹھی سے نکل کر ڈولی میں بیٹھ جائے گا۔
"آپ کب تشریف لائے؟"
اور ریاض کی شادی کے راستے پر کھڑا ہوا آہنی پھاٹک آپ ہی آپ کھل جائے گا۔ اس نے بھاری بھر کم اور گوری چٹی غزالہ کو گھور کر دیکھا تو اس کے گالوں پر ریاض بھائی کے ہونٹوں کی مہریں لو دینے لگیں۔ کمر پر ریاض بھائی کی باہوں کے نشان ابھر آئے۔
"میں تو کئی روز سے یہاں ہوں۔"
لیکن جیب کی بیماری سے نجات پانے کے لئے اس نے غزالہ کو قبول کر لیا۔ مسلسل بے کاری سے نجات پانے کے لئے اس نے شادی کر لی۔ کڑوی کسیلی دوا کا لبریز پیالہ آنکھیں بند کر کے نگل گیا۔
"کہاں قیام ہے آپ کا؟"
پھر اعجاز صاحب کی سفارش نے اسے دو کمروں کا فلیٹ بھی دلا دیا۔ جس دن اس کو فلیٹ ملا اسی کے چند روز بعد غزالہ کو لے آیا۔
"یہیں ماڈل ٹاون میں!"
پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے غزالہ کو دہلی آئے اور
"اچھا"
اور ریاض بھائی بے قرار ہو گئے۔ بے چین ہو گئے۔
شام کو پانچ بجے آپ ریگل کے سامنے مل رہے ہیں۔
"جی"
"ایک دھچکے کے ساتھ بس رک گئی۔ ریاض بھائی کھڑے ہو گئے اور مسافروں کی رینگتی ہوئی قطار میں گم ہوتے ہوتے چیخے۔ آج پانچ بجے ریگل کے سامنے۔"
آفس سے نکلتے ہوئے اس نے تیواری سے دس روپے قرض مانگ لیے۔ دس بارہ اس کی جیب میں پہلے سے پڑے تھے۔ وہ آسودہ قدم اٹھاتا ہوا ریگل ناکیز کے سامنے آ گیا۔ گھڑی پر نگاہ کی پانچ بج رہے تھے۔ سارے منظر پر دھند کا باریک نقاب پڑا تھا۔ تیز ہوا کی ٹھنڈک کپڑوں سے چھنتی ہوئی ہڈیوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے نئے گرم

کوٹ کا کالر کھڑا کر لیا کلائیوں تک ہاتھ جیبوں میں ڈبو لیے ۔ سامنے آدمیوں کا چوکھا دریا بہہ رہا تھا ۔ سب اسی طرح آگے پیچھے بھاگ رہے تھے جیسے سب کو آخری گاڑی پکڑنا ہو اور دیر ہو چکی ہو جیسے شکاریوں کو دیکھ کر سرمائی پرندے کے پرے جھیل پر اترنے کا ارادہ ملتوی کر دیں اور سنسناتے ہوئے نکل جائیں ۔ اینٹیں ڈھونے والے ٹھیلیوں کیطرح زندگیوں سے بھری ہوئی بسیں گذرتی رہیں ۔ ریل گاڑی کے ڈبوں کیطرح ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے موٹروں کی قطاروں کے درمیان سے لوگ ایسے نکل رہے تھے جیسے ہاکی کا کھلاڑی دشمن ٹیم کو ڈاج دیتا ہوا گول تک پہنچتا ہے ۔

اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور چونک پڑا ۔ چھ بج چکے تھے اور آوازوں کا سناٹا گہرا ہو گیا تھا ۔ روشنیوں کا سیلاب چڑھ آیا تھا ۔ اور وہ ریاض بھائی کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا ۔ اس نے سوچا ریاض بھائی سنیما دیکھنا چاہتے ہونگے ورنہ ریگل کی شرط کیوں لگاتے ۔ اگر اس نے ٹکٹ نہ خریدا تو ریاض بھائی اس کو ۔۔۔۔۔۔ غزالہ کے شوہر کو مفلس خیال کریں گے ۔ کنجوس سمجھیں گے ۔ یہ خیال آتے ہی وہ لپکتا ہوا بکنگ ونڈو کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اس شو کا آخری ٹکٹ خریدا اور فلم شروع ہونے کے بعد ہال میں داخل ہوا ۔

"جن من گن" کے شروع ہوتے ہی وہ ہال کے باہر آ گیا ۔ آسمانی سوٹ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈھونڈتا رہا ۔ جب تیسرے شو کی گھنٹی بج گئی تب وہ ریگل کے باہر نکلا دھند کے بھاری نقاب کے پیچھے ٹمٹاتی روشنیاں کتنی اداس اور بیمار نظر آ رہی تھیں ۔ سماعت کے چیتھڑے اڑا ڈالنے والے شور میں کیسی دلدوز خاموشی پنہاں تھی ۔ اور اس وقت اس کے چلو سے قطرہ قطرہ ٹپکے جا رہا تھا اور وہ بس اسٹینڈ کیطرف بھاگ رہا تھا ۔

بس آ گئی "کیو ٹوٹ کر ڈبلیو" بن گیا ۔ اس نے بھی اپنے آپ کو بھیڑ میں دھانس دیا ۔ پائدان پر پاؤں رکھتے ہی احتیاط کے طور پر کنڈکٹر سے پوچھا ۔

"یہ کس نمبر کی بس ہے ۔"

"آپ کو کہاں جانا ہے ؟"

کنڈکٹر نے سوال پر سوال جڑ دیا ۔

"ماڈل ٹاون ۔"

"تو پیسے نکالو"

اس نے پانچ کا نوٹ پکڑا دیا ۔

کنڈ کٹر نے بہت سی ریزگاری کے بوجھ سے چرمرایا ہوا ٹکٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے مٹھی کو سنبھال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں الٹ دیا اور پیچھے سے دھکا کھا کر بغیر ارادے کے آگے بڑھ گیا۔ پھر گوشت کی دیواروں میں پھنس گیا۔ بس ہلتی رہی۔ بڑی دیر تک ہلتی رہی۔ جتنے مسافر اترے ان سے زیادہ چڑھتے رہے اور وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح آگے پیچھے ہوتا رہا۔ پھر کنڈ کٹر نے صدا لگائی جس کے انتظار میں وہ بوڑھا ہوا جا رہا تھا

"ماڈل ٹاون"

وہ دھکے کھاتا اور کھلاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کہر کے سمندر میں پھاند پڑا۔ سفید دھواں سا انگڑائیاں لے رہا تھا اور کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ سڑک کی روشنیاں پکڑے ہوئے جگنوؤں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ کڑھتا ہوا آگے بڑھا۔ اپنے اطمینان کے لیے ایک شخص سے پوچھنے لگا۔

"بھائی صاحب یہ ماڈل ٹاون ہے؟"

"ہاں ہاں آپ کو کہاں جانا ہے"

"ڈی بلاک"

تو آگے جا کر داہنے ہاتھ گھوم جائیں۔

وہ خوش ہو کر کہرے کے سمندر میں تیرنے لگا۔ پھر وہ پٹرول ٹنکی آ گئی جس کی پشت سے اس کے بلاک کو راستہ جاتا تھا۔ پھر لوہے کا پھاٹک بھی آ گیا۔ اب دھند کی چادر مہین ہو گئی تھی آب رواں کے مانند۔ اور وہ چہار منزلہ عمارت کے صحن میں تھا۔ اس نے پہلا زینہ چھوڑ دیا۔ دوسرا زینہ آیا اس کے پاس ہی سفیدی کا ڈرم پڑا تھا۔

وہ گھر پہنچنے کی خوشی سے چھلک اٹھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ چوتھے دروازے پر استھانہ صاحب کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اپنے دروازے کے سامنے پہنچتے ہی اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔

ایک پٹ آدھے سے زیادہ کھلا ہوا تھا۔ برآمدے کا بلب روشن تھا۔ اور نل کے نیچے ریاض بھائی کھڑے تھے آسمانی سوٹ پہنے اس کی طرف پشت کئے ہاتھ دھو رہے تھے۔ پاس ہی کچن میں غزالہ اسٹو کے سامنے کھڑی تھی۔ سرخ شال کے دونوں کنارے اس کی پیٹھ پر برابر سے پڑے تھے۔ آٹا پیسنے والے انجن کی طرح اسٹو دھڑ دھڑا رہا تھا اور غزالہ کا سفید تندرست ہاتھ فرائی پان میں چمچہ چلا رہا تھا۔ لاہی رنگ کی اسی ساری میں وہ صبح چھوڑ گیا تھا۔ اور

جیسے اس کے پیروں میں کسی نے کیلیں ٹھونک دیں۔ وہ جم کر رہ گیا۔ پھر ریاض بھائی نے نل پر پڑی ہوئی نیلی تولیہ اٹھائی اور منہ پونچھتے کچن میں گئے اور غزالہ کے بھاری کولہے پر ایک دھپ لگادی۔ اب وہ برداشت نہ کر سکا اور تیز تیز قدم رکھتا ہوا زینے پر آ گیا۔

"تو یہ ہیں ------ ریاض بھائی"

سستے رومانی ناولوں کے ہیرو

"مجھے ریگل بلا لیا تاکہ میں دفتر سے گھر نہ آسکوں۔ ان کا انتظار کرتے کرتے فلم دیکھنے لگوں اور وہ فلم کے ہیرو کا پاٹ ادا کریں۔"

"اور غزالہ"

"غزالہ بھی ہیروئن ہوئی ---- تو گویا کہ میں رقیب ہوں۔"

"بچپن کی محبت پتھر کی لکیر ہوتی ہے میرے بھائی ---- تم تو غزالہ کے قانونی داشتہ ہو۔ تمہارے ہونٹوں پر چار سو روپے ماہوار کی مہر لگی ہوئی ہے۔"

"لیکن یہ دروازہ؟"

"جرم کا بھانڈا تو آخر کسی طرح پھوٹنا ہی چاہئے تھا۔"

"یا جھوٹی گندی معصومیت کے لنگڑے اظہار کے لیے اب کھول دیا ہو۔"

"اچھی بات ہے۔"

اس نے اپنی باقاعدہ تلاشی لی۔ لیکن اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ہاتھ کی چھڑی تک نہ تھی۔ اگر چاقو مجھے مل جاتا تو اس ڈرامے کو انجام تک پہنچا دیتا۔

"اب میں کیا کروں"

"کیا کر سکتا ہوں آخر"

"تم یہیں کھڑے رہو وہ اسی طرف آنے گا۔ اس کو زینے پر سے دھکا دے سکتے ہو۔" پھر اس نے دیکھا کہ ریاض بھائی کا سر پھٹ گیا ہو اور وہ خون میں لت پت فرش پر ڈھیر ہوں۔ اس نے اپنے دل کے زخم میں ٹھنڈک محسوس کی۔ پھر زینے پر قدموں کی چاپ ہوئی کوئی سیڑھیاں چڑھتا اسی طرف آرہا تھا۔ اس نے سانس روک لی اور پرچھائیں کیطرح دیوار سے چمٹ گیا۔ آنے والا پہلے ٹھٹکا پھر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"کون؟"

"تم کون ہو؟"

"جی ------ م ------- میں"

موٹے موٹے رسوں کیطرح دو بانہیں اس کی کمر سے لپٹ گئیں۔ پھر جیسے دیواریں توڑ کر آدمی نکل آئے کھڑکیوں اور دروازوں سے انسان ابلنے لگے اور وہ آوازوں کے زہریلے آبشار میں شرابور ہو گیا دھار دار آوازوں کے زخموں سے لہو لہان ہو گیا۔ اب وہ روشنی کی چادر کے نیچے کھڑا تھا۔ کئی جوڑ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ آوازیں اپنی گذشتہ چوریوں کی تفصیل سنا رہی تھیں آوازیں اس کو شناخت کرنے کا دعویٰ کر رہی تھیں اور آوازیں ایک ساتھ اس سے متضاد سوالات کر رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنی گڑ گڑاتی ہوئی آواز سنی۔

"یہ ۱۱ / ۲ فلیٹ میرا ہے ----- اس میں میری بیوی موجود ہے۔"

"ابے پاگل ہو گیا ہے ----- اس میں تو میں رہتا ہوں۔"

اس نے تڑپ کر دیکھا ایک آدمی آسمانی سوٹ پہنے گالیاں برساتی آنکھیں کھوئے اس کو سارا سموچا نگل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مردوں کے غول کے پیچھے ایک بھاری بھر کم گوری چٹی عورت لاہی رنگ کی ساری باندھے اور سرخ شال اوڑھے پلکیں جھپکا رہی تھی۔ تحیر اور بے بسی کا فوارہ اس کے منہ سے پھوٹ پڑا۔

"یہ ماڈل ٹاون نہیں ہے؟"

"ہے"

"لیکن کون سا ماڈل ٹاون"

"ماڈل ٹاؤن کیمپ!" ______ نہیں یہ ماڈل ٹاؤن کینٹ ہے۔"

اس نے گڑ گڑا کر اپنا آفس بیگ اس بوڑھے آدمی کے قدموں میں ڈال دیا جس کی آواز مہربانی کے صیقل سے روشن تھی۔

______ * ______

تحریک

تحریک بیگم ادب کے گول کمرے میں تنقید کے صوفے پر سگار کے دھوئیں کے چھلے بنا رہی تھیں۔ کمرے کا فرش آٹھ آٹھ کالم کی سرخیوں کے قالینوں سے آراستہ تھا۔ موٹے موٹے خاص نمبروں کی دیواریں قلمکار شیشے کے مانند چمک رہی تھیں۔ ان پر پیدا ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کی قد آدم تصویریں سنہری فریموں میں جگمگا رہی تھیں جن کے پیروں میں دو دو فٹ کے بانس بندھے تھے اور سروں پر گھڑے کے برابر "دستار ہائے فضیلت" لدی ہوئی تھیں۔ ماہناموں کی بوقلموں چھت پر اندھے خیالوں کے فانوس جھول رہے رہے۔ بیگم پیترے کی جھل مل کرتی ساری باندھے کسی نئے شوشے پر غور کر رہی تھیں کہ ان کے لاڈلے "لیے پالک" للو میاں منہ میں چچوڑا دبائے گلے میں چسنی اپنے ہاتھ میں جھنجھنا لیے ٹھنکتے ہوئے آئے۔

"امی ------ امی"

"اے میں صدقے جاؤں امی کہنے والے منہ پر"

"ہم میلے جائیں گے ----- ہاں۔"

"میلے میں؟ ------ میلہ کہاں ہے میرے لال؟"

"ہے۔ ابھی ایک آدمی تانگے پر بیٹھا بھونپو میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔"

تحریک بیگم کی بھٹنی کرنے والے ایک شاعر نے جن کا تخلص یا قلمی نام اسم نگار شعلہ تھا، تمباکو کا پاوچ بند کر کے اور منہ کھول کر بولے۔

"یہ مشاعرے کو میلہ کہہ رہے ہیں۔ آج مشاعرہ ہے نا جھنڈے والے پارک میں۔

"اب اگر تم نہ ہوتے اس وقت تو بچہ بچارہ کیسا جی مسوس کر رہ جاتا۔"

روزنامہ-----اے روزنامہ-----کہاں الوپ ہو جاتی ہو جا کر-----موئی بالکل "ماہنامہ "ہو رہی ہو کہ چاندرات کی چاندرات صورت دکھائی پڑ جاتی ہے۔

" کچھ فرمائیے تو بی بی میں آنکھوں کے نیچے کھڑی ہوں اور آپ ہیں کہ اچھا بھلا دوغزلے کا دوغزلہ کھینچ مارا"

"ذرا اس کو بلاؤ مرتب علی کو آخر کس مرض کی دوا ہے۔"

ان کو تو آپ نے فرنگی کوچے سے حقے کے لیے میاں تحقیق کا خمیرہ لینے بھیجا ہے۔اے لو شیطان کا نام زبان پہ آیا اور شیطان حاضر----بڑی عمر پائی ہے میاں مرتب علی نے۔

"عمر----اے کی قسم یہ عمر آ گئی۔مگر ایسا تماشانہ دیکھا تھا۔فرنگی کوچہ بھی مچھلی بازار ہو گیا ہے۔کالج کے لونڈے تک قفلیاں کندھے پہ لادے خمیرہ خریدنے دراتے چلے آتے ہیں۔بڑی مشکلوں سے دو چار چلموں کا چکا کر لایا ہوں۔"

"یہ تم پلاسٹک کے دیدے کھوئے مجھے کیا گھورے جا رہے ہو مرتب علی۔"

برا نہ مانیے بیگم تو ایک بات پوچھوں۔

"مقرر پوچھو

"آپ کی عمر کیا ہو گی"

"اے کیا تجھے روٹیاں لگی ہیں مردے----بھونکتا ہے عمر کیا ہو گی۔اونہ----میری عمر ہے وہی مرزا شوق کی مثنوی والی۔"

"آپ تو بیگم واللہ انگارے اگلتی ہیں۔میں نے اس لیے پوچھ لیا تھا کہ آج ان عنبریں لٹوں میں چاندی کا تار چمکتا دکھائی دے گیا۔"

عمر پوچھو جا کے اپنی ہونے سونے والیوں کی--------چلو اب دفعان ہو۔یہاں سے میں للو میاں کی کنگھی کرنے جا رہی ہوں۔ارے ہاں تم ذرا ہاتھ کے ہاتھ ایک غزل گھسیٹ ڈالو۔للو میاں اللہ رکھے آج مشاعرہ پڑھیں گے۔

"مشاعرہ"

"تم نے تو ایسے تو بڑہ کھول دیا جیسے مشاعرہ کوئی جدید نظم ہے کہ لاکھ کھوپڑی پیٹو سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ارے وہ خدا گیا ہے۔تھوڑی دیر کے لیے بھیج دونگی۔آخر شہر بھر کے گانے بجانے والے پہنچیں گے کہ نہیں؟ ایک للو میاں کے جانے سے کون سا قہر

ٹوٹ پڑے گا مشاعرے کی جان پر۔"

"لیکن میں تو خالی مقدمہ لکھتا ہوں ----- غزل وزل تو۔"

"اور جو سیروں غزلیں ٹانک ٹانک کر ردی کی دوکان پر تولادیں وہ کیا جبریل لکھوانے آئے تھے۔"

"وہ میری تھوڑی تھیں مشاعروں کے مسودے تھے جو ضرور تاً نکالنا پڑے۔"

"اچھا تو نخاص لپکے چلے جاؤ کسی مادر زاد شاعر کے آگے چونی پھینکو اور گرما گرم لکھوالاؤ۔"

"اب آپ نے لاکھ شعروں کا ایک شعر کہا ابھی گردے صاحب کو دبوچتا ہوں۔"

میاں مرتب علی دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے زینے سے اترے اور چوک کی میڑھی میڑھی کھانستی کھنکارتی گلیوں میں ہوتے ہوئے ایک کرم خوردہ دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ جس کی دہلیز کے برابر بچوں کے چھوٹے چھوٹے قدمچے منھ کھولے بیٹھے تھے۔ انھوں نے سر نکالنے کے لیے گلا صاف کیا اور ترنم ریز ہوئے۔

"اجی ------ حضرت گردے صاحب تشریف رکھتے ہیں۔"

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے رینگتی ہوئی نسوانی سرگوشیاں تھم گئیں اور قدموں کی چاپ کے ساتھ کڑوی آواز آئی۔

"ادھر چلمن کے سامنے طلوع ہو آ کر"

مرتب علی بچوں کیطرح پٹر پٹر چلتے ہوئے بازو کی خستہ دیوار میں اٹکے ہوئے دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ دوبادامی گلکتیا جوتیوں کی نوکیں چلمن سے جھانک رہی تھیں۔

"اب پھوٹیے۔"

"آداب بجالاتا ہوں۔"

"جیتے رہو"

"بندے نے عرض کیا کہ گردے صاحب۔"

"یہ شریفوں کا گھر ہے کہ قصائی کی دکان ------- کون گانجر وطن شریف ہے حضور کا ------ اونہ گردے صاحب"

"میں"

"قلعی گر کی دو کان ادھر ہے پڑوس میں۔ ذرا تاملوٹ بنوا لیجئے جا کر۔"

مرتب علی جان لیکر بھاگنے کو تھے کہ سامنے سے رضائی کی وضع کی شیروانی پہنے اس پر سموسے کیطرح سوتی زرد پھولدار رومال ڈالے سڑک کو پیکوں سے لالہ زار کرتے گردے صاحب نظر آئے۔ مرتب علی کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔

"بندگی عرض کرتا ہوں غریب پرور"

"آداب عرض، آداب عرض گردہ صاحب۔"

"میں نے عرض کیا کہ آج آپ ادھر بے وقت کیسے بھول پڑے۔"

"ارے بھئی وہ بیگم نے بھیجا ہے آپ کے پاس۔"

"یعنی آپ خود نہیں آئے ہیں بلکہ باندھے ہوئے لائے گئے ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو زحمت کا سبب میں بیان کر دوں۔"

"فرمائیے"

"بیگم کا وہ جو یار غار ہے کیا نام ہے اس بھلے مانس کا جس کی وکٹوریہ اسٹریٹ پہ پان کی دو کان ہے۔"

"نقاد مرزا"

"ہاں نقاد مرزا۔ ہاں آجکل اس بے چارے کا بازار مندا چل رہا ہے۔ اس لیے بیگم کچھ عظیم شعرا کا انتخاب چھپوانا چاہتی ہیں تاکہ وہ مقدمہ وغیرہ لکھ لکھا کر کچھ کما کھائے۔"

"جی نہیں ---------- آپ نہیں سمجھے"

"واللہ ---------- تو ایک موقعہ اور"

"بوجھئے"

"للو میاں کا ختنہ ہوگا اور شہر کے ڈوم داڑھی سہالک کرنے گئے ہونگے تو بیگم نے آل انڈیا مشاعرے کی سوچی ہوگی اور خاکسار کو یاد فرمائی کی عزت افزائی۔"

"یہ بھی نہیں جناب گردہ صاحب"

"تو پھر آپ ہی لیجئے۔"

"ایک عدد غزل کی ضرورت ہے للو میاں کے لیے"

"غزل ---------- للو میاں کے لیے۔"

"جی ہاں غزل اور"

"آج ہی"

"جی نہیں ۔ابھی ۔اسی وقت"

"واللہ یہ تو ہفتوں طے کرنا ہے"

"تو طے کر ڈالیے جلدی سے"

"چٹکی بجاتے طے کرتا ہے ۔بیگم بھی کیا یاد کریں گی کہ کس ملک الشعر اسے سابقہ پڑا تھا ۔لیکن ایک زحمت کیجئے"

"وہ بھی کہہ ڈالیے"

"ذرا ایک عدد بیڑی نکال کر سلگا دیجئے ۔"

"بیڑی"

"جی ہاں -----بیڑی -----وہ جو اپنا صحت خانہ ہے بغیر بیڑی جان کے جیل خانہ معلوم ہوتا ہے ۔"

"خیر -----بیڑی لے لیجئے خوشبو بدبو کا خیال رکھئے گا ۔"

"آپ مطمئن رہیں"

"میں نے کہا بیگم حضور کہاں ہیں ،غزل بنوالایا ہوں ۔"

"تو صور کیوں پھونکے دے رہے ہو ۔ باورچی خانے میں نقاد مرزا چلم بھر رہے ہیں انھیں لے کر اوپر آجاؤ ۔"

"نقاد مرزا"

"فرمائیے"

"ذرا مشق کرادیجئے بچے کو ۔سنا ہے براڈ کاسٹ بھی ہو گا ۔"

"براڈ کاسٹ بھی ہو گا ۔یہ بری خبر سنائی آپ نے ۔"

"کیوں"

"ریڈیو والے گنگری اور انترے پر ایسا لٹو ہیں کہ نماز بھی جہنم میں ادا کرتے ہیں"۔

"یہ کون سی مصیبت ہے ۔موسیقی تو لونڈی ہے للو میاں کے گھر کی ۔ آپ شین قاف دیکھنے میں راگ اجالتی ہوں ۔"

ریاض کرتے کرتے جب وقت تنگ ہونے لگا اور مشاعرے کی گھڑی سر پہ آنے لگی تب بیگم انھیں ۔ ایک مرحوم کا سامان امانت کھولا ۔سپاس نامے کی بھڑکدار شیروانی ،

نثر میں لکھے ہوئے قصیدے کی جھنجھناتی ٹوپی اور بین الاقوامی میگزینوں کے تبصروں کے چمکیلے جوتے نکالے اور درزی کاتب حسین کو طلب کیا۔ کھڑے کھڑے شیروانی کی آستینوں اور دامنوں پر قینچی چلوائی۔ ٹوپی میں ٹانکے لگوائے اور للو میاں کو اس میں داخل کر دیا۔ جوتوں میں روئی بھر کر پیروں میں اٹکا دیا۔ اس انتظام سے فارغ ہو کر لباس خانے تشریف لے گئیں۔ بالوں کو سمیٹ کر پیشانی پر جوڑا باندھا۔ اس میں نکلس کو زنجیر کیطرح لپیٹا۔ رخساروں پر سنہرا آنکھوں کے حلقوں پر ہرا، ہونٹوں پر نیلا اور ابروؤں پر سرخ میک اپ کیا۔ ناخنوں پر سفید پالش لگائی اور نئی تکنیک کا مخصوص لباس پہنا جس کی صورت کچھ ایسی تھی جیسے بچوں کی سینڈو کٹ بنیائن میں ململ کے اننگے تہمد کو جوڑ دیا گیا ہو۔ دونوں کپڑوں کا رنگ ایک یعنی سیاہ تھا۔ اس پر چاندی کے تاروں سے دنیا کا نقشہ بنا تھا۔ ہر ملک میں ہونے والی اغوا کی وارداتوں اور ناجائز بچوں اور کوکین کے صرف کے اعداد و شمار کڑھے ہوئے تھے۔ سمندر پار سے منگائے ہوئے وہ جوتے پہنے جن کی ایڑیاں آگے اور پنجے پیچھے تھے۔ داہنی ننگی پنڈلی میں تانبے کی چوڑیوں کے ڈھیر میں جیبی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ جب ڈرائنگ روم میں تشریف لائیں تو نقاد مرزا نے انھیں دیکھا۔ داہنا ہاتھ سینے پر رکھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن تقدیر نے یاوری نہ کی اور وہ رعب حسن سے بے ہوش ہو گئے۔ مرتب علی کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر ہندوستانی فلموں کے عہد جاہلیت کے جانباز عاشقوں کیطرح غش کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ بیگم طمانیت سے مسکرائیں اور تازہ اخبار کا پنکھا ہلایا۔ وہ دونوں کوک بھرے کھلونوں کیطرح اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بیگم نے نقاد مرزا کو بسکٹوں کا ڈبہ اور ٹافی کا پیکٹ تھما دیا اور جھنجھنا اور چنوہ مرتب علی کے حوالے کیا۔ روزنامہ کی نگاہوں سے داد وصول کرتی للو میاں کی انگلی پکڑے نیچے آئیں اور ٹریکٹر پر بیٹھ گئیں۔ نقاد مرزا اور مرتب علی ڈرائیور کے (جو خود بھی چھوٹا موٹا نقاد تھا) دہنے بائیں اٹک گئے۔

پارک کے قلب میں لمبا چوڑا شامیانہ نصب تھا۔ عام داخلے کے دروازے پر دونوں طرف چائے کے ہوٹل اور پان کی دوکانیں تھیں جہاں شراب کی بوتلیں اور اناسین کی ٹکیاں وافر تعداد میں موجود تھیں۔ خاص دروازے پر والنٹیر ہجوم کئے ہوئے تھے۔ بیگم کی ہاہا کار کرتی سواری دیکھتے ہی چیل کیطرح جھپٹے اور ان کے بدن کی مٹھائی پر مکھیوں کیطرح بھنبھناتے اندر آگئے۔ چھوٹے سے ڈائس پر سوتی سوزنی پڑی تھی اور مارکین کے غلاف پہنے دو تکیے مردہ بکروں کیطرح پڑے تھے۔ اس کے تین طرف قیمتی صوفوں کے قطاروں پر حکام

تاجر اور خواتین کے لباس ان گنت بلبوں کی تیز روشنی میں جھم جھما رہے تھے ۔ پیچھے کرسیوں پر عام مجمع تھا جو سنیما دیکھنے کے بجائے مشاعرہ سننے چلا آیا تھا ۔ بیگم اپنے لواحقین کے ساتھ ڈائس کے داہنے بازو کے صوفے پر ٹک گئیں اور کالج کے لڑکے لڑکیوں کو آٹو گراف دینے لگیں ۔ تھوڑی دیر بعد سکریٹری صاحب چوڑی دار سیاہ پتلون، چمڑے کی بھوری جیکٹ اور اپنے ہی خشک بالوں کا وگ پہنے "مائک" پر تشریف لائے ۔ گوشۂ لب میں دبے ہوئے پائپ کو پتلون کی "ہپ پاکٹ" میں ٹھونس لیا اور کھنکار کر انگریزی میں تقریر کی جس کے اختتام کے بعد ایک وزیر صاحب جن کی مادری زبان ملیالم تھی اور جو انگریزی کے بھی حرف شناس تھے مائک پر تشریف لائے ۔ صدارت قبول کرنے کا اعتراف کیا اور شکریہ ادا کر کے ڈائس پر تازہ تازہ وارد ہوئی کرسی پر براجمان ہو گئے ۔ مجمع نے تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا ۔ پھر سکریٹری صاحب نے ایک کروڑ پتی تاجر سے جن کی فرم میں وہ ایک سو بیس روپے ماہوار پر ملازم تھے مشاعرے کے افتتاح کی درخواست کی ۔ وہ اینڈتے بڑاتے آئے اور بزبان تیلگو ایک عدد تقریر جھاڑ دی اور صدر کے برابر ٹیکی ہوئی دوسری کرسی پر ڈٹ گئے ۔ پھر سکریٹری صاحب نے شبنم آتشیں صاحب کا نام پکارا ۔ ایک صاحب گلابی "ٹی شرٹ" خاکی سلیکس اور مونچھوں کی طرح نوکیلی نو والے جوتے پہنے کندھے پر بغیر کالر کا کوٹ ڈالے تشریف لائے ۔ اس کے بعد سارنگی نواز طبلے باز اور مجیرا نواز حضرات نے ڈائس پر رکھے ہوئے مائکروفون کو گھیر لیا اور سر تال ملانے لگے ۔ شبنم آتشیں صاحب جو اپنے جوتے کی مہین نو سے سنگت کر رہے تھے یک لخت چپ ہو گئے اور سازندوں کو اشارہ کیا ۔ گردن پر ڈھیر بالوں پر ہاتھ پھیرا ۔ داہنا ہاتھ داہنے کان پر اور بایاں ہاتھ بائیں کولہے پر رکھ کر نظم شروع کی جو خاص مشاعروں شاعری کی نمائندہ تھی جس میں الفاظ کی بھوکی مادیت کے بجائے لحن کی آسودہ طمانیت سے کام لیا گیا تھا ۔ مجمع داد دیتے دیتے ڈائس پر چڑھنے لگا ۔ موقعہ پر موجود مجسٹریٹ نے پولس بلائی ۔ لاٹھی چارج کرایا ۔ آنسو گیس چھوڑی گئی اور بغیر گولی چلائے مجمع پر قابو پا لیا گیا ۔ (سننے میں آیا ہے کہ مجسٹریٹ اس نادر روزگار خوش انتظامی کے صلے میں کسی بد نظم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا ہے) سکریٹری نے پھر اعلان کیا جس کا ترجمہ یہ ہے ۔

"حضرات و خواتین ۔ ہمارے مشاعرے کی خوش نصیبی ہے کے ملک کے مشہور ہونہار کمسن شاعر اور جدید طرز کے امام حضرت دلگیر آفتاب شحنہ (للو میاں) ہمارے درمیان

تشریف رکھتے ہیں ۔ اب میں ان سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے کلام سے مشتاق سامعین کو قتل کر دیں ۔"

تحریک بیگم نے اپنے لاڈلے کے کان میں کچھ کہا اور ٹوپی درست کی اور کسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والے نقاد کے مشہور فقروں کا ورد کر کے ان پر دم کیا اور ان کی تکمیل یعنی انگلی نقاد مرزا کے ہاتھ میں دے دی ۔ مرتب علی نے جلدی سے کچھ بسکٹ اور ٹافیاں ان کی جیب میں ڈالیں اور بہلاتے پھسلاتے ڈائس کی طرف چلے مائک کے سامنے پہنچتے ہی حضرت دلگیر آفتاب شحنہ ٹھنکنے لگے لیکن ان کی آواز کو پیچھے بیٹھے ہوئے سازندوں نے اپنے سر تال میں ہضم کر لیا ۔ اتنی دیر میں نقاد مرزا نے بڑی بڑی خوشامدیں کر ڈالیں ۔ اڑنے والی موٹر اور گانا سنانے والی بندوق لادینے کے وعدے وعید کیے لیکن جب وہ کسی طرح ملائم نہ ہونے اور رٹی ہوئی غزل کو سناڈالنے پر رضامند نہ ہونے تو ایک عدد دھمو کا رسید کر دیا اور حضرت دلگیر آفتاب شحنہ نے فلک شگاف (چیخ) نعرہ بلند کیا جس کے سوز و ساز سے مجمع کی جان پر بن گئی اور ہفت زبان داد کے لہریا ڈونگرے برسنے لگے ۔ پنڈال ملک میں بولی جانے والی تمام ادبی زبانوں کے تعریفی کلمات کے سیلاب میں بہہ گیا ۔ مجسٹریٹ نے حفاظتی تدابیر کے طور پر پولس طلب کر لی اور حفظ ما تقدم کے طور پر کچھ زود فہم سامعین کو گرفتار کر لیا اور ضبط و نظم کو برقرار رکھا ۔ نقاد مرزا اور مرتب علی کے دونوں بازو حضرت دلگیر آفتاب شحنہ کو سنبھالے سنبھالے تھک گئے تھے ۔ آخر انھوں نے مجمع کو چولہے بھاڑ میں جھونکا اور ڈائس سے اتر کر تحریک بیگم کے پہلو سے لگ گئے ۔

دوسرے دن کے تمام اخبار حضرت دلگیر آفتاب شحنہ کے کلام معجز نما کی تعریف سے رنگے ہوئے تھے ۔

———— • ————

سایہ

ماضی کے درخت میں سایہ ہوتا ہے نہ پھل لیکن پانی پر پھولی ہوئی شفق کیطرح ہر آنکھ اس کے عکس سے رنگین ہوجاتی ہے۔ مانک پور راج کی بیوہ مالکن کی آنکھ بھی آج اسی طرح رنگین تھی۔ مانک پور کے بوڑھے وکیل بابو خوش بخت بہادر کب کے جا چکے تھے۔ پھوس بدن میں اٹکی ہوئی دگڈ گاتی گردن پر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے چہرے پر بنے ہوئے پوپلے منہ کی مسکراہٹ نے اور بھیانک بنادیا تھا۔ وہ اپنی جھلنگا چارپائی سے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں موج کی بنی ہوئی گول پٹاری میں رکھی ہوئی پیتل کی پن کٹی میں پانوں کی کترن سے بنی ہوئی تھی سی گلوری تھر تھراتے ہاتھوں سے کوئی بانس کی چمچی سے چاٹ کر منھ کا بٹوہ بند کرلیا۔ اٹھنے ہی کو تھیں کہ حافظے کا پروجیکٹر پوری رفتار سے چلنے لگا تھا اور کچے اندھیارے کمرے کی کھردری ان کی کھال سے زیادہ کھدری دیوار پر ریشم کا پردہ کھینچ گیا تھا اور فلم شروع ہو گئی تھی۔

کل دیوالی تھی۔ وہ نذر میں آئے ہوئے آتش بازی کے کھانچے محلے والوں میں تقسیم کرا کر اٹھی تھیں کہ اندرونی ڈیوڑھی سے کمہارنوں کی لین ڈوری نکلنے لگی جن کے سروں پر دیولوں کے بڑے بڑے جھوے سدھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے سلاموں سے بے نیاز صدر کے دالان میں آگئیں اور باہر لگے ہوئے حلوائیوں اور اندر جٹے ہوئے باورچیوں کے متعلق عورتوں کو احکام دینے لگیں کہ بڑے کمرے کا دروازہ کھلا اور مشک کی مانوس خوشبو نقیب کیطرح میاں سے پہلے بر آمد ہوگئی۔ میاں ان کے گاؤ تکیے پر کہنی ٹیک کر بیٹھے ہی تھے اور ان کا ہاتھ چاندی کا جہازی پاندان کھینچنے کے لئے دوشالے سے نکلا ہی تھا کہ ڈیوڑھی سے سپاہی نے ہانک لگائی۔

"بڑے گاؤں کے چھوٹے ساہ حاجر ہیں سر کار"

"بھیج دو"

میاں کے منہ سے نکلا اور وہ اپنے فرشی پائنچے سمیٹتی چلمن کے پیچھے چلی گئیں۔

ایک دبلے پتلے آدمی نے صحن سے گذر کر دالان کے چبوترے کی سیڑھیوں پر کندھے کے انگوچھے سے اپنے پیر جھاڑے اور ہر قدم پر سلام داغتا ہوا دالان کے ستون کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"تم بڑے گاؤں کے شاہ جی کے بیٹے ہو۔"

"ہاں سر کار"

"تم کو معلوم ہے کہ دیوالی پر صرف پانسہ پھینکتے ہیں؟"

"معلوم ہے مالک"

"در گا سنگھ"

"مالک"

بڑے منشی سے کہو کہ اس کو سو روپیہ دیدیں۔ یہ آج ہمارے ساتھ کھیلے گا۔

میاں کو گلوری دے کر خاص دان بنانے لگیں تو خیال آیا کہ آج کل سارے علاقے میں گلاب جان کے گلے کی دھوم اور بدن کی قیامت مچی ہوئی ہے اور انھوں نے دوسری گلوری پیش کر کے مسکرا کر کہا۔

"ایک گذارش ہے"

"حکم دیجئے"

"آج رات میں بھی آپ کا کھیل دیکھوں گی۔"

"تم"

"جیسے انھوں نے گلوری نہیں انگارہ منہ میں رکھ لیا ہو۔"

"ہال کی شہ نشین پر چلمنیں پڑ جائیں گی اور میں تھوڑی دیر کے لئے۔۔۔۔"

میاں کچھ سوچتے ہوئے اٹھ چکے تھے۔

اور وہ شہ نشین پر گاؤ سے لگی لگی سو گئی تھیں کہ میاں کی گرجدار آواز نے انھیں جگا دیا۔

"یہ اپنے گھر بڑے گاؤں جا رہا ہے اس کے ساتھ اس کا جیتا ہوا بارہ ہزار روپیہ بھی

ہے ۔ اس کی حفاظت کا انتظام کر دو ۔"

اور وہ دبلا پتلا آدمی ڈھیلے ڈھالے کرتے اور چھپی ہوئی دھوتی میں جھکا ہوا میاں کے پاؤں چھو رہا تھا اور میاں اب کسی اور کے ساتھ ۔ دروازے پر دستک ہوئی ۔

"کون ہے بھائی"

"میں ہوں سرکار دیبی دیال ۔۔۔۔۔ ساہ جی کا منیم ۔۔۔۔۔"

وہ کوٹھری نما کمرے سے نکلیں اور دو چار پائیوں کے آنگن سے رینگ کر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کھڑی ہو گئیں ۔

"کیا ہے بھائی"

"ساہ جی نے آپ کو سلام کہا ہے اور آج سام کو آپ کی کھدمت میں حاجر ہونے کی اجاجت مانگی ہے ۔"

"ان سے ہماری دعا کہیو اور کہیو کہ جم جم آئیں ۔"

اور وہ وہیں کھڑی ہوئی جانے والے قدموں کی دور ہوتی چاپ سنتے سنتے بھی اپنا تماشہ دیکھنے لگیں ۔

اس سال میاں دیوالی میں اپنا سارا نقد روپیہ ہار گئے تو ان کی خاص الخاص تجوری کھولی گئی اور ان کے اور اپنے تمام زیور گہنے خوانوں میں اٹھوا کر لے گئے ، پھر تو جیسے جھاڑو پھر گئی ۔ گجردم دیوالی کے دیولوں کیطرح سب کچھ اجڑنے لگا ۔ آج منترقات نیلام ہو رہے ہیں ۔ کل باغات کی ڈگی پٹ رہی ہے ۔ پھر موا پاکستان بنا ۔ بھائی بھتیجے ایک ایک کر کے سب ادھر ڈھلک گئے اور رہی سہی کسر زمینداری کے خاتمے نے پوری کر دی ۔ اور پھر جو دیوالی آئی تو میاں نے گڑھی رہن رکھ کر بساط سجائی اور ہاری بساط سے اٹھتے اٹھتے میاں نے اپنی پہاڑ ایسی جان کا بیعنامہ کر دیا ۔ بھائی برادری کی شرم تھی کہ چھوٹے شاہ جواب شاہ جی بجنے لگے تھے ان کی عدت تک خاموش رہے پھر تو ڈاک بٹھادی ۔ وہی رٹ کہ گڑھی خالی کر دو ۔ تب درگا سنگھ نے نمک حلال کیا اور گڑھی کے باہر مالک کا بخشا ہوا کچا گھر ان کو پیش کیا اور خود اپنے باپ بھائی کے پاس اٹھ گیا اور بیس ہزار پر رہن گھڑھی میں دنیا جہان کے دفتر کھلنے لگے ۔ اس دن کوئی کہہ رہا تھا کہ آٹھ سو روپیہ مہینہ صرف کرایہ آتا ہے اور شاہ جی پھیل پھیل کے رہتے الگ ہیں ۔ لیکن ان کی بلا سے ۔ ان کی تقدیر میں تو گنج کی دو کانیں تھیں جو مدتوں سے روپیہ مہینہ پر اٹھی چلی آ رہی تھیں ۔ اسی چالیس روپے میں وہ ایک آدھ وقت کی روٹی اور

چار وقت کے پان کو کٹر میں پوری کر لیتی تھیں ۔ پھر کسی طرف سے ایک ٹھنڈا جھونکا آیا اور ان کو پہلی بار علم ہوا کہ بغیر رضائی اوڑھے کھڑی ہیں اور دھوپ بوڑھی ہونے لگی ہے اور انھوں نے اپنی مٹھی بھر ہڈیوں کو چادر سے جیسے دوپٹے میں لپیٹ لیا اور آہستہ آہستہ کوٹھری یا کمرے کی طرف چلیں ۔ ڈلوے میں روٹی اور رات کی ترکاری المونیم کے کٹورے سے ڈھکی رکھی تھی تھوڑی دیر دھندلی سی نگاہ اس پر تھرتھرائی پھر خلا میں ڈوب گئی ۔ اور وہ اپنی جھلنگا بلنگھڑیا کے جھولے میں رضائی اوڑھ کر بیٹھ گئیں اور معلوم نہیں کبتک بیٹھی رہتیں کہ دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہونے لگی ۔ وہ منزل مار کر پہنچیں تو دیبی دیال نے اطلاع دی کہ ساہ جی حاضر ہیں ۔

بی بی صاحب گڑھی بیس ہجار پر رہن تھی آپ بیس ہجار کرج لے کر ادا کر دیجئے گا کل پرسوں میں کوئی جلدی نہیں ہے ۔

ہاں خوش بخت بہادر بھی کہہ رہے تھے اور کاغذوں پر دستخط بھی بنوا لیے گئے ہیں لیکن مجھ عقل کی ماری کو سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی کس برتے پر مجھے بیس عدد ہزار گن کر سونپ دے گا ۔ پانی پر پھولی ہوئی شفق دیکھنے لگی تھیں ۔

اس سال دیوالی پر میاں اپنا تمام نقد روپیہ ہار گئے تو ان کی خاص الخاص تجوری کھولی گئی جو ان کے ہوش میں تیسری بار اور آخری بار کھولی گئی ۔ پہلی بار جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو میاں نے اپنے موتی انھیں دکھلائے تھے اور پھر دوسری بار جب سیتاپور کے کلکٹر کا خط لے کر ایک انگریز موتی فروش مانک پور آیا تھا اور جب اس کے موتی دیکھ کر میاں نے خریدنے سے انکار کر دیا تو بندر کے بچے نے بڑی تمکنت سے کہا کہ "جی ہاں یہ موتی مہنگے بھی ہیں ۔" میاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور غصے میں اندر آئے تھے اور تجوری کھولکر کرتے کے دامن میں موتی بھرے گئے اور اس کے سامنے تخت پر بکھیر دیے تھے اور پوچھا تھا کہ اگر ایسا ایک موتی بھی اس کے پاس ہو وہ اس کا ہزار روپیہ مانگے تو بھی خریدلیا جائے گا اور وہ بندر کا بچہ منھ پھلائے گڑھی سے نکل گیا تھا اور ان کے موتیوں کی دور دور تک شہرت ہو گئی تھی لیکن اس رات میاں پر نہ جانے کون سا بھوت سوار تھا کہ موتیوں کے انجورے بھر بھر کر داؤ پر لگاتے رہے اور ہارتے رہے اور موتی ہار کر تو جیسے اپنا سب کچھ ہار گئے ۔ باغ، تال، جنگل، بازار، گاؤں، گراؤں بس ہارتے رہے ۔ پھر موا پاکستان بنا بھائی بھتیجے اور بہن بھانجے سب ادھر ڈھلک گئے اور ڈھنڈھار گڑھی میں کوے بڑاتی رہے ۔

پھر زمینداری ختم ہوئی اور بانڈ بیچ بیچ کر میاں بساط سجاتے رہے لیکن تقدیر ایسی پھری کہ پانسہ کبھی سر خرو نہ ھوا۔ اور اس سے اگلی دیوالی پر گڑھی کی نوبت آ گئی ۔۔۔۔ میاں نے بیس ہزار پر رہن رکھ دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ گڑھی میں جو دفتر کھلے ہیں انھیں کا کرایہ چار پانچ سو روپے مہینہ آتا ہے اور مدتوں سے روٹھی ہوئی تقدیر اس دن بھی روٹھی رہی ۔ رات میاں گڑھی ہارے اور صبح پہاڑ ایسی جان کا بیعانہ ہو گیا ۔ جنازہ اٹھتے ہی تیوہاری لال کے پیغام آنے لگے اور چہلم ہوتے ہوتے تو جیسے ڈاک بٹھا دی ۔ وہی ایک رٹ کہ گڑھی خالی کر دو ۔ بھائی برادری سے کہلوایا کہ میاں عدت کے دن گذار لیں پھر گڑھی تو خالی ہو ہی جائیگی ۔ ارے خالی بوتل گڑھی میں پڑی رہے یا گڑھیا میں فرق کیا پڑتا ہے لیکن وہ شاہ جی کو نہ ماننا تھا نہ مانے ۔ وہ تو بھلا ہو درگا سنگھ کا کہ میاں کا نمک حلال کر دیا ۔ اپنی خدمت کے عوض میں پانے ہونے گھر یا گھروا کو جو کچھ بھی تھا قدموں میں لا کر رکھ دیا اور خود باپ بھائی کے پاس بسنے کو اٹھ گیا ۔ تو اب یہ نئی آفت آئی ہے کہ اسے بھی خالی کرو ۔ معلوم نہیں ہمارا بلاوا کب آئے گا ۔ یہ ہندوستان پاکستان کی چکی میں اللہ میاں کا وہ رجسٹر جس میں ہمارا نام بھی درج تھا فرشتوں نے کہیں ادھر ادھر کر دیا ۔ تبھی تو بیٹھے ہیں پاؤں توڑے ہوئے ۔ کیسے کیسے جوان جہاں آئے دن مرتے چلے جاتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ نہ پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت مگر جئے چلے جا رہے ہیں ۔ تو ہاں اب اس جینے کے ہاتھوں اور کس کے گھر مرنے کو چلیں ۔ کیا کریں اللہ آج سردی ہے کہ ہاتھ پیر جیسے جمے جا رہے ہیں ۔ دھوپ کی پٹی چٹائی کیطرح لپٹ رہی تھی اور وہ اپنی بساط اٹھانے کی فکر میں مبتلا تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی نیا قانون پاس ھوا ہے بی بی کہ سرکاری بیوہ کا رہن شدہ مکان واگذار کرانے کے لئے کر جا دیگی ۔

"یہ سرکار کو ہم بھولے بسرے کیسے یاد آ گئے ۔"

"ایک ارج ہے بی بی"

"ہاں کہو"

"میں میرے پاس دو درجے ہیں گڑھی کے ایک آپ کے لئے کھالی کر دوں اور ایک میں پڑا رہوں جو کرایہ آپ باندھیں ادا کر دونگا اور اگر حکم ہو تو اجڑ جاؤنگا"۔

———— • ————

سوچ

رات ان گنت روشنیوں سے روشن ہے جیسے ذہن میں ماضی کے جگنو چمک رہے ہوں ۔ یادوں کے چراغ جل رہے ہوں ۔ میں سنٹرل ہوٹل کے ستون سے لگا کھڑا ہوں پیچھے امین آباد پارک میں نمائش لگی ہے ۔ آوازوں کے پرندے سنسناتے ہوئے گذرے رہے ہیں پشت پر وراندے میں بلیرڈ ہو رہا ہے ۔ میں بک کرا چکا ہوں ۔ پھر گھڑی دیکھتا ہوں ۔ میرا وقت آنے میں ابھی دیر ہے ۔ میز کیطرف سے آوازوں کا جھکڑ آتا ہے ۔ اب شور گاڑھا ہو گیا ہے ۔

"کینن [1]"؟

یعنی وصل ----- لیکن جدائی کیلئے ۔

"پاٹ [2]" ؟ -----------

ایک خواب کی تعبیر ----- لیکن ابھی تعبیر کی لذت سے آشنا بھی نہ ہو پائے تھے کہ دوسرا خواب حواس پر مسلط ہو گیا ۔

"اور پوائنٹ [3]" ؟

خوابوں کی تعبیروں کا حساب ۔

"ہار ----- یا جیت" ؟

تعبیروں کی میزان ----- ماضی کی مٹھی میں تعبیروں کے سکے جس کے پاس زیادہ ہوئے وہ جیت گیا کم ہوئے ہار گیا ۔

"اور فلیوک [4]"

تقدیر صرف تقدیر ۔

پوائنٹ ----- فلیوک کے ہاتھ سے ہماری تقدیر کے ہاتھ سے ۔ بیمار گود میں گر

نمبر ۴-۳-۲-۱- بلیرڈ کے کھیل کی اصطلاحیں ۔

بڑے ریاض، یا تدبیر کی تقدیر سے ناکامی ہوئی۔ اس کا کوئی حساب نہیں۔ نہ بلیرڈ میں نہ زندگی میں۔

"ہلو"

ایک وزنی ہاتھ مجھ پر گر پڑا۔ خیالات کا مجمع منتشر ہو گیا جیسے لاٹھی چارج کر دیا گیا ہو۔ وہ ہنس رہا تھا سارے جسم سے۔ وہ اس لیے نہیں خوش تھا کہ میرا دوست تھا۔

اسکول کے دنوں کا دوست۔ اسکول دن -----۔ جیسے رنگ برنگے غبارے اڑ رہے ہیں اور ان پر ہماری چھوٹی چھوٹی فتوحات کی تصویریں بنی ہیں۔ وہ اس لیے خوش تھا کہ آج پھر اسے اپنی امارت کے اظہار کا موقعہ مل گیا تھا جیسے اناڑی شکاری سوتے ہوئے جانور کے پاس پہنچ گیا ہو۔ شاداب دوستی کے دنوں میں بھی راجکمار بھارگو کو ہمیشہ یاد رہا کہ وہ اس گانو میں پیدا ہوا جو میری زمینداری میں برباد تھا اور یہ بات اسے اس وقت نشے کے عالم میں بھی یاد ہے کہ جس گاؤں میں آج میرے بھگت رہے ہیں وہ اس کی عملداری میں ہے۔ کل جو زنجیر اس کے پیروں میں پڑی تھی وہ اتر کر میرے پاؤں سے لپٹ گئی ہے۔ یہ زنجیر نہ کل میں نے اپنے ہاتھوں سے راجکمار کے پیروں میں پہنائی تھی اور نہ آج اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے پیروں میں پہنائی ہے۔ یعنی فلیوک کل مجھے ملا تھا آج اس کو ملا ہے۔ فلیوک کے پوائنٹ سب لیتے ہیں۔ ولسن جونسن بھی اور راجکمار بھی۔

"آئیے آپ کو ایک چیز دکھائیں"

اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا ہے اور میرا چہرا شراب کے بھبکوں میں ڈوب گیا ہے۔

"میری میز بک ہے۔ بھائی"

"مار کر"

وہ اپنا بھاری پرس کھول رہا ہے اور میں بے بس کھڑا ہوں۔ جیسے میں جمہوری ملک کا ایک آزاد شہری نہیں قرون وسطیٰ کا غلام ہوں جسے نئے آقا نے خرید لیا ہے۔ اس نے ایک دروازے پر تھپکی دی۔ پھر پتلون کے بٹن بند کرنے لگا۔ آہستہ سے چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ میز پر بوتل رکھی ہے جس پر سفید گھوڑا بنا ہے اکلوتے پلنگ پر سفید بستر لگا ہے۔ اس پر ایک عورت پڑی ہے جیسے جاڑوں کا بستر بند کھلا پڑا ہو-----توشک -------جس پر سفید ریشم کی جلد چڑھی ہو۔ تکیے -----جو سرہانے

پروں کے پروں سے زیادہ گدازھوں اور "وگ" اور "فر" اور "سمور"۔ اس نے ایک ہاتھ موڑ کر پیشانی پر رکھ لیا ہے ۔ وہ بہت کچھ پہنے ہوئے ہے ۔ کلائی میں گھڑی اور چوڑیاں ۔ کانوں میں آویزے ۔ ناک میں کیل بالوں میں پن ہونٹوں پر سرخی ۔ ایک ایک ناخن پر پالش اور سارے بدن پر سفید جلد جس پر تھے سنہرے ریشمی روئیں جڑے ہیں ۔ وہ اس طرح لیٹی ہے جیسے میں کرسی پر بیٹھا ھوں بیقرار لیکن خاموش، مجھے پڑھنے کے لئے پر کھنے کیلئے ایک بار مجھے دیکھتی ہے ۔میں بھی دیکھتا ھوں کہ اس کے بدن کے تھے سنہرے ریشمی روئیں کھڑے ہوجاتے ہیں ۔ تیز دودھیا روشنی میں میں ان کو گن سکتا ھوں ۔

"کیا تم ان کو جانتے ھو؟"

راجکمار مجھ سے پوچھ رہا ہے لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ھوں وہ کہہ نہیں سکتا۔ میں قرون وسطیٰ کے غلاموں سے زیادہ مجبور ہوں ۔ وہ صرف ایک غلام ہوتے تھے میرے کئی آقا ہیں، رشتے، کلچر، ماضی اور آئیڈیل اور سب کے ہاتھ میں کوڑے ہیں ۔ میرے ہی کھنچی ہوئی کھال کے کوڑے جو تڑپ رہے ہیں اور ان کی زد میں لرز رہا ہوں ۔ راجکمار اس کا تعارف کرا رہا ہے جیسے کوئی گائیڈ رنگون سے آئے ہوئے بہادر شاہ ظفر کو لال قلعہ دکھلا رہا ہو ۔میں اس کی کالی کھنگھور آنکھوں میں تیرتے ہوئے خوفناک اندیشوں کے نقاب کو چیر کر دیکھ رہا ہوں ۔ پرانے لکھنئو کی ناہموار اور پیچیدار گلیوں کے دونوں طرف غریبی کے اشتہاروں کیطرح ٹوٹے پھوٹے مکانات کھڑے ہیں ۔ان کی نالیوں میں بھوک سڑتی رہتی ہے اور فاقوں کا تعفن رینگتا رہتا ہے ۔ سیاہ کبوتروں کے ہجوم کیطرح جب شام ان پر اتر آتی ہے تو ان کہانیوں پر یقین آجاتا ہے جن کے مطابق یہاں تاریخ کے قافلے اترے تھے اور تہذیب نے آداب سیکھے تھے ۔ اس جلوس کے انتظار میں جو گذر چکا ہے دیواروں کی کمر جھک گئی دروازوں کی آنکھیں بہہ گئیں مگر یہ موجود ہیں ۔ ان پر چھائیوں سے آباد ہیں جو اپنے وجود سے بچھڑ گئیں ان خوابوں سے گرانبار ہیں جو نیند کے درختوں سے سوکھ کر گر گئے ۔ ان کے سینوں میں یادوں کے دفینے دفن ہیں ------ یادیں ------ حافظے کی چھلنی سے چھنے ہوئے ماضی کا نام ہے ۔ یادیں جن کی مٹھی میں کھوئے ہوئے لمبے پر نچی تتلیوں کیطرح پھڑ پھڑاتے ہیں ۔ یادیں جن کی چٹکی میں فاصلوں کی سدھی ہوئی پتنگوں کی ڈور ہوتی ہے ۔ یادیں عورتوں کیطرح عجیب ہوتی ہیں ۔

"تم نے برف نہیں ڈالا"

"جو کبھی اپنے سپوتوں کو ڈس لیتی ہیں اور کبھی رسولوں کی پیدائش کے کرب کا پہاڑ اپنے شانوں پر اٹھالاتی ہیں ۔ کبھی ساہی کے کانٹوں کیطرح اس طرح وجود میں پیوست ھو جاتی ہیں کہ موت کے ناخن لہو لہان ہو جائیں اور کبھی ایسا گھنا سایہ بن کر موجود کو ڈھانپ لیتی ہیں کہ تمام زبانوں کے تمام محبوبوں کے تمام گیسوؤں کی چھاؤں رائیگاں ہو جائے ۔

"لیکن یہ یادیں کیوں ؟"

"یادوں کے نشیمن میں چمکتا ہوا ماضی کیوں ؟"

"اور اب رہ بھی کیا گیا ہے !"

"ماضی ہی تو ہے !"

"حال ؟"

"فریب ، فریب مسلسل ، جس میں فلسفیوں نے ہمارے ذہن کو آلودہ کر دیا ہے ۔"

"اور مستقبل ؟"

"مستقبل !ایک پہاڑ ہے لمحہ لمحہ رستا رہتا ہے ۔ قطرہ قطرہ . بہتا رہتا ہے اتنی ہی دیر میں کہ ہم اس کے لمس کو محسوس کریں وہ ماضی کے سمندر میں ------- "

"تم تو دوا کیطرح پی رہے ھو ۔ ہنستے ہو نہ بولتے ھو"

" گر جاتا ہے کھو جاتا ہے ۔ماضی ہو جاتا ہے ۔"

"یہ تو ذہن کی تاریکی ہے ۔"

"ہاں وہ تمام نشے جنھوں نے مستقبل کے پہاڑ سے جوئے شیر نکالی ہے اسی تاریکی کے آہن سے ڈھالے گئے ہیں ۔ وہ تمام کمندیں جو آسمانوں پر ڈالی گئی ہیں ان کی طنابوں سے بٹی گئی ہیں جن پر یادوں کا شامیانہ کھڑا ہے ۔"

نصیر منزل آ گئی ۔

میرے قدم تھک گئے ہیں ۔ایک پرچھائیں کا برقعہ سیاہ چیتھڑے کیطرح زمین پر لوٹ رہا ہے ۔ایک گندے خوانچے پر ننگے بچے .بھنک رہے ہیں ۔میرا ہاتھ ایک گھنے ہوئے دروازے پر سجدہ کرتا ہے جس کا ایک نام دستک بھی ہے ۔ دروازہ چرچرا کر کھلتا ہے پھر بند ھو جاتا ہے ۔

"ارے تم ؟ آؤ ۔ آجاؤ ۔"

نصیر چچا کرتا تہمد اور چپّل پہنے میرے سامنے کھڑے ہیں ۔ ان کے کھچڑی بالوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں ۔ میں ایک کمرے میں داخل ہوتا ہوں جو عام ذہنوں کیطرح ویران ہے اور جس میں پرانی یادوں کیطرح ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا ہے ۔ میں ٹین کی کرسی پہ بیٹھتا ہوں جو ایک طرف کو جھک جاتی ہے ۔ نصیر چچا انجان بن کر میرے سامنے تین ٹانگ کی میز رکھ دیتے ہیں پرانے اخبار کا میز پوش برابر کرتے ہیں ۔ مختلف سائز کے ننگ دھڑنگ بچے ادھر ادھر رینگ رہے ہیں ۔ ریں ریں کر رہے ہیں ۔ دو ایک میرے کمرے کیطرف بڑھتے ہیں تو نصیر چچا گالیاں دے کر بھگا دیتے ہیں ۔ پھر وہ چار مینار کا پیکٹ جس میں صرف دو سگریٹ ہیں میری طرف بڑھا کر دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں ۔ اب وہ اپنی بیوی سے سرگوشیاں کر رہے ہیں ــــــــ سرگوشیاں جو پہلی تاریخ کی دوری کے ساتھ گاڑھی ہوتی چلی جاتی ہیں پھر چیخوں میں تحلیل ہو کر لڑائیاں بن جاتی ہیں ۔ نصیر چچا جھپاک سے باہر گئے اور آنے باورچی خانے سے نکل کر نصیر چچا نے تمام بچوں کو سمیٹا اور باہر نکال کر دروازہ بند کرلیا ۔ اب میرے کمرے کا ایک دروازہ اودی ساری سے لبالب بھر گیا ہے ۔ یہ نصیر چچا کی دوسری بیوی نہیں ہیں لیکن جوانی کیوجہ سے دوسری معلوم ہوتی ہیں اور میں ان کو دیکھ کر ہمیشہ سوچتا ہوں کہ دوسری کیوں نہیں ہیں ۔ کوئی یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہ تمام بچے آدھے درجن بچے ان کی کوکھ سے نہیں جنمے ۔ وہ صرف نصیر چچا کے بچے ہیں اور یہ بھی کہ یہ نصیر چچا ان کے شوہر نہیں ہیں ۔ ان کے ملازم ہیں یا دور کے محتاج عزیز دار ہیں جو ان کی روٹیاں توڑتے ہیں ۔ وہ اس گھر میں اپنے گھر میں معزز مہمان کیوں معلوم ہوتی ہیں ۔ ایک قیمتی امانت کیطرح جگمگاتی رہتی ہیں جن کی حفاظت پہ نصیر چچا مامور ہیں ۔ میں نے اپنی نظریں جھکالیں ہیں ۔ ان کے سفید موٹے ہاتھ مٹیالی چینی کی طشتریاں میز پہ چن رہے ہیں ۔

"چائے بناؤ بیگم ۔"

میں چونک پڑا ہوں کیونکہ اسی وقت راجکمار نے کہا ۔

"گلاس بناؤ بیگم ۔"

میں نے اپنی نظریں پھر اوپر اٹھائیں ۔ وہ میرے لیے اسی طرح گلاس بنا رہی ہیں جسطرح اپنے گھر میں نصیر چچا کے کہنے سے میرے لیے چائے بنا رہی تھیں ۔ میں نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا ۔ ان کیطرف دیکھا ۔ وہ ایک عورت کے بجائے خوش آمدید کہتا

ہوا کھلا دروازہ معلوم ہوئیں جن میں کوئی بھی داخل ہوسکتا ہے ۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟"

اور میں سوچ رہا ہوں کہ وہ کیا سوچ رہی ہونگی ۔ ہمارے پاس سوچنے کے علاوہ رہ بھی کیا گیا ہے ----------

———— • ————

بلاعنوان

جامع مسجد ------مرحوم تاریخ کی مغرور علامت اپنے گنبدوں کے بوجھ کے نیچے کچلی ہوئی دوزانو بیٹھی دونوں میناروں کے عظیم ہاتھ اٹھائے کبھی نہ ختم ہونے والی دعا مانگ رہی تھی ۔ہم انسان تو دنیا سے عقبیٰ تک پھیلی ہوئی ایک ایک خیالی مسرت اپنی دعا کے حصار میں سمیٹ لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں ۔لیکن یہ کس رحیم خدا سے کس بد نصیب کی کتنی طولانی دعا ہے ۔ جو قبولیت ہی سے نہیں ۔ تکمیل سے بھی محروم ہے ۔میری محراب کے نیچے حد نگاہ تک پھیلا ہوا، ہفت رنگ آوازوں کا جنگل لہلہا رہا تھا ۔جسے فاصلوں کے نقاب نے کسی حد تک پر اسرار بنا دیا تھا ۔ نقاب تو مکروہ چہروں کو بھی چور نگاہوں کا آشیانہ بنا دیتے ہیں ۔اداسی جو ایسی ہولناک اور شاندار عمارتوں کے وجود سے چشموں کیطرح پھوٹتی ہے ۔ میری آستینوں سے ٹپکنے لگی تھی اور میں کچھ چہروں پر چمکتے اس فخر کا تماشا دیکھ رہا تھا ۔جو حال کی بدحالی اور ماضی کی جگمگاہٹ سے پیدا ہوتا ہے --ایسے چہروں پر آنکھیں ان روشندانوں کیطرح کھلی ہوتی ہیں جن سے ذہنوں کے بند کمروں میں سجے ہوئے نوادرات کا تماشا کیا جاسکتا ہے ۔ محراب کی شکل میں کٹے ہوئے نیلگوں آسمان کے بڑے بڑے قتلے یہاں سے وہاں تک پڑے ہوئے تھے اور ان کے قلب میں قلعے کی فصیل کے سرخ کنگرے چمک رہے تھے ۔جیسے غدر کی سولیوں پر چڑھے ہوئے جسموں کا گوشت سوکھ گیا ہو ۔میں ان کو گن رہا تھا کہ روشنی کا جھماکہ سا ہوا ۔ جیسے ایک لمحے کیلئے تخیل تک خیرہ ہو کر رہ گیا ۔ وہ میلا ،بدوضع اٹنگا پتلون اور ڈھیلا ڈھالا کھردرا بوسیدہ کرتا پہنے بالکل میرے پاس کھڑی تھی قد آدم مشعل کی طرح سر سے پاؤں تک منور تھی جیسے کسی اسمگلر کے سر سے بوری گر پڑی ہو اور سونے کے بدیسی بسکٹ بکھر گئے ہوں ۔

"کیا آپ کے پاس ایک سگریٹ ہو گا؟"

اس کی آواز اور لہجے اور "ایکسنٹ" پر صدیوں کی کمائی ہوئی تہذیب کی طہارت اور نفاست اور لطافت کی مہریں لگی تھیں اور اس کے جسم سے بے نیازی اور بے حجابی کے شعلے نکل رہے تھے ۔ میں نے گھبرا کر اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے اور ، سگریٹ کی ڈبیہ اس کی کھلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دی اور اس نے اسطرح خم کھا کر قبول کیا جیسے وہ سگریٹ کا پیکٹ نہیں سونے کا تمغہ ہو ۔ ابھی وہ سگریٹ نکال رہی تھی کہ دو رستونوں کی آڑ سے دو آوازیں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے نکلیں ۔

"میرے لئے بھی ایک ۔"

ان دونوں سفید فام نوجوانوں کے پاس جھوا بھر سنہرے بالوں ، ٹوکرا بھر سرخ داڑھیوں کے علاوہ جو کچھ بھی تھا ، سب فروعی تھا ـــــ اس کی نگاہ نے میری اجازت طلب کی ۔

میری تیلی کے شعلے سے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے اس دور سے نظر آنے والی مصنوعی لاپروائی سے کہا ۔

"میرے پاس نہ سگریٹ ہیں ۔۔۔۔۔ نہ چائے کے پیسے ۔"

ـــــــــ اور میری فطری کم آمیزی کا آہنی خول جیسے آپ ہی آپ چٹخ گیا اس نے میری دعوت قبول کرلی اور میرے ساتھ چلتے چلتے اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی مدعو کرلیا ، لیکن وہ انکار کرکے اسی طرح اپنے دھیان گیان میں بیٹھے رہے ۔ وہ میرے ساتھ جامع مسجد کی ایک ایک سیڑھی اتر رہی تھی اور میں زینہ بہ زینہ آسمانوں پر چڑھ رہا تھا ۔ میں نے مینو اور سگریٹ کا پیکٹ اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کے تعارف کا انتظار کرنے لگا کہ میرا تعارف وہ راستے ہی میں وصول کر چکی تھی ۔ چاندنی چوک کی چھونے سے رستوران کی پرشور آوازوں اور ڈھیٹ نگاہوں کی موٹی موٹی مکھیاں ہمارے چہروں پر بھنبھنا رہی تھیں ، ہماری سماعت سے لپٹی جارہی تھیں ، تاہم اس کی منجھی ہوئی بے نیازی مطمئن تھی ۔ سجے سجائے لہجے اور نپی تلی آواز میں پیوست لفظوں کے رنگ برنگے قمقموں سے سب کچھ جگمگا رہا تھا ۔ وہ اپنی ذات کے متعلق بتلا رہی تھی کہ میری ہڈیوں میں رینگتی ہوئی مشرقیت میرے بتلانے ہوئے مصنوعی راستے سے بھٹک گئی ۔

"آپ کے والد کیا کرتے ہیں ۔"

کہ ہمارے دیس میں، ہماری تہذیب میں، فرد سے زیادہ اس کا حسب نسب معتبر ہوتا ہے۔ ابھی میں اپنے سوال کے بھونڈے پن کی اذیت سے تلملا رہا تھا کہ اس نے جرنلسٹوں کی پیشہ ورانہ مصروفیت کے رکھ رکھاؤ سے جواب دیا۔

"وہ جیل میں ہیں۔"

"میری دھلی دھلائی نستعلیق اور ثقہ سماعت پر ایک تھپڑ سا لگا______!

"انقلابی ہیں؟"

کبھی کبھی سوال معلومات میں اضافہ کرنیکے لئے نہیں، بلکہ اندر کی چوٹ کو سہلانے کیلئے کئے جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ سوال کرکے اپنے کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

"نہیں وہ چور ہیں۔"

"پیشہ ور چور"

"پہلے بھی کئی بار جیل جا چکے ہیں۔"

میری قوت گویائی سراب میں مچھلیوں کیطرح لفظوں، کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابھی میں نئے موضوع کی تلاش میں مبتلا تھا کہ اس نے دوسرا وار کیا۔

"میری والدہ مانٹی کارلو میں ہیں۔"

"اور اس عمر میں بھی اچھا خاصہ کمالیتی ہیں۔"

جیسے کوئی کسی دوسرے ملک کے انجان آدمی کے متعلق اخبار میں چھپی ہوئی خبر پڑھ رہا ہو۔

میرے جسم میں سب کچھ سن ہو چکا تھا، صرف آنکھیں زندہ تھیں، جن کے سامنے وہ میز کی ایک طشتری سے انصاف کر رہی تھی۔ میری اندرونی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے سینما ہال میں کہانی کے نقطۂ عروج تک پہونچتے پہونچتے بجلی فیل ہوگئی ہو۔ میں نے کچھ کہا تو اس چنگھاڑتے ہوئے شور میں خود مجھے اپنی آواز اجنبی معلوم ہوئی۔ وہ آرام سے کافی کی چسکیاں لے رہی تھی اور میں خود اپنی نگاہ سے گر چکا تھا، حقیر ہو چکا تھا۔ تہذیب اور تمدن، سماج اور کلچر، شرافت اور نجابت، شخصیت اور ماحول، قدر اور روایت سب کسی کباڑی کی دوکان پر زنگ لگے خالی ڈبوں کیطرح ڈھیر پڑے تھے اور میں کہانی کے اس کردار کیطرح اپنے آپ سے شرمسار تھا جس کے جگمگاتے ہوئے لباس کو بغداد کے بھرے بازار میں کسی جادوگر نے اتار لیا ہو۔ مشرق جس کا سینہ آسمان سے اتارے ہوئے تمام صحیفوں، تمام

آفتابوں کی روشنی سے روشن رہ چکا تھا، بے نور ہو چکا تھا اور اس غلیظ تاریکی نے ذہن کی آنکھوں پر لوہے کی مہریں لگا دی تھیں۔

جب میں ریستوران سے باہر آیا تو پہلی بار علم ہوا کہ میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں اور لوگ کانوں تک آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہے ہیں ــــــــ اور تمام بدن میں آگ کی سوئیاں چبھ رہی ہیں ــــــ اور میرے لستعلیق باطن نے میرے پیروں میں بھاری، بھاری، گرم گرم زنجیریں ڈال دیں اور میں ایک جگہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ پھر ملنے کی تاب نہ رہی۔ اس کی ایک ایک ادا ایک ایک نگاہ اصرار کر رہی تھی کہ میں اسے جامع مسجد تک چھوڑ آؤں، لیکن میں موجود ہی کہاں تھا۔ میں تو مدت کا اپنے آہنی خول میں بند ہو چکا تھا، رائیگاں ہو چکا تھا۔

وہ مجھ سے رخصت ہو کر سڑک پر بہتے ہوئے آدمیوں کے ریلے میں کھو چکی تھی، لیکن ــــــــ میں اسی طرح اپنی سوچ کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا کھڑا تھا۔ پھر خواب ٹوٹ گئے۔ خواب ٹوٹ ہی جاتے ہیں۔ پھر میں نے اپنی بکھری ہوئی کرچیں جمع کیں اور اپنے آپ کو یاد دلایا کہ چھ بج رہے ہیں، ابھی لالچپت نگر جانا ہے۔ ریاض کے ساتھ کھانا کھانا ہے اور اس کے ساتھ اختر کو خوش آمدید کہنے ایرپورٹ پہونچنا ہے۔ خیالوں میں بھی اپنے محبوبوں کے چہرے زندگی کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے سردی لگی۔ زندگی کا احساس تکلیف ہی سے ہوتا ہے۔ موت تو بے حس بنا دیتی ہے۔

پالم کا لاونج مرکری ٹیوبز کی دودھیا روشنی میں نہا رہا تھا، روشنی نے رنگ کو خوشرنگ، لباس کو خوش لباس اور صورت کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے "میک اپ" ماحول نے معمولی کو غیر معمولی کر دیا تھا۔ سب کچھ اتنا عارضی، اتنا مصنوعی اور اتنا غیر ملکی معلوم ہو رہا تھا جیسے پردہ سیمیں پر ہالی ووڈ کی کسی فلم کا منظر کھلا پڑا ہو۔ باہر لاونج کے بالکل سامنے کھردرے سرمئی پتھر کا ڈریگن کھلے ہوئے جبڑوں میں بیضنہ سنگیں سنبھالے پانی اچھال رہا تھا۔ جمادات کی کوکھ سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔ فن کا ایک لمس پتھر کو پارس بنا دیتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا سوچنا چاہئے۔ اسی وقت ریاض پر جھکا ہوا، باتیں کرتا ہوا ایک پولیس آفیسر قریب سے گذرا اور ریاض نے اطلاع دی کہ فلائیٹ دو گھنٹے لیٹ ہو گئی ہے۔

لوہے کے گول بکس میں کافی کے کاغذی گلاسوں کی لاشیں چرمرائی پڑی تھیں۔

استعمال شدہ گلاس جو اپنا مصرف پورا کر چکے تھے اور جو زندہ تھے کافی کارنر کی بلوریں الماری میں قطار در قطار سجے ہوئے تھے۔ جیسے بیرک میں کھڑے ہوئے سپاہی اپنے مصرف کا انتظار کر رہے ہوں۔ پولیس آفیسر نے کافی پیش کرتے ہوئے اطلاع دی کہ اس نے مجھے پہلے بھی دیکھا ہے اور ریاض کی چبھتی ہوئی نگاہ مجھے ٹٹولنے لگی۔ میں چپ رہا۔ اجنبیوں کیطرح کھڑا قریب سے گذرنے والوں کو دیکھتا رہا، چکھتا رہا، پیتا رہا______!

کہ اچانک وہ نظر آ گئی دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سوٹ کیس اٹھائے ہوئے جو دبلی حاملہ بکریوں کے پیٹوں کیطرح پھولے ہوئے تھے۔ سنہرے بالوں اور سرخ داڑھیوں والے دونوں ساتھی اس کے دونوں پہلوؤں سے لسے ہوئے ہر چیز سے بے نیاز چلے آ رہے تھے۔ میرے پاؤں خود کار مشین کیطرح چلنے لگے۔ میں نے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کی لیکن اندر کہیں بریک فیل ہو چکے تھے۔ اسے دیکھتے ہی زیاں کا احساس ہوا۔ کوئی ٹیپ ریکارڈ چلنے لگا تھا۔

ابھی کافی دنوں ہندوستان میں رہنا ہے آگرہ، ایلورا، اجنتا، کھجوراؤ۔"________

لیکن وہ جا رہی تھی؟________ اور وہ جیسے جیسے قریب آتی گئی لاؤنج میں لگی ہوئی مرکری ٹیوبز کی روشنیاں اور تیز ہوتی گئیں________ اور اپنی ہی روشنی میں وہ کچھ اور منور ہوتی چلی گئی اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا، لیکن اسطرح گویا نہیں دیکھا اور میرے بریک اچانک ٹھیک ہو گئے۔ میں نے بھی اس ایک ادا پر قناعت کر لی کہ آدھا مشرق قناعت کی روٹی پر زندہ ہے۔

اندر اجات کے کاؤنٹر پر جو سیدھی لکیر کھڑی تھی اور جسے "کیو" کہا جا رہا تھا، اس میں وہ دور سے نظر آ رہی تھی اور اس کے دونوں طرف دونوں ساتھیوں کے زندہ "بریکٹ" لگے ہوئے تھے۔ پھر اندر اجازت مکمل ہو گئی اور وہ دونوں سوٹ کیس جو دبلی پتلی سیاہ حاملہ بکری کے پیٹ کیطرح پھولے ہوئے تھے، اس خود کار مشین پر رکھ دیے گئے جو کینوس کی پتلی سی سڑک کیطرح حد نگاہ تک چلی گئی تھی۔ وہ تھوڑی دور چلے، پھر رک گئے۔ پھر وہ دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے گئے۔ مشین کیطرح چلتے ہوئے دو پولیس افسر کہیں سے پیدا ہوئے۔ اس کے دونوں ساتھیوں کے کندھے پر دو ہاتھ اچک کر بیٹھ گئے اور سب شیشے کے ایک پارٹیشن میں کھو گئے________ اور وہ بھی ان کے ساتھ غروب ہو گئی۔

سب کچھ اسی طرح موجود تھا۔ پرسکون، میکانکی، مصروف، لیکن سب کچھ جیسے بدل

گیا تھا۔ بدصورت ہوگیا تھا۔ "میک اپ" ڈھل گیا تھا۔ باطن پر پڑے ہوئے برص کے دھبے اور مکروہ اور گھناؤنے ہوگئے تھے۔

———— * ————

جنگل

آسمان پہ بادلوں کے ہاتھی لڑ رہے تھے ۔ نیچے کا پورا حاشیہ ان کے تازہ تازہ خون سے پڑا دہک رہا تھا ۔ اور ایک کونے سے اتری ہوئی دھوپ کی پتلی سی سنہری چادر گرانڈیل درختوں کی کاہی پھنگیوں پہ پڑی سوکھ رہی تھی ۔ بوڑھے بوڑھے برگد اپنے اپنے آنسوؤں پہ خود فراموش سے بیٹھے تھے اور دھیمی آوازوں میں منتر پڑھ رہے تھے ۔ لانبی لانبی جٹاؤں میں خیال راگوں کی آوازوں کے آشیانے تھے ۔ گیان دھیان، تیاگ، تاپ سب ان کی چرنوں میں ہاتھ جوڑے کھڑے تھے ۔ ان کے تمام بدن میں لال لال پھل لگے ہوئے لال لال منکے پروئے ہوئے تھے ۔ ایک ایک منکے میں ایک ایک صدی نے اپنا خون نچوڑ کر بھر دیا تھا اور وقت ان سے اپنی زندگی اور بقا کی دعائیں مانگتا اور آشیرباد پاتا گذر رہا تھا ۔ ان کے چرنوں میں سرسبز و شاداب بیلیں سیس نوائے پڑی تھیں جن پہ پیلے پیلے پھول جگمگا رہے تھے ۔ حد نگاہ تک روشنیوں کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔ ان کے آگے نئے نئے جوان درختوں کے غول تھے ۔ تمام کے تمام جسموں پہ ہری ہری پوشاک اور موٹے موٹے اکلوتے سیاہ پیروں میں مٹی کے بڑے گول جوتے پہنے کھڑے تھے ۔ بیٹھے تھے ۔ لیٹے تھے ۔ کسی کے شانے پہ کسی کا سر دھرا تھا ۔ کسی کی کمر میں کسی کا بازو پھنسا تھا ۔ اور دور، بھورے بھورے میدان میں ہری ہری دوب کے ٹکڑے بچھے تھے جیسے کسی نے جگہ جگہ کاہی کھدر کا فرش بچھا دیا ہو ۔ انھیں کے پاس ایک بیضاوی تالاب تھا جیسے بڑا سا آئینہ چمک رہا ہو ۔

دور ------ گنجان جھاڑیوں کے سرے پہ کچی شاخوں کے گول پھاٹک میں سبز پتیوں کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں اور سرخ پھولوں کے قمقمے بل رہے تھے اور خودرو بوٹیوں کی خوشبو آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی کہ اچانک کسی طرف سے ایک گانے نکلی جو سفید مخمل کی

جرسی اور سلیکس پہنے ہوئے تھی۔ شیشے کیطرح چمکیلی البیلی کمر ایسی کہ کنگن میں سمٹ جائے۔ کمر سے باہر نکلے ہوئے پلے ہوئے کولہے جیسے طبلوں کی جوڑی برابر سے رکھی ہو۔ کھری چاندی کی بنی ہوئی سڈول ٹانگیں جن کے ایک ایک روئیں پہ درجن بھر ستاروں کی برسوں کی کمائی ڈول رہی ہو۔ جب وہ چلتیں تو معلوم ہوتا جیسے صبح کے خوش آواز پرندوں کی آوازوں کا نغمہ مجسم ہوگیا ہے اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پہ کھلے ہوئے برف کے پھولوں کی کنواری خوشبو کو بدن مل گیا ہو۔ پھر وہ سیاہ نکیلے سجیلے سینگوں کا آبنوسی مکٹ اٹھا کر اسی طرح کھڑی ہوگئی جیسے نوشکی کی نرتکی ناچتے ناچتے ایک دم سے تھم گئی ہو اور سارا جنگل دم سادھ کر خاموش ہو گیا ہو اور اس کا انتظار کر رہا ہو جو پردہ غیب سے ظہور میں آنے والا ہے۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ پشت پہ جھولتے ہوئے چنور کو جس کا دستہ کچی چاندی کا تھا اور بال سیاہ ریشم کے تھے ہلکی سی جنبش دی۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی جیسے فطرت کو حرکت کا سبق سکھلا رہی ہو۔ اس بیضاوی آئینے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی جسے برف پوش پہاڑوں کی سال بھر کی عبادت نے اس کے لئے آسمان سے اتار لیا تھا۔ کنواری سیاہ آسودہ حیران آنکھیں جو سماجی زندگی کے تمام چمکیلے خوابوں سے چمکیلی تھیں آئینے پہ جھک گئیں۔ پہنارنوں کی لانبی گردن کھینچ گئی۔ اپنا آپ دیکھا۔ سبک اور مضبوط ٹانگوں پہ سدھا ہوا کسا ہوا سڈول جسم جیسے لباس سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر غرور سے گردن گھمائی کہ معلوم نہیں کسطرف سے ایک صاحب دوہری "نو" کے سیاہ جوتے پہنے خشک پتیوں اور سوکھے پھولوں کے قالین پہ بھاری بھاری قدم رکھتے چرمر کرتے آئے اور اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ وہ کہ اپنی ہی سج دھج میں مست تھی ناگواری سے مڑنے لگی لیکن ان صاحب نے ٹھوڑھی بڑھا کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے پہلو بدل کر دیکھا تو دیکھتی رہ گئی سرمئی پولسٹر کا سوٹ اتنا نفیس سلا ہوا کہ بدن کا ایک ایک پیچ و خم چمک اٹھا۔ لو دینے لگا۔ گردن میں سیاہ سمور کا ہلکا سا نیلا سا اسکارف بندھا ہوا تھا جس کا چھوٹا سا آخری سرا سینے میں جھول رہا تھا۔ صاحب نے جو نسوانی نگاہوں میں سرسراتا ہوا اشتیاق دیکھا تو اپنی آنکھوں سے تمام اجنبیت نکال کر پھینک دی اور تمام جہان کی لگاوٹ انڈیل لی۔ مغرور آنکھوں سے اس کو دیکھا۔ محبوب کو دیکھا۔ ایک سسکاری بھری خوشی کا اظہار کیا۔ محبوب نے محبوبوں کیطرح وحشت برتنے کی کوشش کی۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ اپنے چنور سے مکھیاں اڑائیں۔ اب وہ چلنے کیلئے کسمسا رہی تھی کہ ان صاحب کا چربی سے لدا ہوا سرمئی ہاتھ دراز ہوا اور اس کے

گول ریشمی شانے میں پیوست ہو گیا۔ اور پھر جیسے اچانک ہونٹوں سے دھواں نکلنے لگا۔ ہر چند کہ اس لمس کی آگ کے انتظار میں ان گنت صدیاں بیدار رہ کر گذاری تھیں تاہم اس نے جھوٹی شرم کا سوانگ بھرا اور میٹھی میٹھی ناگواری کا اظہار کیا۔ پھر اس کی رگ میں دوڑتی ہوئی حیا نے مڑ کر اپنے ماحول کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ کتنی بھلی بری اور اپنی بیگانی آنکھیں بندوق کی نال کیطرح اس پر لگی ہوئی ہیں۔ اس نے تڑپ کر اپنے ہونٹ چھڑا لیے لیکن اس کے مضبوط ہاتھ لپکے اور بدن کے نشیب و فراز سے گذر کر کمر کے خم میں بیٹھ گئے اور ساتھ ہی کتنی ہی رقیب لالچی اور پیاری آنکھوں کی گرم گرم لال لال نظریں جلتے ہوئے سورجوں کیطرح اس کے جسم میں اترنے لگیں۔ وہ خود بھی اس منظر سے نڈھال ہونے لگی جو تمام جذبوں کے انجام کا آغاز ہے۔ اس نے ان آنکھوں کا خوف اپنی ہڈیوں میں رینگتا محسوس کیا اور بڑی لگاوٹ سے کمر میں دھنسے ہوئے ہاتھ پر تھپکی دی اور اپنے چھوٹے چھوٹے نازک نازک آبنوسی سینگ جن سے جوانی کی صندل کی خوشبو آرہی تھی اس کی سخت گردن پر جما دیے۔ جیسے بازوؤں میں چٹکی بھری جاتی ہے اس نے انکار کی تہہ میں تڑپتے ہوئے اقرار کی پاگل کر دینے والی خوشبو سونگھ لی اور اپنے مضبوط سینگ اس کے پہلوؤں میں رکھ دیے اور اسی کے ساتھ ساتھ گھومنے لگا اور سرخ سرخ آنکھوں سے برستی ہوئی آگ میں اپنا آپ بھسم کر ڈالنے والے لمحے کا انتظار کرنے لگا۔

دور جنگل کی داتی میں مٹی کے چھوٹے چھوٹے کچے کچے گھر نظر آرہے تھے جیسے کسی کمہار نے اپنے تازہ تازہ اتارے ہوئے برتن سوکھنے کیلئے جما دیے ہوں۔ ان کی دیواروں پر روشنی کی قلعی تھی اور دروازوں پر سائے کے پردے پڑے تھے۔ وہ دونوں ایکدوسرے کو پہلوؤں سے ڈھکیلتے ہوئے نئی نئی دریافت کی ہوئی پناہ گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ آسمان کے تخت پر بیٹھے ہوئے سورج دیوتا کا سنہرا مکٹ کجلا گیا۔ نہ جانے کسطرف سے جادو کے ہاتھ نکلے اور گرانڈیل درختوں کی پھنگیوں پر یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی مہکتی ہوئی سونے کی چادر اتار کر تہہ کر لی۔ حد نگاہ تک جلتے ہوئے پھولوں کے لال لال چراغ بجھ گئے۔ کھادی کا نیا نیا بچھا ہوا کاہی فرش آپ ہی آپ سمٹ گیا۔ زندہ پھولوں اور مردہ پتیوں کا دورنگا قالین جیسے خود بخود لپٹ گیا اور جسطرف نگاہ جاتی ہری ہری اور نیلی نیلی آنکھوں کے جوڑے انھیں پیچھا کرتے نظر آتے لیکن وہ آگ جو

دو جسموں کے پتھر کی ٹکر سے روشن ہوئی لپکنے لگی اور وہ دونوں سم سے سینگ تک آتشبازی کے دو درختوں کیطرح جلنے لگے اور دونوں اپنی اپنی آگ میں ایک دوسرے کو بھسم کر ڈالنے کے لئے قریب سے قریب تر ہونے لگے لیکن ابھی وہ ایک دوسرے کی خوشگوار گرمی سے مانوس بھی نہ ہونے تھے ایک دوسرے کی خوشبو میں شرابور نہ ہونے تھے ایک دوسرے کے جذبے کی شدت سے آشنا بھی نہ ہونے تھے کہ ایک آواز آئی۔

وہی آواز جو بڑے بڑے دماغوں تک پہنچتی ہے تو مذاہب جنم لیتے ہیں۔ شریعتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ تہذیبوں کی مشعلیں روشن ہوتی ہیں ایجاد وجود میں آتی ہے۔ ہنر کی بنیاد اور فن کی داغ بیل پڑتی ہے۔ آئین رواج پاتے ہیں قانون روشناس ہوتے ہیں اور وہی آواز جب دلوں سے ٹکراتی ہے تو پہاڑوں کے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور دودھ کی نہریں بہنے لگتی ہیں۔ نجد کے ویرانے آباد ہوتے ہیں اور کچے گھڑوں کے سہارے طوفانی دریاؤں کو پایاب کرنے کے معصوم اور مقدس خواب دیکھے جاتے ہیں اور یہی آواز جب پیٹ سے بلند ہوتی ہے تو سازش پھنکارنے لگتی ہے۔ بغاوت ہتھیار بجنے لگتی۔ انقلاب تخریب کے رتھ میں تعمیر کے گھوڑے جوڑنے لگتا ہے۔ صدیوں کے کمائے ہوئے تہذیبی اور فنی کارنامے خود اپنے ملبے کی قبروں میں دفن ہو جاتے ہیں۔

اس آواز کے ساتھ ہی اس کا بھاری بھرکم جسم بل گیا۔ لرز گیا۔ اور وہ آندھی میں گرے ہوئے درخت کیطرح ڈھیر ہو گیا لیکن وہ اسی جگہ کھڑی رہی۔ اس کے جیتے جاگتے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگتی رہی لالچی اور رقیب اور مسرور آنکھیں اس کے اور قریب آ گئیں۔ اس کے سر پر ہزاروں آوازوں سے رنگین خاموشی کا شامیانہ اسی طرح کھڑا رہا۔ ندیموں اور رقیبوں کے قرب سے آباد تنہائی اس کے وجود کی آخری تہہ تک اتر گئی پھر وہ چلی جیسے برسات کا پانی چڑھائی پر چڑھتا ہے اور اس لہو تر اور مقدس مقام تک پہنچ گئی جہاں برگدوں کے مہارشی اپنے آسنوں پر بیٹھے اپنے خاموش منتروں کا جاپ کر رہے تھے اور گیان دھیان تاپ اور تیاگ کی دیواروں کے نیچے کھڑی رہی۔۔ یہاں تک کہ ایک درخت کیطرح سو گئی۔

*

مجریٰ

حضرت پور کی چھوٹی گڑھی پر سورج کی کرنیں اتر رہی تھیں جیسے ٹوٹے ہوئے دلوں پر یادیں اترتی ہیں ۔بستی کے زانو پر لیٹی ہوئی سڑک کے کنارے چھدرے کھیتوں اور گنجے درختوں کے اس پار دور تک لکھوری اینٹوں کا کھنڈر چلا گیا تھا ۔ دوزانو بیٹھی ہوئی دیواروں ، رکوع میں کھڑی ہوئی محرابوں اور سجدے میں پڑے ہوئے ستونوں پر نماز میت کی سی ہولناک خاموشی برس رہی تھی ۔ یہ عمارتیں خوش نصیب انسانوں کیطرح اچانک مر کیوں نہیں جاتیں ۔ بد نصیب زبانوں اور اداروں اور مریضوں کی طرح کیوں سسکتی رہتی ہیں ۔

دروازوں کی جگہ اینٹوں کے ڈھیر کی چھوٹی سی پہاڑی جو بردے کی دیوار کی "بیگار" بھگت رہی تھی ۔ اس کا چکر کاٹ کر اکھڑے ہوئے کھڑنجے کے اونچے نیچے فرش پر جوتے بچاتا ہوا چبوترے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا جوتے اتارے اور دالان کیطرف کھسکنے لگا ۔

"جے ہو سرکار کی ------ راج پاٹ بنا رہے"

جمعدار کے منہ سے یہ جملہ اسطرح نکلا جیسے میونسپلٹی کے نل سے پانی نکلتا ہے ۔ میکانکی ، مردار الفاظ ، کھوٹے سکے ۔میلی آواز کی کبڑی پرچھائیاں "کیا ہے منگو" مدقوق دیواروں میں جڑے ہوئے مبروص کواڑوں سے آواز آئی ایسی آواز کانوں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو آنکھوں کے ساتھ عریاں بدن کرتا ہے ۔

"درجن پور والے آئے ہیں ۔ سرکار سے ملنے"

شیطان کی آنت کیطرح لمبے کمرے کے جہازی پلنگ پر پڑے ہوئے آدمی نے سنسنا کر سر اٹھایا ۔ اپنے ڈھیلے گوشت سے بھرے بدن پر جھولتی بنیان اور چارخانے کی

تہہ بند کو دیکھا اور آواز دی۔

"بیگم مجھے کپڑے پہنا دو ۔۔۔۔۔انورودھ سنگھ آئے ہیں"

بیگم نے تخت پر چڑھ کر کھونٹی سے تنزیب کا کرتا اور کلف کیا پاجامہ اتار لیا کیوں آئے ہیں" اور ادھیڑ عورت کے سفید چہرے پر دھوئیں کا سایہ لرز گیا اور ازار بند کے نیفے میں لٹک گئی "میاں نے صرف شانے ہلا دیے کہ ایک زمانے سے پیسوں کیطرح وہ آواز بھی کفایت سے خرچ کرنے لگے تھے۔ گلے میں کرتا ڈال کر پرانے دھندلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔سفید مونچھوں کی نوکیں مروز مروز کر سیدھی کیں۔ایک پرانی بوتل سے مہوے کی شراب کے چند قطرے ہتھیلی پر لے کر مونچھیں سینچ لیں۔ بیگم نے کی چوکی پر ایرانی جانماز بچھا کر تکیہ لگا دیا۔اور پاس ہی آبنوس کی ٹوٹی ہوئی اکلوتی کرسی رکھدی۔ ٹھاکر انورودھ سنگھ کے دالان میں قدم رکھتے ہی وہ بر آمد ہوئے۔بغل گیر ہو کر ان کے منہ سے گانجے کی خوشبو سونگھی اور ان کی ناک پر اپنی مونچھوں سے پھریری کی اور کرسی پر بٹھا دیا۔

دونوں ایک دوسرے کے چہرے پڑھتے رہے ایکدوسرے کی تباہی کی حد کا اندازہ لگاتے رہے اور دونوں کی نگاہوں کے نیچے سے بیس بائیس سال پرانی عیاشیوں اور بدمعاشیوں، ناکامیوں اور کامیابیوں کے روپہلے اور سنہرے قافلے گذرتے رہے۔

"یار شیخ تم بھی اپنی طرح بوڑھے ہو گئے"

"بوڑھے؟ بادشاہ اور بندر کبھی بوڑھے نہیں ہوتے"

اور دونوں دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے رہے

"اچھا جلدی سے یہ بتاؤ کہ سب خیریت ہے"

"خیریت ۱۹۵۴ء تک ہوا کرتی تھی اور اب تو مدتوں سے۔۔۔۔۔پھر بھی تم اطلاع کے لیے سوار ہو گئے"

"کوئی کسی کے پاس کیوں آتا ہے کچھ دیکھنے دکھانے یا کچھ سننے اور سنانے کو آتا ہے اور ہمارے تمہارے پاس اب دیکھنے دکھانے اور سننے سنانے کو بچا ہی کیا ہے"

"سچ کہتے ہو۔۔۔۔۔سچ کہتے ہو۔"

"تمہارا بھتیجا ہے نہ۔۔۔۔۔بابو سنگھ"

"ہاں ہاں، اس کے"

"اس کے لڑکے کا گونا ہے"

"اتنا بڑا ہو گیا ------ بابو سنگھ"

"مبارک ہو ------ مبارک -------- نیوتہ آیا تھا"

"نیوتہ تو غیروں کے پاس آتا ہے ۔ تمہارے پاس "ڈالی" آئی ہو گی ۔"

"ہاں، ہاں "ڈالی" ہی آئی تھی"

"تو خواہش ہوئی کہ مرنے سے پہلے ہم تم آخری بار ایک اچھا سا گانا سن لیں ایک اچھا ناچ دیکھ لیں"

"بائیس سال ہو گئے ۔ کان صرف گالیاں سنتے ہیں آنکھیں صرف دکھتی ہیں بقول تمہارے اب دیکھنے سننے کو رہا بھی کیا"

"سو تو ہے ۔ لیکن میں بھی بائیس سال میں پہلی بار آیا ہوں تمہارے پاس بلکہ شاید آخری بار"

"کیا بات کرتے ہو یار ۔ اگر تم نے سپاہی بھیجکر سر منگایا ہوتا تو کاٹ کر بھجوا دیتا"

پھر دیر تک دونوں ایکدوسرے سے آنکھیں چھپائے بیٹھے رہے ۔

"بیگم ----- اگر کچھ بھی نہیں تو پانی ہی بھجوا دو"

"کیا نحس بکتے ہو یار ----- ہاں تم فکر مند مت ہونا ۔ میں سواری بھیج دونگا تمہارے لئے"

"چلنے سے پہلے تم نے بھنگ کھائی تھی ۔"

کیا مطلب"

"تم بھول گئے کہ ہم عمر بھر ریل میں اس لئے نہیں بیٹھے کہ وہ سواری ہماری نہیں تھی"

"ہاں ---- سچ مچ بھول گیا تھا ----- اچھا یہ تو ہو سکتا ہے کہ تم رات بھر کے لئے میری سواری خرید لو"

رات بھر کے لئے سواریاں نہیں عورتیں خریدی جاتی ہیں ۔ جب سے وقت خراب ہوا ہے ہم نے اپنی اصلاح کر لی ۔ شکار اس طرح چھوڑ دیا کہ چڑیوں کا نام بھول گئے ۔ دسترخوان اٹھا دیا کہ اکیلے بیٹھکر دال روٹی کھانیکے لئے اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے ۔ انتہا ہے کہ پیچوان کا حقہ ختم ہو چکا ہے سواری کے نام پر صرف اپنی ٹانگیں رہ گئی ہیں لیکن تم

فکر مت کرو، رام باغ تو کتنا بارہ کوس پر ہے -----میں اپنی سواری پر آجاؤنگا۔"

"تم معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہو گے ------یہ سب کچھ بابو سنگھ کر رہا ہے اور اس کی آرزو ہے کہ حضرت پور والے بابا ضرور پدھاریں، نہیں تو اپنا حال بھی۔"

"چلو خوش نصیب ہو کہ ایک بابو سنگھ تو ہے، یہاں تو کوئی کنکر سنگھ اور پتھر خان بھی نہیں"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا، کون خوش نصیب ہے تم، یا ہم"

جب سورج چڑھنے لگا، اور ان کا حساب معدوم ہندسوں کی بھول بھلیوں سے باہر نہ نکل سکا اور بیگم کھانا لئے بیٹھے بیٹھے اوب گئیں تو چٹیاں کستی ہوئی دالان میں آئیں دیکھا کہ میاں گاؤ سے لگے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر کھڑی رہیں۔ پھر ان کے پاس ہی چوکی کے کونے پر ٹک گئیں۔

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"

"کھانا کہاں بیگم ------روٹی کہا کرو روٹی ----کھانا کھائے تو مدتیں ہو گئیں -------زبان ذائقہ بھول گئی"

"جو بھی ہے اس کا شکر ہے"

"ایک بات کہوں"

"فرمائیے"

"تمہارے پاس کچھ ہے؟"

"ہوں" نکاح کی تہ اور انگوٹھی بچ رہی ہے"

"لے آؤ"

"لے تو آؤنگی لیکن ------"

مجھے انرودھ سنگھ کے یہاں جانا ہے، اسی طرح جانا ہے"

"ہوں"

"ذرا یہ الیکشن وغیرہ کا چکر ختم ہوئے تو زمین کی قیمت چڑھے گی اور مجھے اس کی ضرورت نہیں"

"لیکن ایک بات آج میں بھی کہونگی"

"کہو"

"میں ماکھن سنار کے ہاتھ نہیں بیچونگی ----- بیچونگی تو دین دیال کے ہاتھ"

"دین دیال گپتا"

"ہاں -----اور اپنے ہاتھ سے بیچونگی"

"وہی گپتا جو ہمارے نکاح میں آنے سے پہلے کوٹھے کا چکر لگایا کرتا تھا"

میرے کوٹھے کے تو ایک دنیا چکر لگایا کرتی تھی لیکن اب اس کا ذکر کیا۔ وہ کھیت اجڑ گیا وہ چڑیاں اڑ گئیں"

"لیکن ایک شرط"

"اسے علم نہ ہو کہ سودے کا حال مجھے معلوم ہے"

"اتنی سی عقل تو خدا نے مجھے بھی دی ہے"

"درمیان میں صرف آج کی رات ہے"

"ابھی جمعدارن کو بھیجتی ہوں"

جاننے والے جانتے ہیں کہ دیہات کی بڑی بڑی کہانیوں میں ناونوں اور میراثیوں کا وہی رول ہوا کرتا تھا جو آج سنیما اور فون کا ہوتا ہے۔

دروازے کے پاس بچھی ہوئی سیاہ لمبی کرسی پر دین دیال گپتا بیٹھے ہی تھے کہ کواڑوں کے درمیان سیاہ چوڑیوں سے بھری ہوئی ایک کلائی جگمگانے لگی۔

"ذرا انھیں آنکیے سیٹھ جی"

"آنکھوں کی طرح ان کے کان بھی چوندھیا گئے ------- ڈوبتے سورج کی گلابی روشنی میں نگینوں کو غور سے دیکھنے لگے۔"

"میرے نکاح کے زیور ہیں"

"انمول ہیں"

"انھیں نکالنا چاہتی ہوں۔ آپ کو اس لئے تکلیف دی گئی کہ آپ ہی سے کہہ سکتی ہوں کہ سرکار کو اس راز کا علم نہ ہونے پائے"

اس کے ہاتھ کانپنے لگے

"میری پہنچ سے باہر ہے"

"نہیں چاہتی کہ جن زیوروں پر میرا نکاح پڑھا گیا ان پر آپ کے علاوہ کسی دوسرے کی پرچھائیاں بھی پڑے۔"

دیر تک وہ اعصاب کو سمیٹتا رہا اپنے حواس سنبھالتا رہا تب کہیں بولنے کے قابل ہو سکا۔

"کہاں تشریف لے گئے ہیں"

"قبرستان تک گئے ہیں فاتحہ پڑھنے"

"آپ کی بات سن کر ہمت پڑی کہ آج میں بھی اپنے جی کی بات کہدوں، اگر آپ حکم دیں"

"کہہ ڈالو"

"اس انگوٹھی کا اگر کوئی مول ہو سکتا تو اتنا کہ آپ ہاتھ نکالیں اور میں پہنادوں"

اور وہ دیر تک انگوٹھی پکڑے دروازے کے پاس کھڑا کانپتا رہا اور دبی دبی سسکیوں کی گھٹی گھٹی آوازیں سنتا رہا۔۔۔۔ آخر کار دروازے کی طرف گردن بڑھائی۔

"میرے لئے کیا حکم؟"

"میں سمجھی تھی ۔۔۔۔ تم بھول چکے ہو، چلے جاؤ یہاں سے"

الفاظ اس طرح نکلے جسطرح زمبور جبڑے سے کیلی دھاڑیں نکالتا ہے۔

"بھولنے بھلانے کی جو چیز ہے وہ بھلا چکا ۔۔۔۔ صرف آپ کے حکم کا پالن یاد ہے جو چوتھائی صدی سے نبھا رہا ہوں اور جب تک جیتا ہوں نبھاتا رہونگا۔"

کرتے کی اندرونی جیب سے سبز نوٹوں کی ایک گڈی گاؤ پر رکھی اور اس کے بیچ و بیچ انگوٹھی سجادی۔ اچانک محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ کی پشت پر آنکھیں جڑی ہوئی ہیں۔

یہ کیا کر رہے ہو؟"

"دکھشنا دے رہا ہوں ۔۔۔۔ تمہاری انگوٹھی چھونے کی دکھشنا"

اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سنتوں کی پہاڑی کے پیچھے کھو گیا۔

مدتوں کے بعد لکھنؤ کے اجن درزی کا سلا ہوا چوڑی دار پاجامہ پہنا تو پنڈلیوں پر جھول گیا۔ بیگم نے بھیگے بھی دانے کی پیالی بڑھادی جس میں انگلیاں ڈبو ڈبو دیر تک آئینہ کے سامنے مونچھوں کے ڈنک بناتے رہے۔ عطر تحفہ میں بسا ہوا جامدانی کا انگرکھا پہنا تو بند لٹک گئے۔ زربفت کے جوتے پاؤں میں ڈالا تو محسوس ہوا کہ جوتا چھوٹا ہو گیا ہے۔ آنکھ اٹھا کر بیگم کو دیکھا تو دیکھتے رہے سنبھال کر رکھا ہوا سنورا سجایا جسم دمک رہا تھا جیسے پرانی اصیل تلوار کا مورچہ چھڑا کر چمکا دیا گیا ہو اور مدتوں بعد ان کی دراز بانہوں کے کنگنے کسمسانے لگے

"اتنے دنوں تک کہاں چھپیں رہیں بیگم تم تو پہچانی نہیں جا رہی ہو"

"اللہ بخشے امی جان کہا کرتی تھیں کہ جوانی میں تو کتیاں بھی حسین ہوتی ہیں جو بڑھاپے میں بھی حسین رہے وہ حسین"

"جیسے تم"

"نہیں جیسے آپ"

کملائے ہوئے سرخ و سفید پھولوں کے گلدستے سے بانہیں نکال کر اپنے سفید پنے برابر کئے پلے کو ترچھا کیا اور بیگم کے ہاتھوں کی گوری منہ میں رکھی اور باہر نکل آئے نکلتے ہی کہاروں کے ہجوم نے گھیر لیا

"کیا بات ہے ------ تم لوگ کیسے آئے"

کہاروں کے مہتا نے پاؤں چھو کر ہاتھ جوڑ لئے "سرکار رام باغ جا رہے اور ہم کو حکم نہیں ملا"

"تم ----- تم لوگ ------ تمہارا حساب کئے بیس سال ہو گئے"

"لیکن ہمارا حساب تو ابھی باکی ہے سرکار"

"کیا مطلب"

"ہمارے ہوتے ____ آپ رام باغ پیدل نہیں جا سکتے"

"تمہیں دینے کو ہمارے پاس کچھ نہیں رہا، کچھ نہیں بچا"

"ہمارے پاس آپ کا دیا بہت کچھ ہے 'اب آپ اجاجت دیا کیجئے"

"مہیتا نے حق خدمت میں ملی پالکی لگا اور مولا کہاروں کا ہجوم طعپتا وہ گیت گاتا چلا جو صدیوں سے انکی برادری میں رائج ہے۔

گاؤ سے پشت لگاتے ہی محسوس ہوا کہ وہ جوان ہو گئے ہیں۔ان کی ریاست ان کو واپس مل گئی ہو اور انھوں نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور جیسے آنکھ جھپکتے ہی رام باغ آ گیا۔ خوبصورت وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ بابو سنگھ پاؤں چھو کر جوتے سیدھے کرنے لگا تو انھوں نے اسے کلیجے سے لگالیا۔ انرودھ سنگھ کے ساتھ ان گنت سلام لیتے وہ کوٹھی کے ہال میں پہنچے تو جیسے دیواریں تک کھڑی ہو گئیں۔

مسند سے پشت لگاتے ہی مُہا کرنے ہاتھ کا اشارہ کیا اور سازندوں کی انگلیاں سازوں پر تڑپنے لگیں۔ابھی ان کی رچی ہوئی کڑھی ہوئی سماعت انگڑائیاں لے رہی تھی اور آنکھیں مل رہی تھی کہ ایک طرف سے ایک عورت پشواز پہنے طلوع ہوئی اور ان کے قدموں

میں کھڑی ہوکر مجری 'کرنے لگی ۔ زانو کے نیچے سے سرخ بٹوا نکالا اور ایک سبز نوٹ ان کے ہاتھ میں پکڑادیا اب ان کی نگاہ جسم کی پار کھ نگاہ نے اس کے بدن کا طواف کیا تو وہ سر سے پاؤں تک آشنا معلوم ہوئی ۔ وہ ایک ایسا مرصع طغریٰ نظر آئی جس کے ایک ایک دائرے ایک ایک زاویے ،ایک ایک کشش اور ایک ایک نقطہ سے ان کے حواس سیراب رہ چکے ہوں ۔ سازندوں کی چوکی پر نگاہ پڑی تو ایک بھاری بھرکم شاندار عورت نے کھڑے ہوکر اور بڑی دور تک سر جھکا کر آداب پیش کیا اور کسی نے ان کے کان مین کہا۔

"مشتری"

کیسی کیسی قاتل راتوں اور جان لیوا محفلوں کا جلوس ان کے سامنے سے گزرنے لگا ۔ پھر انھوں نے محفل کا جائزہ لیا جس میں عجیب عجیب قسم کی پتلونیں اور انوفی قمیض پہنے کچھ اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کی کوئی کل سیدھی نہ تھی ۔ان کی ایک آستین سے جوانی اور دوسری سے شراب آتش ٹپکایا جارہا تھا۔شراب ایسی اور اتنی بے حرمتی پہلی بار دیکھی تھی ۔ ان کی نگاہیں اور قہقہے اتنے بے ادب تھے اور ہاتھوں اور ہونٹوں اور ابروؤں کے اشارے اتنے گستاخ تھے کہ وہ نظریں نیچی کر کے سنک کی مہنال سے کھیلنے لگے سوچنے لگے کہ ہمارے یار انرودھ سنگھ کے جلال واقبال کو کیا ہوا کہ اس طرح خاموش ہے ۔

پھر انھوں نے ساری محفل میں دین دیال گپتا کی جستجو کر ڈالی پھر بے قرار ہو کر نھا کر سے پوچھ ہی لیا۔

"تم نے دین دیال گپتا کو نہیں بلایا

"بلایا تھا لیکن وہ لکھنو گیا ہے کسی مقدمے میں"

"مقدمہ کاہے کا رہن بیع کا کوئی چقدمہ ہو گا"

"اور کیا مقدمے تو ہم لڑتے تھے کہ پورے پورے ضلعے ملنے لگتے تھے ،خیر چھوڑو، کچھ لوگے ۔"

"ان لونڈوں کے سامنے"

"اسکا انتظام اندر ہے"

لیکن دین دیال کے خیال سے ان کا دل اس طرح دھڑ کا کہ بیقرار ہو گئے ۔ایک ہی دو ہاتھ میں بٹوا خالی کیا اور کھڑے ہو گئے ۔ نھا کر لپک کر سامنے آئے ۔

"تمہاری بھاوج کی طبیعت اچھی نہیں ہے ۔میں ذرا دیکھ آؤں"

"وعدہ"

"وعدہ"

پالکی سڑک پہ چھوڑ دی گئی۔

ٹوٹی ہوئی دیواروں کے حجیچوں سے اندر پہنچے۔ پیش دالان میں لالٹین کے بجائے لیمپ جل رہا تھا۔ کرسی پہ دین دیال گپتا بیٹھا تھا۔ سامنے چوکی کے کونے پہ چھوٹا سا بکس کھلا رکھا تھا۔ پھر کواڑوں کی درازسے بیگم کا ہاتھ ایک بڑی سی تھیلی سنبھالے بر آمد ہوا۔

"ہاں ------- یہ زیورات میرے ہیں ----- لیکن تم کو کیسے ملے"

"آپ کے زیور بارہ برس سے بک رہے ہیں اور میں خرید رہا ہوں"

"تم"

"ہاں میں"

"کیسے"

چودہ برس ہونے میں نے ماکھن سنار سے سودا کیا تھا کہ بیگم کا جو زیور وہ خریدے سوفی صد منافع پہ میرے ہاتھ بیچ دے۔ اس طرح آپ کا تار تار امانت ہو گیا۔

"لیکن کیوں"

تمہارے نکاح کے زیوروں پہ میرے علاوہ کسی کی پرچھائیں بھی تم کو پسند نہیں۔ میں جانتا تھا کہ تم ایک دن مجھ سے کہوگی۔ سو بھاگیہ سے آج وہ دن آگیا۔ جینے میں مزا تو مدت سے نہیں تھا۔ لیکن --------- تھوڑے دنوں سے۔ بیمار بھی رہنے لگا ہوں معلوم نہیں میرے بعد کس لڑکے کے ہاتھ کیا لگے اور وہ کیا سلوک کرے ------ اس لئے اب تمہیں انھیں سویکار کر لو ------- قبول کر لو۔

اور وہ چپ چاپ سر جھکائے ہوئے باہر چلا گیا اور میاں نے ستون کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا گویا وہ ستون نہیں دین دیال گپتا ہے۔

ایک کہانی

کبھی کبھی کوئی رات ہمارے وجود کو اس طرح ڈھانپ لیتی ہے کہ موجود خوشیوں کی قندیلیں گل ہو جاتی ہیں بیتے لمحوں کا قافلہ بجھتے چراغوں کا جلوس اور اڑتے ستاروں کا کارواں گذرنے لگتا ہے۔ ٹوٹے کانٹوں کی کھٹک سے سارے وجود میں درد کی روشنی پھیل جاتی ہے اور ذہن ماضی کا آشیانہ بن جاتا ہے۔ ماضی ------ چار لفظوں او تین اس ایک لفظ میں چاروں سمتیں اور تینوں ترلوک سما گئے ہیں۔ ماضی ہی تو سب کچھ ہے حال تو لمحوں کی ایک پتلی سی دھار ہے جو ہمارے جسم کو چھوتی ہوئی ماضی کے سمندر میں کھو جاتی ہے اور مستقبل وہ خواب ہے جو دن میں دیکھا جاتا ہے اور جس کے معدوم ہاتھ پہ خدا کے وجود سے انکار کرنے والے منطقی ذہن بیعت کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک رات اپنے تمام ستاروں سمیت اس کے سینے میں اتر آئی تھی۔

"تم رو رہی ہو"

اس نے چونک کر تکیوں سے سر اٹھایا۔ لانبی چمکیلی نم سرخ آنکھوں پہ سیاہ دراز پلکوں کا مور چھل ہلنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے حمام میں گھس آیا ہو۔ اس نے خوبصورت خیالوں کے ضدی بچوں کو پھسلا کر ذہن کے باہر نکال دیا ایک ایک دریچہ بند کر لیا ابھی وہ الفاظ کا انتخاب کر رہی تھی کہ خود اس نے اپنی اجنبی سی آواز سنی۔

"آپ اتنی خاموشی سے آجاتے ہیں کہ"

"ہاں بد نصیبی بھی اتنی ہی خاموشی سے آتی ہے۔"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر جمیل کو دیکھا جو سرمئی سوٹ میں سجا بنا اس پہ جھکا کھڑا تھا، ٹائی پن کے ننھے ننھے ہیرے مرکری لائٹ میں تڑپ رہے تھے۔ سرخ و سفید

چہرے پر فکر کا بادکا بادکادھوں لرز رہا تھااور ہاتھوں سے سگار کی خوشبو ٹپک رہی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ جمیل کے ہاتھ کی گرفت میں چھوڑ دیا۔

"تم جب بھی تنہا ہوتی ہو رونے لگتی ہو"

اس نے ابھر کر گاؤ تکیہ کی مسہری کی ملائم پشت کا سہارا لیا۔ گردن اٹھا کر جمیل کا دیکھا جو ہفت رنگ پردے کے ساکن فریم کیطرح لگ رہا تھا۔ اس نے گردن جھکالی۔ سرخ قالین میں اس کے سیاہ شیشے کے جوتے دھنسے ہوئے تھے۔ گھٹنوں کے پاس سے کریز ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا چھوٹا سا جملہ وجود کی آخری تہہ تک اترتا چلا گیا تھا۔ یہ شخص میری روح کی معدوم چوری پکڑنے پر تلا ہوا ہے۔ میرے زخمی خیالوں اور لہولہان خوابوں کا تعاقب کرتا رہتا ہے اوراسے اپنے چہرے پر چڑھا ہوا ماسک چٹختا محسوس ہوا۔ پھر جیسے آنکھوں کے زخم رسنے لگے۔ اس نے اپنے آپ پر طاری ہوتی ہوئی خود فراموشی کو پوری قوت ارادی سے روک لیا۔ چونک کر پمی کو دیکھا جو سرخ ٹائلوں کی دیوار کے پاس اسٹیل کے جھولے میں سو رہا تھا۔ اس کی لڑکھڑاتی نظروں کو سہارا مل گیا۔ اس نے جمیل کے سفید مضبوط ہاتھ کو آہستہ سے دبا دیا اور پھر اس بے ضرر سی حرکت پر خود ہی شرما گئی۔

"تاجو ------ آج تم سے ایک بات کہوں؟"

وہ اندر ہی اندر کانپ گئی جیسے پولیس قاتل سے پوچھنے والی ہو کہ یہ لاش کس کی ہے۔ اس نے جمیل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ چند لفظوں کا چھوٹا سا جملہ اس کے کانوں پر کنکھجورے کیطرح رینگنے لگا۔ وہ اس وقت بھی ایسی ہی جان لیوا بیقراری میں مبتلا ہوئی تھی جب اس نے ابو اور امی کے غمزدہ چہرے دوہری بتیوں کے پرانے لیمپ کی زرد روشنی میں پڑھے تھے۔ دور تک پھیلا ہوا سنگین آبائی مکان ان گنت نوکروں کے ہجر میں ویران پڑا تھا اور اسے اپنے آپ پر کسی دوسری ہستی کا گمان ہو رہا تھا ابو اور امی کسی المیۂ فلم کے بوڑھے کرداروں کیطرح سامنے بیٹھے تھے۔ وہ چوروں کیطرح کھڑی رہی۔ سالخوردہ چاندنی کے گوشے پر رکھے ہوئے بد قلعی خاصدان سے آخری سوکھا ہوا پان نکالکر ابو نے بغیر دانتوں کے سرخ منہ میں رکھ لیا۔

بیٹی آج تم سے ایک بات کہوں۔

پہلی بار اسے اپنے وجود کا احساس ہوا تھا۔ ساری قوت گویائی کا سہارا لے کر وہ صرف ایک لفظ کہہ سکی۔

"جی"

ابو نے اس کے چہرے سے نگاہیں اٹھا کر سامنے طاق میں رکھ دیں اور ان کی آواز سے لفظوں کے آنسو ٹپکنے لگے۔

"خوش نصیب باپ جب اپنی بیٹیوں کی شادی کرتے ہیں تو جہیز دیتے ہیں اور جب اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے ہیں تو قیمت وصول کرتے ہیں۔ میں ایسا ہی بد نصیب باپ ہوں بیٹی۔"

پھر وہ دیر تک ہانپتے رہے۔ پان چباتے رہے اور وہ ان کے الفاظ کی آنچ میں پگھلتی رہی۔

میں اگر تمہاری شادی کر دوں تو قرض کے دلدل میں ایک ہاتھ اور دھنس جاؤں اور اگر رخصت کر دوں تو نکل کر صاف ستھری زمین پر آجاؤں۔

جمیل سیدھا کھڑا تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر جب کپڑے بدلنے کے لیے دوسرے کمرے میں جانے لگا تو اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ لیکن تاجو کے کانوں میں زہر ٹپک رہا تھا۔

"بیٹی ----- میں جمیل کا مقروض ہوں اور اس کے گھر سے تمہارا پیام آیا ہے۔"

جیسے سماعت کی ساری طاقت سلب ہو کر رہ گئی۔ سارا وجود سن ہو گیا۔ پھر جیسے لفظوں کے تازیانے پڑنے لگے اور اس کے حواس بیدار ہو گئے۔

"میں تمہاری امی کا بھی مقروض ہوں اور"

اس کی امی اس کی سوتیلی ماں اس کو گھور رہی تھیں۔ سرخ سورجوں کیطرح تیز نظریں اس کو داغ رہی تھیں، پھر اچانک اس پر جیسے نشہ سا چھا گیا۔ نسائیت کا وہ نشہ جو قربانی کو عبادت میں رنگ دیتا ہے جو موت کو خوبصورت اور چتا کو گلزار بنا دیتا ہے۔ پہلی بار اسے موقعہ ملا کہ اپنی سوتیلی ماں پر ایک چھوٹے خاندان کی ایک معمولی سی عورت پر اپنی شرافت اور نجابت کا اظہار کر سکے۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ سر سے پاؤں تک جلنے لگی

"میں آپ کے تمام قرضے ادا کر دونگی"

اور وہ اس طرح بھاگی جیسے کسی کا خون کر دیا ہو جیسے اپنا خون کر لیا ہو۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہونے لگی تو مرحوم ماں کے شفیق سائے نے اسے اپنی گود میں لے لیا ساری رات وہ ایسی کہانیاں سنتی رہی جو لڑکیوں کی قربانیوں اور وفاشعاریوں سے لبریز

تھیں ۔ ساری رات وہ فلمیں گھومتی رہیں جن کے خونی انجام سے اس کی اپنی زندگی کو رنگین ہونا تھا اسے اپنی بربادی سے زیادہ اس انداز بربادی کے اس پرانے پن پر افسوس تھا کاش اس کی تباہی کی داستان میں کوئی اچھوتا پن ہو ۔ پھر اس کو ایک کہانی یاد آئی اور اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے ۔ ماضی کے کہانی کار نے جب کسی خاص جسم میں کسی خاص روح کو دیکھنا چاہا ہو گا اور اس کام کو بشریت سے دور جانا ہو گا تو ایک طلسم کے ذریعے ایک بدن کی روح دوسرے بدن میں ڈال دی ہو گی ۔ یہ ماورائی اور طلسمی کام میں بھی تو انجام دے سکتی ہوں ۔ اپنی روح کو جس پر مجھے کا حق تھا اپنے بدن کی پابند بنادوں جسے جمیل نے خرید لیا ۔ وہ اپنے خیال کی ندرت پر مسکرا دی جیسے اپنی کچی قبر کے لیے زرکار کتبہ میسر آ گیا ہو ۔ اسی رات اس نے اپنا آپ بدل ڈالا اپنے چہرے پر ایک اور چہرہ چڑھا لیا ۔

"تاجو کپڑے بدل ڈالو"

وہ اٹھنے لگی تو جمیل نے سلیپر اس کے سامنے رکھ دیے ۔

"یہ کیا کرتے ہیں آپ"

"کاش میں کچھ کر سکتا"

وہ سیدھی ہوئی تو آنکھیں جمیل کی آنکھوں میں سما گئیں ۔ آنکھیں جن کی بولی ہر زبان بولنے والا سمجھتا ہے ۔ آنکھیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتیں اور جن کی سچائی کے سمندر میں بڑی بڑی لمبی زبانیں ڈوب جاتی ہیں ۔

"تاجو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم کہتی ہو کہ تم میرے گھر میں خوش ہو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ذرا اپنی آنکھیں تو دیکھو"

"آنسو ۔۔۔۔۔۔ یہ تو خوشی کے ہیں ۔۔۔۔۔ محبت کے ہیں"

لیکن مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے ۔میں تو مسکراتی ہنستی قہقہے لگاتی محبت چاہتا ہوں ۔

"اوں ۔۔۔۔۔۔ اچھا"

اور وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی رہی ۔ اسے اپنے جسم پر دو بانہیں نظر آئیں اور آنکھوں پر گرم گرم بھاپ محسوس ہوئی ۔ اس کی پلکیں جھپکنے لگیں ۔ ماضی کے ورق الٹنے لگے ۔ روشن ہونے لگے ۔

باہر ابھی مود لگی تھی ۔ اندر مہمان آنے لگے تھے ۔ میراثنوں کے قافلے اتر پڑے تھے ۔ ڈھولکیں گرجنے لگی تھیں اور وہ دوسری منزل کے ایک برج میں منتقل ہو گئی تھی

جس پر مانجھے کا سرخ پردہ پڑا تھا۔ اور چاروں طرف امی کی مشکوک نگاہوں کا پہرہ کھڑا تھا۔ وہ کہانیوں کی شہزادیوں کیطرح قید تھی۔ اس رات بھی وہ آنسوؤں کے چراغ جلانے اپنے مستقبل کی وہ کتاب پڑھ رہی تھی جو اس کے ہاتھ سے چھین لی گئی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ اس کے پاس صرف ادھیڑ رات بیٹھی جاگ رہی تھی۔ یادوں نے ہر ذہنی لڑکیوں کی طرح سارے ذہن میں گھوڑ دوڑ مچا رکھی تھی۔ کہیں آنسو لڑھکا دیے کہیں ہنسی بکھرا دی کہیں پرانے خواب ڈھیر تھے کہیں کوئی تعبیریں کہ زمرد بوا آ گئیں جنھوں نے اسے دودھ پلایا تھا اور دودھ بڑھائی کی تقریب میں سونے کے کڑی پانے تھے اور جن کا بکھان کرتی کرتی وہ بوڑھی ہو گئی تھیں۔

"کیا ہوا ہے بوا۔"

"بڑا غجب ہونے گوا"

"کیا ابھی کوئی اور غضب ہونے کو باقی ہے"

"پالن پور والے بھیا آنے گئے ہیں"

"ہجے" جیسے اس کی سماعت کو بجلی کے ننگے تار نے چھولیا۔

کہہ رہے ہیں کہ اگر بٹیا صاحب نائن آئیں تو وہ گڑھی داخل ہوتے جائن گے انجام جون ہونیے ہونے جانے۔

"کہاں ہے ___ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔

پائیں باغ کی دیوار کے نیچے کھڑے ہیں آپ گھڑی بھر کے لیے چلے چلئے۔ پہرے پر مورا فضلو ہے اور میاں اندر سونے رہے ہیں

وہ اندھیارے باغ کی ویران روشنوں سے لڑ کھڑاتی ہوئی گذر رہی تھی کہ ٹارچ کی روشنی نے اس کی رہنمائی کی۔ دیوار کے سائے میں شہتوت کے درخت کے نیچے چبوترے پر چاندنی کی چادر بچھی تھی۔ اس پر شمع کی روشنی کا چھوٹا سا گول قالین پڑا تھا۔ اور دور تک سیاہ سائے کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ سہم گئی۔ ہجے نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا سیاہ بوٹ سیاہ برجس ----- سیاہ جرکن سیاہ آواز۔

"تاجو ہم تمہیں لینے آئے ہیں"

"کیا مطلب ----- تم نے یہ جسارت اس لیے کی کہ میرے باپ بوڑھے بیمار اور کنگال ہو گئے ہیں۔"

"تاجو۔۔۔۔۔۔ تم کس سے اور کیا کہہ رہی ہو۔"

"تم نے صولت پور بیٹی کو برناپور کی طوائف سمجھ رکھا ہے کہ جب برہم ہونے آدمی بھیج کر پکڑ والیا"

"تاجو"

"میرا نام تاج النسا، بیگم ہے۔"

وہ اور قریب آ گیا۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔

میں سمجھا تھا کہ یہ شادی چچی جان رچا رہی ہیں۔۔۔۔۔۔ اچھا تاج النسا بیگم صاحب اپنی زبان سے فرمادیجئے یہ سب کچھ آپ کی اپنی مرضی سے ہورہا ہے۔"

"ہاں میری شادی میری مرضی سے ہورہی ہے"

"تم"

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ میں جمیل سے محبت کرتی ہوں۔ تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پالن پور کے نام کے راجہ تم مجھے کیا دے سکتے ہو۔ میں ایک محتاج خانے سے نکل کر دوسرے محتاج خانے میں داخل ہونا نہیں چاہتی۔ میں آرام سے زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔

"اور تم کل سنو کہ وہ جمیل بد قوما نو دولتا ٹھیکیدار کسی بندوق کا نشانہ ہو گیا تو"

"تو میں تمہارے اوپر قتل کا مقدمہ چلاؤنگی اور ایک ایک اینٹ بیچ کر لڑونگی۔"

وہ چمک کر پیچھے ہٹا اور اس کے ہاتھ کا کوڑا کھل گیا۔ ساتھ ہی ایک درخت کی آڑ سے پالن پور کا بوڑھا مختار نکلا اور اس کے ہاتھ سے کوڑا چھین لیا۔

"یہ آداب ریاست کے خلاف ہے سرکار۔۔۔۔۔۔ آپ بنیا صاحب پر بندوق اٹھا سکتے ہیں کوڑا نہیں۔"

"تم اس کی باتیں سن رہے ہو۔"

"میرے کان مختار عام کے کان ہیں سرکار جو نامناسب باتوں کا سننا بے ادبی جانتے ہیں۔"

وہ چبوترے پر ایک پاؤں رکھے دیر تک کھڑا رہا۔ پھر برجس کی جیب سے ریوالور نکالا۔ چیمبر کھولا پانچ کارتوس ہتھیلی پر ٹپک پڑے وہ انھیں دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولنے لگا۔

ہم اگر تم کو نہ بھی چاہتے ہوتے تو بھی تم ہماری بہن تھیں اور ہماری زندگی میں کوئی شخص تم سے تمہاری مرضی کے بغیر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ہم تو پالکی لے کر آنے تھےسوچا تھا آج تمہیں لے جائیں گے لیکن --------تم نے ہم سے کچھ کہا تو ہوتا ۔تم نے اپنی قیمت مانگی تو ہوتی ۔ ہم پالن پور کا ایک ایک تنکا بیچ ڈالتے اور تم کو خرید لیتے ۔اور اگر تمہارا بھاؤ بڑھ گیا تھا تو ہم پالن پور کے ایک ایک گاؤں کا پیکر مر کرتے اور ایک ایک دروازے کے سامنے ہاتھ پھیلاتے کہ ہماری سات پشتوں کی رعایت کے صلے میں نہیں اپنی ماؤں اور بیٹیوں کے صدقے میں بھیک دو کہ پالن پور کی ہونے والی بیگم نیلام ہو رہی ہے اور اگر ہماری بد نصیبی ان کا خون سفید کر دیتی اور آنکھوں کر مروت مر جاتی تو ہم تاج النساء بیگم تمہارے لیے ڈاکے ڈالتے ۔ تمہاری اس گڑھی میں بر دونی سے ۔بہرائچ تک کسی ڈاکو کا بھی گردہ اگر داخل ہو گیا ہوتا تو یہاں گولی چل رہی ہوتی اور لاشیں بچھ رہی ہوتیں لیکن ہم کھڑے ہونے ہیں اور اس طرح کہ پرندہ پر نہیں مارتا ۔ہم کو ڈاکہ ڈالنے کے لیے گڑھیوں میں نہیں ان مکانوں میں جانا پڑتا جن کی دیواریں ہمارے ہاتھیوں سے نیچی اور دروازے ہمارے سپاہیوں سے کمزور ہیں ۔لیکن تم نے ہم کو بولی تک بولنے کا موقع نہ دیا ۔ہم نے جانا تھا کہ ہمارے گھر کی بیبیاں چنے بھی چبائیں گی تو زعفران کا ذکار لیں گی ۔ ٹاٹ پہنیں گی تو بھی رانیوں کیطرح جگمگائیں گی ۔ ہم نے تو روپے کو ہاتھ کا میل جانا ہم کو کہاں معلوم تھا کہ وہ تمہارا خدا ہو چکا ۔اپنے کانوں سے ہاتھ ہٹاؤ کہ پھر کبھی مخاطب نہ کی جاؤ گی ۔ یہ کہاں معلوم تھا کہ تم برنا پور کی طوائف کیطرح عشق مجھ سے کرو گی اور بیٹھ جاؤ گی کسی ساہو کار کے گھر میں --------بولو --------خدا کے لیے کچھ بولو ورنہ سارے صولت پور کو پھونک دونگا ناس کر دونگا۔

"میں بولوں یا برنا پور کی طوائف؟"

"تم دونوں"

برنا پور کی طوائف کہتی ہے کہ دنیا میں طوائفوں کی کمی نہیں ۔ کوئی اور طوائف ڈھونڈ لو اور مجھے چھوڑ دو اور اگر صولت پور کی بیٹی کی بات مان سکتے ہو تو مان لو کہ تمہاری زمینداری ایک بار اور فیل ہو گئی ۔ تم قتل کا ایک اور مقدمہ ہار گئے ۔

تاجو مر گئی البتہ میں زندہ ہوں

پالن پور والوں نے تو اس لڑکے کو جسے دنیا بچہ کہتی ہے ۔یقین نہ ہونے دیا کہ

اس کی زمینداری فیل ہو چکی ۔ قتل کا مقدمہ ہم کہاں ہمارے سپاہی ہارتے ہیں ،ہماری زمینداری تو آج فیل ہوئی ۔۔۔۔۔۔قتل کا مقدمہ تو ہم آج ہارے اور یہ بھی کہ جب مجھے کہیں دیکھو تو اسطرح گویا پہلی بار دیکھ رہے ہو ملو تو اسطرح گویا پہلی بار مل رہے ہو ۔

"فرض کرو یہ پہاڑ میں نے کاٹ بھی لیا تو؟"

میرے آنسو تمہاری امانت ہوں گے ۔ میری یادیں تمہاری جاگیر ہونگی ۔

"ورنہ"

"ورنہ میں تم سے اسطرح ڈرتی رہونگی جسطرح لوگ طاعون سے ڈرتے ہیں ۔

"تم رو رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ہم سے نفرت کرنے والے بھی اب رونے لگے ۔۔۔۔۔

مختار عام اس عورت کو میرے سامنے سے ہٹائے جاؤ ورنہ صولت پور پھونک دونگا ناس کر دونگا ۔"

"ٹھہرو ہم نے سوچا تھا کہ جب تم پالن پور آؤ گی تو ہم پالن پور کی کنجیاں تمہیں نذر کریں گے لیکن یہ تمہاری تقدیر میں نہ تھا یہ کارتوس لئے جاؤ معلوم نہیں کس پر تمہارے شوہر کا نام لکھا ہو ۔

"سیڑھی لگاؤ"

سیاہ سائے جو چہروں پر ڈھاٹے باندھے اور بندوقیں پہنے تھے جیسے زمین سے پیدا ہو گئے ۔ لکھوری اینٹ کی پرانی دیوار سے سیڑھی لگا دی وہ جسطرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا ۔ ایک بار مڑ کر بھی نہ دیکھا ۔ اس کے دانتوں نے نچلا ہونٹ داب لیا ۔جب گرم گرم آنسو آنکھوں کے گوشے بھگونے لگے تو اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا ۔

کمرے میں زیر دبلب جل رہا تھا ۔ مسہری پر جمیل سینے تک چادر اوڑھے لیٹا تھا ، پمی کا پالنا خالی تھا ۔ آیا پمی کو لے جا چکی تھی وہ اٹھی اور خالی پالنا جھلانے لگی ۔

گلابی جاڑوں کی صبح سونے کی ڈلی کیطرح دمک رہی تھی ۔ پمی کو اس کی آیا ٹہلانے لے گئی تھی ۔ جمیل ٹہلنے گیا تھا ۔ وہ کشمیری ہاؤس کوٹ پہنے باہر برآمدے میں پیتل کے گملوں کے پاس کھڑی ، پھول دیکھ رہی تھی کہ ایک آدمی ستون کی آڑ سے نکلا اور اس پر ایک خط پھینک کر پورنیکوں کی بیلوں میں غائب ہو گیا ۔ تھوڑی دیر تک وہ دم بخود سی کھڑی رہی ۔ پھر خط گریبان میں ڈالکر ڈرائنگ روم میں گھس گئی ۔ دروازے کا پردہ برابر کیا اس کی طرف پشت کر کے خط پڑھنے لگی ۔

"میں نے چار برس چالیس برسوں کیطرح گذار دیے ۔میں بوڑھا ہو گیا ہوں ۔میں چار سو برس بھی اسی طرح گذار دیتا لیکن مجھے تمہاری شادی کا راز معلوم ہو چکا ہے میں بہت جلد جمیل کو راستے سے ہٹا دونگا اور زندگی میں تمہاری شرکت حاصل کر لونگا۔"

اسے محسوس ہوا جیسے پورا ڈرائنگ روم اس کے دل کی دھڑکن سے گونج رہا ہے ۔ اس نے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی ۔ وہ سنبھل رہی تھی کہ کھڑکی کے شیشوں پر ایک سایہ لرز گیا ۔اس نے جلدی سے خط کو گریبان میں رکھ لیا ۔پھر جمیل کے ہاتھوں کی شرارتیں یاد کر کے اس نے خط پھر نکال لیا ۔اب دالان میں کرمچ کے جوتوں کی مخصوص اور مانوس آہٹ اور قریب آ گئی اور اس نے گھبرا کر فرش کے سفید قالین کا کونا اٹھا کر خط کو چھپا دیا ۔اور وہ جلدی جلدی کھڑکیاں کھولنے لگی ۔ مڑی تو جمیل سامنے کھڑا تھا۔

"کون آیا تھا؟"

"جی"

"کوئی آیا تھا"

"نہیں تو ------- کیوں؟"

اپنی بھاری آواز اس کو خود اجنبی معلوم ہوئی ۔

اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے ۔ سانسیں الجھ گئیں ۔ وہ نِل لیں کی آرائشی چیزیں الٹنے پلٹنے لگی ۔ پھر اس نے دیکھا کہ جمیل سارے کمرے کا چکر کاٹ کر قالین کے اسی کونے کے پاس کھڑا ہو گیا اور جوتے کی نوک سے اسی گوشے کو کرید رہا ہے اور اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے ۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی ۔اعصاب کی کمان ٹوٹنے لگی ۔اندر جانے کے لیے مڑی تو لڑکھڑا گئی ۔اور جمیل کے ہاتھوں نے دراز ہو کر سنبھال لیا ۔جب ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں اپنی مسہری پر تھی ۔ کرسی پر ڈاکٹر بیٹھا تھا اور اس کے تکیے کا سہارا لیے جمیل کھڑا تھا ۔اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی ۔نگاہ ملتے ہی وہ اس کے قریب آ گیا ۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد آیا نے ممی کو اس کے قریب جھکا دیا ۔ کچھ دیر کے بعد اس نے جمیل کو اپنے پاس بلایا ۔وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں ۔مانو گے !"

"تم مجھ سے کچھ جھوٹ بول کر دیکھو کہ میں کسی طرح مان لیتا ہوں ۔"

"نہیں ------میں سچ بولونگی۔ کچھ بھی نہیں چھپاؤنگی۔ پمی کو اس کی شہادت میں پیش کرتی ہوں۔"

"پمی کو بیچ میں کیوں لاتی ہو جو تم میری قسم کھالو۔ جھوٹی قسم کھالو۔"

"تم بچے کو جانتے ہو-----پالن پور کے چودھری ساجد علی خاں کو۔"

"ہاں جانتا ہوں"

"مجھے اس سے محبت تھی -----جسطرح لوگوں کو عمارتوں سے، پھولوں سے اور رسموں سے محبت ہوتی ہے۔ بے لوث اور بے ریا، پاک اور معصوم۔"

اس نے تاجو کے بالوں سے انگلیاں نکال لیں ----لیکن تاجو کو پتہ بھی نہ چلا۔

"اگر ممکن ہوتا تو میں اس سے شادی کرتی۔ لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا۔ شادی تم سے ہوگئی اور میں نے تمہارے حقوق کی حفاظت کی -----تمہارے اور اپنے لئے نہیں پمی کے لئے --------پمی کے مستقبل کے لئے --------میں نے سوچا تھا کہ یہ راز میرے ساتھ میری قبر میں دفن ہو جائے گا لیکن یہ میری قسمت میں نہ تھا۔ اب جب کہ تم وہ خط پڑھ ہی چکے ہو تم سے -------"

"کون سا خط تاجو------میں نے تمہارا کبھی کوئی خط نہیں پڑھا-----میں نے آج تک تمہارا بکس نہیں چھوا میں نے آجتک -------"

"چھوڑو ان باتوں کو-------میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سنو-------اس کے علاوہ اگر تم جاننا چاہو گے تو فضول ہو گا، بے مصرف ہو گا اور اس کو بھی اگر بھول جاؤ گے تو تمہاری نہ سہی میری اور پمی کی زندگی خوشگوار ہو جائے گی۔

تم نے جو کچھ کہا میں نے مان لیا۔ میں نے تو کچھ جاننے کو خواہش بھی نہ کی تھی تم نے بتلا دیا تمہارا احسان ہے۔ رہا یہ کہ میں سچ مانتا ہوں یا جھوٹ تو میں قول ہار چکا۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو بھی میرے لئے سچ ہے۔ میں نے تم سے شادی کی تمہارے ماضی سے نہیں، ہاں یہ ضرور ہوا کہ اب یہ راز صرف تمہاری ایک قبر میں نہیں بلکہ ہم دونوں کی قبروں میں الگ الگ دفن ہو گا۔

"سچ"

"سچ"

اور وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دیر تک دونوں کی شفاف بے

رہا آنکھیں آنسوؤں کی زبان میں باتیں کرتی رہیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتی رہیں۔

اس روز وہ ڈرائنگ روم کا پیٹرن بدل رہی تھی۔ پرانے پردوں کی جگہ نئے پردے لگ رہے تھے تصویروں کے زاویے اور صوفوں کے غلاف بدلے جا رہے تھے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ جمیل اسی جگہ کھڑا تھا اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ اس نے یونہی بغیر کسی خیال اور نیت کے جھک کر قالین کا گوشہ اٹھا لیا۔ وہ خط اسی طرح پڑا تھا۔ کانپتی انگلیوں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کی تہہ پر گرد کی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر نوکروں پر ڈالی اور مطمئن ہو کر خط کو لیے ہوئے کھڑکی کے پاس گئی۔ بلتی ہوئی انگلیوں سے سنبھال کر دھندلی آنکھوں سے پڑھا پھر اس کے پرزے ہونے لگے اور وہ خلا میں آنکھیں گاڑے کھڑے رہی ----------- سوچتی رہی ----------- اس نے کیا کیا ------- کیا کیا۔

———— * ————

سامی

نیم سار سے آٹھ دس کیلو میٹر کے فاصلے پر ناک کی سیدھ میں چلتی ہوئی گومتی اچانک دست پنے کیطرح گھوم جاتی ہے جیسے دانو کو دیکھ کر ڈرگئی ہوا اور الٹے پیروں لکھنو کیطرف بھاگی ہو ۔ پھر چار پانچ کیلو میٹر بھاگ کر مڑ گئی ہو گویا کسی دیوتا نے سر پر ہاتھ رکھ دیا ہو اور وہ پھر سج سج ، ٹھمک ٹھمک چلنے لگی ھو ۔ گومتی کے اس عجیب و غریب موڑ کے بیچوں بیچ سامی آباد ہے ۔ تحصیل ملر کہ کا تخت گاؤں جس میں چھوٹے چھوٹے چوبیں موضع لگتے تھے ۔سفید حاکموں کی کالی حکومت زمانے میں پورا سامی بڑے بڑے زمینداروں میں پٹی پٹی بٹا ھوا تھا اور یہ زمیندار آپس میں بسوے بسوے کی حقیقت کے لیے بندوقیں اٹھاتے تھے اور چیف کورٹ پر دھاوا بولتے تھے ۔ لیکن اس باہمی لڑائی کے نتیجے میں سامی جیسے تیس لگان بھر کر اور آدھی روٹی کھا کر لمبی تان کر سوتا تھا ۔ زمینداروں کی بے گار بھگتتا تھا اور نہ کارندوں کی گالی گفتار سہتا تھا ۔ سامی کے تین طرف گومتی میابرا جتی تھیں اور اور چوتھی طرف کالے کالے پانی کا لہریں مارتا بڑا سا تالاب ہر موسم میں کھانستا کھنکارتا پہرا دیا کرتا تھا ۔ تالاب کی داتی پر بانس کی اتنی اونچی جھاڑیاں کہ ہاتھی چھپ جانے اور اتنی گھنی جھاڑیاں کہ سانپ کے چیتھڑے اڑجائیں آج بھی اسی طرح کھڑی ہیں ۔ آج بھی علاقے بھر کے شوقین انھیں بانسوں سے کمانیں بنسیاں اور لاٹھی بناتے ہیں ۔ تالاب کے پچھم میں گومتی کی ترائی کا پچمیل جنگل تھا جس میں علاقے بھر کے کالے تیتر بسیرا کرتے تھے ۔ تالاب میں کالے کالے منگور اچھلتے رہتے ۔ نہ تیتروں پر کبھی کوئی بندوق اٹھی اور نہ منگوروں پر کبھی کوئی بنسی چلی ۔ جیسے سامی کے باسیوں کی شرن میں تالاب اور جنگل دونوں لہلہا رہے ہوں ۔اسی سامی میں ہماری بھی چار پیسے کی پٹی تھی ۔

سالی اور اس کے تالاب اور اس کے جنگل کی آبادی اور آزادی کے پیچھے ایک کہانی ہے جو انسانوں کے حافظے کی گود میں پلی اور تہذیبوں کے بل یعنی ظلم کی فصلوں کے سائے میں جوان ہوئی اور جو ہزاروں برس تک دنیا کے مختلف تمدنوں کے درمیان اسٹاک ایکسچینج کے فرائض انجام دیتی رہی۔

مشہور ہے کہ جب راجہ نل پر بپتا پڑی پیروں کے نیچے سے راج کی دھرتی نکل گئی اور ہاتھوں سے بیوی بچوں کے ہاتھ چھوٹ گئے اور وہ دیس بدیس مارے مارے پھرتے ہوئے اس تالاب کے کنارے پہنچے تو بھوک سے نڈھال ہو کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر سستا کر اٹھے۔ بانس کی ٹہنیا سے ایک بنسی بنائی اور ایک بانس کی ملائم لمبی پھنگی میں چارہ ڈھونڈ کر باندھا اور تالاب میں پھینک کر بیٹھ گئے۔ ایک منگور پھنس گیا۔ راجہ نل نے مچھلی نکال کر صاف کی۔ سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر بنایا۔ چقماق سے آگ جلائی جب مچھلی بھن گئی تو تالاب میں اشنان کیا اور پتل پر بیٹھے ہی تھے کہ مچھلی اچھل کر تالاب میں جا گری۔ عقیدہ ہے کہ تالاب کے تمام منگور اسی بھنی ہوئی مچھلی کی نسل سے ہیں۔ بھوکا راجہ تھوڑی دیر نراش بیٹھا رہا پھر اٹھا۔ وہی عورت اب بھی گھاس چھیل رہی تھی جس سے کھرپا مانگ کر بنسی کاٹی تھی۔ اب کی بار بانس کاٹ کر کمان بنائی۔ ایک بانس کی لچکیلی پھنگ سے چچ بنائی دوسرے پتلے پتلے مگر لوہے کیطرح سخت بانس کو تیر کے برابر ناپ کر توڑا۔ ایک کنارے کو چھیل چھیل کر سوئی کیطرح نوک کی اور جنگل میں گھس گئے۔ ایک اڑتے تیتر کا شکار کیا۔ پھر آگ جلائی۔ تیتر بھونا اور جب پھر اشنان کر کے پتل پر بیٹھے تو تیتر پتل سے اڑ کر اڑ کر جنگل چلا گیا۔ مشہور ہے کہ اس جنگل میں صرف کالے تیتر بستے ہیں اور تمام کے تمام کالے تیتر اسی تیتر کی نسل سے ہیں۔ مہاراج پتل چوم کر اٹھے تو دیکھا وہی گھسیارن آنکھیں پھاڑے ہاتھ جوڑے کھڑی کانپ رہی ہے۔ راجہ نے یاد کیا کہ یہ کھرپا مانگنے آئی ہے۔ کھرپا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ اس کے ہاتھ میں پہنچتے ہی کھرپے کا دستہ چاندی کا اور پھل سونے کا ہو گیا اور وہ عورت قدموں میں گر پڑی۔ راجہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بانہوں میں بھر کر اٹھایا۔ اب سر کے بال کالے اور بدن جوان ہو چکا تھا۔ عورت نے گھگھیا کر پوچھا کہ مہاراج کون دیوتا ہیں۔ راجہ نے جواب دیا میں دیوتا نہیں نل ہوں اور اپنی بپتا بھوگ رہا ہوں۔ عورت پاس پڑی ہوئی گھاس کی گھڑی اٹھانے کو جھکی تو راجہ نے گھڑی میں ہاتھ لگا دیا اور جب گھڑی سر پر پہنچی تو چھنکنے لگی۔ عورت نے گھبرا کر گٹھری زمین پر ڈال دی۔ کھول

کر دیکھا تو سونے چاندی کی مہریں جگمگا رہی تھیں ۔جب عورت اپنے گھر والوں کے ساتھ پھر آئی تو وہاں دو پتل رکھے تھے ۔ان کے پاس ایک طرف ادھ جلی لکڑیاں اور دوسری طرف تازے بانس کی کمان اور بنسی اور مچھلی کے سفنے اور سنہرے تیتر کے پر اور دور تک نہ آدمی نہ آدم زاد ۔۔۔۔۔۔راجہ کوان کی پیتا نہائے گئی تھی ۔اب وہاں ایک مندر کھڑا ہے جس میں مورت نہیں ۔ دیواستھان پر ہرے پتھر کی کمان اور بنسی ایک دوسرے کا سہارا لئے کھڑی ہیں ۔

میں نے یہ کہانی بچپن سے سنی تھی اور اتنی بار سنی تھی کہ ایک ایک بات پر یقین آچکا تھا ۔ جب بھی میرے سامنے دہرائی جاتی اور کوئی سننے والا مین میخ نکالتا تو میں لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ۔راجہ نل میرے ہیرو ہو چکے تھے ۔میں ان کے متعلق ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا اور کھوج کھوج کر سنتا اور پہروں ان کے دھیان میں کھویا رہتا اور کبھی کبھی سوچتے سوچتے رونے لگتا ۔ایک عمر ایسی بھی ہوتی ہے جب آنکھیں برسات کے جھیلوں کیطرح چھلکتی رہتی ہیں اور آنسو پیارے لگنے لگتے ہیں ۔میں اسی عمر میں تھا لیکن عجیب بات یہ تھی ہر چند سالی میں ہماری بھی ایک پٹی اور کارندے ربیع خریف وصول کرنے جاتے تھے لیکن میں نے کبھی وہ گانو نہیں دیکھا تھا وہ جنگل نہیں دیکھا تھا ۔ وہ تالاب نہیں دیکھا تھا ۔ شاید اسلئے کہ وہ میرے گانو سے سات آٹھ کوس دور تھا ۔ شاید اس لئے کہ بزرگوں کو خوف تھا کہ کہیں میں بندوق نہ چلادوں ۔شاید اسلئے کہ میں سالی کے تصور سے ڈرتا تھا ۔

لیکن اس روز جب میں نیم سار کا سالانہ میلہ دیکھ کر اپنے گھر کے لئے سوار ہوا ۔ کچی سڑک پر دو چار میل ہی چلا تھا کہ حد نگاہ تک پانی ہی پانی نظر آیا ۔پتہ چلا کہ گومتی سے کاٹ کر نکالی گئی نہر پھٹ گئی ہے اور ساری سڑک ڈوب گئی ہے اور کٹ گئی ہے ۔ واپسی کا سوال ہی نہ تھا کہ چھولداری قناتیں سب اکھڑ کر لد چکی تھیں اور میں حکام سے رخصت ہو چکا تھا ۔میں نے سامان کی گاڑیاں واپس کر دیں کہ دوسرے راستے سے پہنچیں اور میں خود سواری کے لہڑوے کر یاخی کو بائیں ہاتھ میں رکھ کر چل پڑا ۔اونچے اونچے شاندار بیل گھنگھروؤں کی ہمیلیں پہنے جھوم جھوم کر چل رہے تھے اور میں اپنے خیالوں میں اڑ رہا تھا کہ چیت بیسا کھ کی ماری گومتی نالے کیطرح سامنے بہتی نظر آئی ۔ آدمیوں نے بیلوں کو سنبھالنا چاہا لیکن وہ پیاس سے بلبلا رہے تھے ۔پھنپھنا کر اتار کی لیکوں پر پھاند پڑے ۔میں بھی خاموش بیٹھا رہا ۔بھوڑ کا علاقہ ۔۔۔۔۔۔۔دور دور تک کوئی گانو نہیں اور جو گاؤں نظر آنے

وہ ایسے ٹوٹے پھوٹے کہ اترنے کو جی نہ چاہا۔ اب سورج ڈھلنے لگا تھا اور بھوک لگنے لگی تھی کہ کہ سامنے ایک گاؤں نظر آیا۔

"یہ کون گاؤں ہے" میرے منہ سے نکل گیا۔

"ساملی ہے مالک" کسی نے جواب دیا۔

"ساملی؟"

اور جیسے میرے تن بدن میں چراغ جل اٹھے

"تالاب پر اترو"

گاؤں کے دھورے پر پہنچے تھے کہ بانس کی مشہور جھاڑیاں نظر آنے لگیں اور لہڑو کے مڑتے ہی مندر دکھائی دینے لگا۔ اس کے دوارے پر کھڑے ہوئے چھتنار برگد کے سائے میں لہڑو کھولے گئے۔ جڑ کے چاروں طرف بنے ہوئے مٹی کے گول چبوترے پر قالین بچھایا گیا اور میں تکیہ لگا کر بیٹھا تو اتنا سکون محسوس ہوا جیسے دنیا بھر میں غم نہیں ہے۔ کوئی فکر نہیں ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے تھوڑی دیر بعد مندر کا دروازہ کھلے گا آدھی دھوتی باندھے اور آدھی دھوتی اوڑھے بر آمد ہونگے اور مجھ سے پوچھیں گے تم کون ہو؟۔۔۔۔ تو میں کیا کہونگا۔۔۔۔۔ میری سوچ کنڈلی بنا کر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔۔ پھر جب وہ جانے لگیں گے تو میں ان سے کہونگا مہاراج اگر حکم دیجئے تو سارے جنگل کے تیتر مار کر آپ کے قدموں ڈھیر کردوں اور تالاب کے تمام منگور پکڑوا کر چرنوں میں ڈالوں۔ وہ مجھے دیکھیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسکرائیں گے اور چلے جائیں گے اور میری بندوق کا کندہ سونے اور نالیں چاندی کے ہو جائیں گے۔۔ یہانتک پہنچ کر میں نے اپنی سوچ کو ڈانٹا کہ یہ کیا بات ہوئی کم سے کم ایسی بات ہوئی چاہئے کہ ان کا ایک ہاتھ میرے بیل کے لگ جانے اور وہ سونے کا ہو جانے اور دوسرا لہڑو کے لگ جانے اور وہ چاندی کا ہو جانے اور جب میں اپنے گھر کے دروازے پر سونے کے بیل اور چاندی کے لہڑو سے اتروں تو کیا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پھر میں سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی بیل نہانے دھونے اپنے اپنے سپھڑے میں گردن ہلا ہلا کر لیدہ کھا رہے تھے۔ لہڑو جھاڑے پونچھے کھڑے تھے اور آدمی نہا دھو کر کھا پی کر اور کپڑے دھو پہن کر تیار تھے۔ میرے قالین کے پائنیتی مٹی کے تازہ مروے میں دودھ مٹی کی رکابی میں مٹھائی رکھی تھی۔

"کہاں سے آئی"

"مندر کے پجاری جی دے گئے ہیں"

اپنے مسلمان نوکر کو آواز دی کہ چائے بنانے اور سوٹ کیس منگوا کر ایک تہمد باندھ لیا اور دوسرا اوڑھ لیا اور بڑے جتن سے ہر قدم ناپ تول کر اسی طرح تالاب کیطرف چلا جسطرح راجہ نل کبھی چلے ہو نگے۔ تالاب پر سا ملی کی عورتیں پیتل کے گگرے اور مٹی کے گھڑے بھرنے آرہی تھیں۔ میں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا ڈھونڈ رہا تھا لیکن کسی بوڑھی عورت کے بال سفید نہیں تھے تالاب میں اتر کر ایک چلو پانی پیا تو محسوس ہوا جیسے برف پڑا ہوا پھیکا شربت پی رہا ہوں لیکن عجیب بات یہ تھی کہ بدن کو پانی کی ٹھنڈک ناگوار نہیں معلوم ہو رہی تھی بلکہ نہانے میں لطف آرہا تھا۔ نہا کر نکلا تو تالاب کے کنارے پختہ چبوترے پر جاجم بچھی تھی اور چائے لگی تھی اور پجاری جی آدھی دھوتی باندھے آدھی اوڑھے بازوؤں پر چندن اور ماتھے پر تلک لگائے کھڑاؤں پہنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

"جے ہو"

"آداب عرض"

"ایک نویدن ہے"

فرمائیے"

شام ہو چکی ------رستہ خراب ہے گاؤں میں چلکر بشرام کیجئے جو کچھ دال دلیا بن پڑے اس کی نذر سوئیکار کیجئے۔

"آپ کون ہیں"

"اس مندر کا سیوک ہوں اور آپ کا آسامی"

"پنڈت جی ! میں ٹھہرونگا تو --------لیکن گاؤں میں نہیں اسی مندر کے سامنے میں رات گذارونگا۔ صبح تالاب میں نہاؤنگا۔ جنگل میں گھومونگا اور چلا جاؤنگا۔"

"لیکن ارج یہ ہے"

"ایک لفظ اس سلسلے میں سننا نہیں چاہتا"

"اچھا تو میں کھانے دانے"

"جی نہیں -------- آپ صرف یہ کیجئے کہ میرے آدمیوں کو جس چیز کی ضرورت

ہو وہ منگوا دیجئے اور قیمت چار پیسے زیادہ لیجئے ۔ یہ میری گذارش ہے ۔"

"بہت اچھا"

اور وہ اپنی کھڑاؤں بجاتے ہوئے ایک طرف کو چلے گئے ۔ میں چائے پیتا رہا اور تالاب کے سیاہ پانی میں رات کو گھلتا ہوا دیکھتا رہا ۔ پھر میرا مسلمان نوکر شیر علی ننگے پاؤں گلے میں غلیل ڈالے ، بھد بھد کرتا آیا اور ڈھاک کے پتوں کا بڑا سا دونا میرے سامنے رکھ دیا میں نے کھول کر دیکھا اس میں سیاہ تیتر رکھا تھا ۔ ذبح کیا ہوا ، دیکھتے ہی اچھلا اور اسے ہاتھوں اور ٹھوکروں سے مارنے لگا اور وہ چپ ------ سناٹے میں کھڑا تھا کہ میں جو تیتروں کا عاشق تھا ایک تیتر کے شکار پر اتنا برہم کیوں ہو گیا تھا ۔ آدمیوں نے اسے بچایا ۔ میں نے تیتر اٹھایا تالاب کی دانتی کی نرم مٹی چاقو سے کھود کر چھوٹی سی قبر بنائی اور اسے دفنا دیا ۔ جب چاندنی کھیت کرنے لگی تب میں اٹھا اور سمندر کے نیچے سے ہوتا ہوا ساحل کے کنارے تالاب کی دوسری تھمی پر آ گیا اور ٹہلتا رہا ۔ بہت دیر بعد تھک کر واپس آیا تو چبوترے پر میرا بستر لگا تھا اور چار لبڑو آٹھ بیل اور کوئی چودہ پندرہ آدمی چاروں طرف اسطرح قلعہ بند تھے کہ کوئی میرے بستر تک نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ بستر کے پاس چٹائی پر کھانا چنا تھا ۔ دودھ ، دہی ، دال ، روٹی ، ترکاری ، چاول ، گھی ، راب --------- میں نے آدمیوں کیطرف دیکھا ۔

پجاری جی نے بنوایا ہے ------------ ایندھن تک کے پیسوں کا حساب کر دیا گیا ہے

تیتر کے مارے جانے کیوجہ سے میں شرمندہ تھا ۔ چپ چاپ ہاتھ دھوکر بیٹھ گیا ۔ دودھ کا آبخورہ اٹھاتے ہی خیال آیا کہ میں تیتروں کی کان اور مچھلیوں کی ماں کے کنارے پڑاؤ کیے ہوئے ہوں ۔

آدھی درجن بندوقیں ساتھ ہیں اور کھانا کھا رہا ہوں ، یہ گھاس پھوس اور جیسے بھوک مر گئی ۔ تھوڑا سا دودھ اور ذرا سا دہی چکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا ۔ آدمی جن پہلے ہی کھا پی چکے تھے ۔ میں اس رات کی خوبصورتی کو جس کی مثال سے میرا حافظہ خالی تھا نظروں سے گلے تک پی جانا چاہتا تھا اس لیے جاگ رہا تھا ۔ لیکن معلوم نہیں کب سو گیا اور نہ جانے کیسے جاگ گیا ۔ دیکھا چٹائی کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے ۔ آدھی دھوتی باندھے آدھی دھوتی اوڑھے ، بازوؤں پر چندن پیشانی پر تلک --------- اور اس کے دراز ہاتھوں پر بڑے بڑے پھل رکھے ہیں ۔ میں ڈر گیا ۔

"کیا ہے؟" میرے منہ سے یہی نکل سکا۔
"بھوجن کر لیجئے"
"پنڈت جی"
"جی"

میں نے بغیر سوچے سمجھے ہاتھ بڑھا دیے۔ ایک پتل میں مسلم تیتر اور دوسرے میں مسلم منگور رکھا ہوا تھا میں نے ایک لقمہ لیا تو ذائقہ لذت میں شرابور ہو گیا۔ آج بھی سوچتا ہوں تو خواب معلوم ہوتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ میں نے اکیلے ہی وہ دونوں اتنے بڑے پتل چشم زدن میں صاف کر دیے تھے۔ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا تو سہارے میں سوتا پڑا تھا۔ وہ سپاہی جو بندوق لیے میرے سرہانے پہرے پر کھڑا تھا چبوترے کا سہارا لیے خراٹے بھر رہا تھا۔

پجاری جی نے اپنے ہاتھ کا لوٹا میری طرف بڑھا دیا۔ پہلے میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ پھر جلدی سے کھینچ لیا۔ یہ سوچ کر کے میرے گوشت کے جوٹھے ہاتھ پنڈت جی کے پوتر لوٹے کو خراب کر دیں گے۔ میں نے لپک کر اپنے سرہانے رکھے ہوئے سفری مراد آبادی ٹونٹی دار لوٹے کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اٹھایا اور پنڈت جی کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے ایک سے اسے پکڑا اور اپنے لوٹے کا پانی اس میں انڈیل دیا اور کھڑاؤں بجاتے چبوترے سے اتر گئے۔ میں نے ہاتھ دھو لیے۔ کلی کے لیے چلو ہونٹوں تک پہنچا تو ناک عجیب سی خوشبو سے بھر گئی۔ لوٹے پر نگاہ پڑی تو لوٹا وہی تھا لیکن اس کا گلا اور ٹونٹی سونے کی ہو چکی تھی اور پیٹ چاندی کا۔ میں دھم سے بستر پر گر پڑا۔ میں نے چیخنا چاہا لیکن منہ سے آواز نہ نکلی۔ بڑی دیر کے بعد آدمیوں کو جگانے کے قابل ہوا۔ آدھی پونی بات بتائی اور لوٹا سامنے رکھ دیا۔ ہنگامہ مچ گیا۔ تھوڑی دیر میں سارا سامان الجھ کر آ گیا۔ مندر کے دروازے پر حسب دستور تالہ لٹک رہا تھا۔ میں اپنے ٹٹو پر سوار ہو چکا تھا اور لوٹا میری گود میں تھا۔ ایک بوڑھا آدمی میرے ٹٹو کے پیچھے پیچھے پکڑے چلا رہا تھا اور اپنے جینئو میں پڑی کالی کالی چابی دکھلا رہا تھا۔

چالیس برس سے مندر کی سیوا کرت ہوں اور چالیس برس سے میں مہاراج کی۔"

میرے جسم سے پسینے کے پرنالے بہہ رہے تھے اور سر سنسنا رہا تھا اور زبان خشک تھی۔ میں نے جھنجھلا کر اشارہ کیا۔ راس ڈھیلی ہوتے ہی بیل چمکے اور وہ بوڑھا آدمی پیچھے

کے جھٹکے سے گر پڑا اور رونے لگا چلانے لگا۔۔۔۔۔۔اور میں راستے. بھر سوچتا رہا آج تک سوچ رھا ھوں کہ کیا سوچنا چاہئے۔

——— • ———

کھا کھا

وہ دونوں طرف دور تک پھیلی ہوئی کچی دیواروں کے درمیان کھڑے ہوئے سیاہ بوڑھے پھاٹک کی قد آدم کھڑکی میں سفید داؤنی باندھے کھڑی تھیں جیسے دیہاتی مدرسہ کا کوئی لائق طالب علم اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھا تختی پر سفیدے سے بنی تصویر دکھلا رہا ہو۔ سڑک چل رہی تھی لیکن کوئی ان کی طرف نگاہ اٹھانے کی جسارت نہ کرتا۔ پینتیس سال گذر گئے لیکن آج بھی جب کبھی بے قرار تخیل یادوں کے کباڑ خانے میں الٹ پلٹ کرتا ہے تو کہیں سے وہ تصویر نکل آتی ہے اور تصویروں کے روایتی حسن کے پیمانوں سے چھلک جاتی ہے۔ اعداد شمار ان کی زندگی کی کہانی پر پھبتی معلوم ہوئے۔ سولہ برس کی عمر میں باپ مر گئے۔ سترہ برس کی ہوئیں تو شادی کر دی گئی۔ اٹھارہویں سال میں تھیں کہ ماں بن گئیں انیس برس کی ہوئی تھیں کہ بیوہ ہو گئیں اور بیس تک پہنچتے پہنچتے گود اجڑ گئی۔ اب پچھتر برس کا سن تھا، لیکن صورت دیکھ کر اچھا بھلا ریاضی داں چالیس پچاس کے آگے گنتی بھول جائے۔ چھوٹا قد، چڑھی غلیل کیطرح چڑھا جسم، چندن سا سفید رنگ، تلپوری بال، کھڑی ناک، پاس بیٹھے ہوئے ابرو، بڑی بڑی آنکھوں کے کافور میں تیرتی ہوئی سرمئی سرمئی پتلیاں، برف سے سفید موٹی تنزیب کے دوپٹے کی داؤنی باندھے اسی کرتے پر خوب کلف کیا ہوا لٹھے کا فرشی پائجامہ پہنے سیاہ چمکدار اور ٹھکتیا جوتیاں پیروں میں ڈالے جب میرے گھر کی ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر طلوع ہوتیں تو بڑی بڑی مغرور بیبیاں سب کام کاج چھوڑ چھاڑ الٹی سیدھی بھاگتیں اپنے ہاتھ سے پلنگ صاف کرتیں جسے وہ کسی غریب عزیز کے بیٹے کی شادی نیوتے کیطرح بڑے احسان سے قبول کرتیں جن کے منہ چارہ کاٹنے والی مشینوں کیطرح چلتے رہتے اچانک خاموش ہو جاتیں۔ تو تڑاق کی عادی بیویاں

سر گوشیوں میں بھی کم ہی بولتیں ۔ حکم احکام کے سارے معاملات ابروؤں اور ہونٹوں اور انگلیوں کی جنبشوں تک محدود ہو جاتے ۔ جب تک بیٹھی رہتیں سہمی رہتیں جیسے راجہ بھوج کی بارات گنگوا تیلی کے دروازے اتر پڑی ہو ۔

میں تھا تو چھ سات سال کا ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میری ان سے لڑائی تھی ۔ میں کسی کو سلام نہیں کرتا تھا ۔ نہ ماں باپ کو نہ چچا چچی کو اور نہ پھوپھا پھوپھی کو اور اگر کوئی میری شکایت میرے دادا سے کرتا کہ گھر کی بستی کی اور علاقہ کی تمام شکایتیں انھیں کے سامنے پیش ہوتیں تو شکایت کرنے والا صلواتیں سنتا یا گالیاں کھاتا اور میں ان کے گاؤ تکیے سے لگا ان کے خاصدان کے پان چبایا کرتا اور شکایت کرنے والے کے زنانے یا مردانے پائجامے کے پائنچے کے قریب تھوکا کرتا لیکن جب میں نے ان کو یعنی کھا کھا کو بھی سلام نہیں کیا اور انھوں نے بابا سے میری شکایت کی تو اپنی زندگی میں پہلی بار اور مرحوم کی زندگی میں آخری بار مجھ پر ڈانٹ پڑی اور میں گھنٹوں روتا رہا اور میں اب ان کو سلام کرتا لیکن اسطرح جیسے غلیل سے غلہ مارا جاتا ہے ۔

بابا دن کا کھانا باہر اور رات کا اندر کھاتے تھے لیکن اس دن جانے کیا ھوا کہ انھوں نے عصر کی بعد کسی کو حکم دیا کہ کنیزن سے کہو ہم کھانا کھانے آرہے ہیں کہ بابا پانچ ہزار کی پوری بستی میں کسی کے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر بھی کھانا کھانے نہیں جاتے تھے ۔ بہت مہربان ہونے تو اس کا کھانا بھی دسترخوان پر لگانے کی اجازت دے دی ۔ تو پھر یہ کنیزن کون پیدا ھوگئیں جن کے یہاں بابا اپنے آپ مانگ کر کھانا کھانے جا رہے ہیں ۔ میں مغرب کی نماز تک سوچتا رہا کہ بابا مغرب کی نماز کے بعد ہی کھانا کھانے اندر جایا کرتے تھے ۔ خیر نماز ہوئی اور بابا حسب معمول اٹھے ۔ میں نے ان کی بائیں ہاتھ کی باہر نکلی ہوئی شہادت کی انگلی مٹھی میں داب لی ۔ ایک آدمی لالٹین لے کر آگے آگے چلا اور دو آدمی کندھوں پر لٹھ لے کر پیچھے پیچھے ہو لئے اور میرے ہوش میں پہلی بار پھاٹک کھلا ۔ جیسے آدمیوں کو کولھو میں پیلا جا رہا ہو اور وہ چیخ رہے ھوں ۔ اندر لالٹین جل رہی تھی لیکن اندھیرا اندھیرا سالگ رہا تھا ۔ آدھے آنگن پر کھا کھا کھڑی تھیں ۔ سر سے پاؤں تک سفید جیسے قبر سے نکلی ھوں یا آسمان سے اتری ہوں ۔ جب انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو میری ناک لوبان کی خوشبو سے بھر گئی اور میں نے بابا کی انگلی اتنے زور سے دبائی کہ بابا نے مجھے جھک کر دیکھا اور میرے سر سے ان کا ٹھنڈا اور سفید ہاتھ ہٹا کر مجھے اپنی داہنی طرف کر لیا ۔ تخت

پہ دستر خوان لگا ہوا تھا اور بہت سے دوہرے پیالے چنے ہوئے تھے اور سامنے باورچی خانے میں دو عورتیں پھلکے پکا رہی تھیں اور ایک آدمی گرم گرم پھلکے لا رہا تھا۔ اور بابا ہر پھلکے کا چھلکا توڑ کر پلیٹ ہٹا دیتے اور میں کھاتے کھاتے کھا کھا کو دیکھتا تو لرز اٹھتا۔ مجھے اب یقین ہو گیا تھا کہ یہ جنات ہیں اور میرے بابا ان کے قبضے میں ہیں۔ ابھی ہاتھ دھلائے جا رہے ہیں کہ بسواں کے خمیرہ تمباکو سے مہکتا ہوا حیچوان لگا دیا گیا اور بابا تھوڑی دیر تک چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے اور پھر اچانک اٹھے اور مجھے انگلی پکڑا کر چل دیے۔

اور پھر دوسرے دن بیبیاں پردہ کرا کر باہر آئیں اور رو دھو کر اپنی خطا معاف کرائی اور بابا رات کا کھانا اندر کھانے پہ رضامند ہو ہی گئے لیکن اسطرح کہ کھا کھا کے یہاں سے بھی کھانا آیا اور دستر خوان پہ چنا گیا اور سبھوں نے تبرک کیطرح سوارت کیا۔

لمبے چوڑے آنگن میں حد نگاہ تک سفید سفید بستر لگے تھے جیسے قبرستان کے صحن میں نئی قلعی کی ہوئی قبریں چمک رہی ہوں میں درمیان کے ایک پلنگ پہ مردے کیطرح آنکھیں بند کیے پڑا تھا اور میرے دونوں طرف آوازوں کے پرندے اپنی اپنی جگہ تبدیل کر رہے تھے۔

"میں تو جانوں کنیزن نے میاں کو کھلانے دیا ہے پکانے کے"

"الو کا گوشت"

"اے توبہ ہے تمہاری زبان ہے کہ فلیتہ"

"ہاں مغرب کے بعد تو ہم "نکھی "بول دیتے ہیں"

"بھو تم کیا کہہ رہی تھیں"

پان دان جھنجھنا کر بند ہو گیا اور اگالدان میں پیک کی پچکاری چھٹ گئی۔

کہہ یہ رہے تھے کہ میاں کہ جو بڑے باپ تھے اللہ بخشے قاضی ارجمند علی انھوں نے جب نیا مکان بنایا اور بس گئے تو ایک رات خواب دیکھا کہ جہاں تم نے پاخانہ بنایا ہے وہاں ہمارا گذر ہے تو اسے فوراً ہٹا لو۔ صبح دستر خوان پہ ذکر اذکار ہونے۔ ایک ایک آدمی کہہ سن کر تھک گیا لیکن بڑے میاں کے کان پہ جوں تک نہ رینگی ------- دو راتیں کسی طرح جاگتے سوتے گذریں اور تیسری کی صبح لاش ملی بستر پہ -------بیچ یہ آن پڑا کہ انہیں اللہ ماری کنیزن کی شادی ہونے والی تھی اگلے مہینے۔ میاں بے چارے نے یتیم بنا کو بہت سمجھایا۔ ارے طوطے کیطرح پڑھایا۔ وہ قاضی ارجمند کی اکلوتی بیٹی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ نہ پاخانہ

بیٹنے دیانہ تاریخ بڑھنے دی ۔اللہ رے دیدے کا پانی ۔خیر اسی گھر میں اسی تاریخ کو شادی ہوئی ۔ ان کو بھی خواب دکھلایا گیا ۔ تنبیہہ کی ۔ٹس سے مس نہ ہوئیں ۔ پہلے شہتیر ایسا شوہر گیا پھر پھول ایسا بچہ ۔

"اور ان جنم جلی کو کچھ نہ ہوا"

"ارے ہوا کیوں نہیں ------ ہوا یہ کہ وہ ان پر آگئے ۔ آنکھیں دیکھتی ہو اس بڑھاپے میں بھی کھول کر دیکھ لیں تو دوارے بند ھا ہاتھی ڈبکیاں کھانے لگے ۔"

"ڈبکیاں تو کھا رہے ہیں بے چارے میاں"

"تمہارے منہ میں خاک"

"اللہ ان کا سایہ قائم رکھے"

"ہاں مگر کنیزن کا منہ ایک طرف اور خدا کی خدائی دوسری طرف ۔ کیا مجال جو پلک جھپکتے تعمیل نہ ہو"

اے دولہن تم نے کبھی غور کیا؟ گھر میں قدم رکھو تو عجیب ہولنے لگتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے دیواریں اوپر آئی جاتی ہیں ۔ یہ سب کیا ہے آخر؟ اچھا تم پھاٹک کو نگاہ بھر کر دیکھ لو ------- دیکھ پاؤ تو ۔ کون سپاہی تھا بھلا سا نام --------

"درگا تھا ۔ برناپور والا"

"ہا ------ کیسی جوان موت ہوئی"

"رات پہرے پر تھا ۔ ایک بار نگاہ اٹھا کر پھاٹک کے طاقوں کو دیکھ لیا ۔ یوں ہی بس دیکھتا رہا پھر چیخ مار کر بھاگا ------ گھنٹوں بے ہوش رہا ۔ مصیبتوں سے بولا کہ طاقوں پر سر رکھے ہیں ۔ کٹے ہوئے تازہ تازہ -------"

بس یہ کہنا تھا کہ تیورا کر گرا ------ جب تک میاں برآمد ہوں ------ ٹھنڈا ------ ایک بوڑھا ٹھنڈا ہاتھ میری پیشانی پر سیر کرنے لگا ۔

"اے دشمن دیکھو تو ------ پھنک رہا ہے بے چارہ بچہ ۔"

ان واقعات سے ابھی میرا حافظہ دہک رہا تھا کہ ایک اور حادثہ ہو گیا ۔ دوشنبہ کا دن تھا ۔ اس دن بابا عدالت کرتے تھے ۔ مقدمہ پیش ہو رہا تھا ۔ منشی جنگ بہادر مثل پڑھ رہے تھے کسی ایسی زبان میں جسے میں نہیں جانتا تھا کہ پھاٹک پر بیٹھے پولیس کے جوکیدار نے گھبرا کر اطلاع دی ------- کہ کھا کھا آرہی ہیں ان کو بابا کے علاوہ سب کھا جاتے تھے ۔

معلوم نہیں کیوں ۔ بابا نے ہاتھ سے اشارہ کیا ۔ کاروائی رک گئی ۔ سب ادھر ادھر ہونے لگے جیسے کچھ نہ ملا اس نے اپنے رومال یا انگوچھے سے آنکھیں چھپالیں اور ان کیطرف سے پشت کر کے کھڑا ہو گیا ۔ وہ چھوٹے چھوٹے ننپے تلے قدم رکھتی آئیں اور کڑک کر بولیں ۔ اے فرخند علی ۔ یہ ملو کمہار پر تم نے پچاس روپے جرمانہ کر دیا ۔ یہ نہیں سوچا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ۔ ہم سے تم سے بوڑھے ماں باپ ہیں ۔

"ارے بھائی کنیزن تم تو"

اس نے طمنچہ بنایا ہے ۔ تمہارے کسی خوشامدی نے تم سے جڑ دیا اور تم نے مان لیا ۔ ارے اللہ سے ڈرو اللہ سے بابا نے پیچوان کی نے گاؤ پر پھینک دی ۔

"سپاہی" وہ کرجے ۔

مختار عالم سے کہو ملو کا جرمانہ ہمارے حساب سے ادا کر دے ۔

"لو بھائی اب تو ہو گیا نا ------ اب تو جاؤ اندر -------ایں"

اور وہ بربراتی ہوئی جسطرح آئی تھیں اسی طرح چلی گئیں ۔ بے نیاز اور محابا ۔

لیکن ان کے جانے کے بعد بھی ایک عالم طاری رہا ۔ بابا نے پانی مانگا ۔ گلوریاں چبائیں ۔ حقے کے گھونٹ پر گھونٹ لیے ۔ بات بے بات اچھے بھلے آدمیوں کی نام رکھے اور عدالت برخاست کر دی ۔

اور ابھی میں بابا سے لڑائی کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ۔ بیٹھے بیٹھے بات کرتے اچانک ------ ایک کہرام مچ گیا ۔

اور جب قبر میں جنازہ اتارا جانے لگا تو ایک طرف سے آدمیوں کا ہجوم پھٹا اور کھا کھا طلوع ہوئیں ۔ آج پہلی بار ان کے کپڑے میلے تھے ۔ بال بھی دونوں طرف اڑ رہے تھے ۔ فرشی پائجامے کے پائنچوں پہ مٹی کی چوڑی چوڑی گوٹ لگی ہوئی تھی ۔ بڑی بڑی آنکھوں کی سرمئی سرمئی پتلیاں اور ہلکی ہو گئی تھیں اور ڈھیلیوں کے کافور میں ڈھلی جا رہی تھیں ۔ میرے باطن نے غلیل چڑھائی اور سلام کا غذ مارنے کے لیے کان تک کھینچ بھی لی ۔ لیکن پھر غلیل ہاتھ سے پھینک دی ۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھیں ۔ شاید میرے پیچھے کھڑے کسی شخص کو گھور رہی تھیں اور پھر رفتہ رفتہ لوگ بابا کو بھول گئے اور لوگوں کے بھول جانے کی اس عادت کا اثر کھا کھا پر بھی پڑا ۔ اب وہ اکیلی اپنے پھاٹک کی کھڑکی میں کھڑی رہتیں ۔ ساری ساری دوپہر سارا سارا دن کھڑی رہتیں ۔ لیکن ان کے پاس بھولے کوئی مقدمہ نہیں آتا

۔کوئی اپیل نہ ہوتی ۔ اب ان کے کپڑے بھی میلے ہونے لگے تھے اور آواز کا کرارا پن بکھنے لگا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کرنے کا مرض شدت اختیار کر چکا تھا اور اب ہمارے گھر ان کا آنا جانا تقریباً ختم ہو چکا تھا ۔ پھر محرم کا چاند دیکھا گیا ۔ چچا جان نے اپنے نئے نئے اختیار اور انتقام کے لیے پرانی روایتوں پر نئی قلعی کی ۔ روشنی اور جلوس اور سبیل اور لنگر کے مصارف اسراف کی حد تک پہنچا دیے ۔ وہ نو محرم کی رات تھی ۔ امام باڑہ چراغوں کی چادروں میں جھلملا رہا تھا ۔ چاند منبر پر بیٹھا آسمان کے ستاروں اور امام باڑے کے چراغوں کو اپنا مرثیہ سنا رہا تھا اور سڑکیں سنسان ہونے لگی تھیں اور مشہور قدیمی تعزیوں کے چوک سے بھیڑ رخصت ہو چکی تھی اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی ۔ گیلی گیلی یادیں آنکھوں پر بچھی ہوئی تھیں ۔

میں تعزیے کے چوک کے نیچے چبوترے کے فرش پر بابا کے گاؤ تکیے سے لگا بابا ہی کے انداز میں ایک پیر پر پیر رکھے لیٹا ہوا تھا ۔ پھر معلوم نہیں جی میں کیا آئی ۔ میں نے آستینوں سے آنسو پونچھے ۔ اٹھا ۔ جوتے پہن رہا تھا کہ اونگھتے ہوئے بوڑھے سپاہیوں نے گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھا اور لاٹھیاں ٹیک کر کھڑے ہو گئے ۔ امام باڑے کا دروازہ بند تھا ۔ پہلی سیڑھی پر تھا کہ دربان نے کان میں گذارش کی کھا کھا اندر ہیں اور ان کا حکم ہے کہ کوئی آنے نہ پائے ۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ہٹا دیا ۔ ضریح مبارک کے گرد کھنچی ہوئی صندل کی جالی پر سر رکھے کھا کھا کھڑی تھیں ۔ رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں ۔

"مولا تم نے باپ کو چھین لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چپ رہی ۔ شوہر چھین لیا ۔ کلیجہ مسوس کر رہ گئی کہ صورت سے آشنا بھی نہ ہوئی تھی ۔ تم نے کوکھ اجاڑ دی تب بھی آہ نہ کی ۔ شیر خوار کا رونا کیا ۔ ایک فرخند علی تھے کہ باپ بھی وہی تھے اور بیٹے بھی وہی تھے تم سے ان کا ساتھ بھی نہ دیکھا گیا اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں ۔ کس کے سہارے یہ رنڈاپا کاٹوں ۔"

وہ ہچکیاں لیتے لیتے نڈھال ہو گئیں ۔ جب ہاتھ سے جالیاں چھوٹنے لگیں تو میں نے لپک کر سنبھال لینے کی کوشش کی ۔ میرا ہاتھ لگتے ہی وہ بجلی کی طرح تڑپیں ۔ دھار دو دھار روتی آنکھیں پوری کھول کر مجھے دیکھا اور چیخ ماری ۔

"میرا فرخند علی ــــــ میرا باپ میرا بیٹا"

اور بھاگتے قدموں کی آواز سنی گئی ۔ سپاہی اندر گھس آئے تھے ۔ ہم دونوں ایکدوسرے سے لپٹے رو رہے تھے ۔ معلوم نہیں کبتک روتے رہے ۔

ــــــــ • ــــــــ

روپا

نیم سار سے آگے کریا کے اندھیرے جنگل سے نکلتے ہی گومتی مغرور حسیناؤں کی طرح دامن اٹھا کر چلتی ہے .... دور تک پھیلے ہوئے ریتیلے چمچماتے دامن میں نبی نگر کھڑا ہے جیسے کسی بد شوق رئیس زادے نے اپنے براق کپڑوں پر چکنی مٹی سے بھری ہوئی دوات انڈیل لی ہو مٹی کے ٹوٹے پھوٹے مکان بچے کھچے چھپروں کی ٹوپیاں پہنے بڑے پھوہڑ پنے سے بیٹھے ہیں یہ گاؤں اودھ کے دیہاتوں کی ضد ہے اس کے گردنہ تو بانسی کی وہ گھنی باڑھ ہے جس میں پھنس کر سانپ مر جاتے ہیں نہ چھتنار پیپلوں اور جھلدار برگدوں کے وہ خاموش شامیانے ہیں جن کے کنجوں میں گالوں کے گلاب اور ہونٹوں کے شہتوت اگتے ہیں نہ وہ چوڑے چکلے پنگھٹ ہیں جہاں گگرے بجاتی پنہارنوں کے پیروں کے بچھوے اپنے گھنگھروؤں کے ڈنک اٹھائے راہگیروں کی راہ تکا کرتے ہیں مگر دور دور تک یہ گاؤں جانا جاتا ہے یہاں کی بھینسیں مشہور ہیں یہاں کے گدی مشہور ہیں یہاں کا رجب مشہور ہے سارنگ آباد راج کا ہاتھی .... وہاں بڑبل کے پیڑوں کے جھنڈے کے نیچے تک آ کر رک جاتا ہے .... کہ ہاتھی کے پیروں برابر اونچی دیواروں کے پیچھے کلیلیں کرتی ہوئی غریب رانیوں کے کھلے ڈھلے جسموں پہ نگاہوں کی گردنہ پڑ جائے

(۲)

دس بارہ برس کا رجب اپنے باپ کے ساتھ سارنگ آباد راج کی بھینسیں لگانے "گڑھی" جایا کرتا تھا ۔ اپنی بھوری بھینسیں لگا کر اس نے انگڑائی لی تو سلیقے کے شلوکے کا

بنّن چٹ سے ٹوٹ کرگر پڑا ۔ بنّن اٹھا کر نگاہ اٹھائی تو بو کھلا گیا "سرکار" کھڑے ہوئے گھور رہے تھے اس نے جلدی سے سلام کر لیا۔

"کیانام ہے تمہارا؟"

سلام کے جواب میں حکم ہوااور اس کی آواز کے ساتھ ہی رجب کے باپ کی بالٹی میں گرتی ہوئی دودھ کی دھار تھم گئی

"رجب"

اس نے ہکلا کر کہا

"کون بھینسیں ہیں تمہاری؟"

"دا-------بھوری"

"کتنادودھ ہے اس کے نیچے؟"

"ڈھائی سیر-------پکے"

"کھول لے جاؤ-------دودھ پیؤ-----اور محنت لگاؤ"

(۲)

جب رجب کو دودھ پلاتے پلاتے بھوری بھینسیں بوڑھی ہوگئیں اور سارنگ آباد راج کے سارے پہلوان رسوا ہوگئے تب سرکار نے گڑھی میں ایک کوٹھری دے کر پلنگ کی پہرے داری سونپ دی پھر ایک دن سرکار کی سسرال سے آیا ہواہاتھی بر جھا گیا فیل بانوں نے فریاد کی تو پرانے جوتے ڈھونڈ کر جمع کر کے مرمت کا حکم دیا آخرجب سارے سارنگ آباد میں تہلکہ پڑ گیااور بھگدڑ مچ گئی تب رائفل لے کرسرکار برآمد ہوئے مزاج دال رجب اپنا بلم لے کرلپکا ایک جہاں "ہائیں ہائیں" کرتا رہا لیکن وہ ٹوٹ ہی پڑاان گنت بلموں کی مار کھا کر ہاتھی تو سیدھا ہو گیا لیکن رجب کو چارپائی اٹھا کر لائی یہ دوسری بات ہے کہ خود سرکار چارپائی کے آگے پیچھے پھرتے تھے ۔ پھر رجب کے نام کو پر لگ گئے دور دور تک پھیلے ہوئے گدیوں کے گانوں خود سارنگ آباد کی طرح اس کی جاگیر بن گئے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جڑیں اتنی گہری اوراتنی مضبوط ہوگئیں کہ خود سارنگ آباد راج اس پر ہاتھ ڈالتے ڈرنے لگا۔

جیسے جیسے رجب گڑھی کی سیاست کی دلدل میں دھنستا گیا ویسے ویسے اکلوتے لاڈلے اور چونچال حسینی کا قد اونچا ہوتا گیا۔۔۔۔۔۔۔سارنگ آباد کے پرائمری اسکول سے "دوم" پاس کرتے ہی حسینی کی ماں نے وہ گروم دھم مچایا کہ رجب نے اپنی سینے پہ پھیلی ہوئی سیاہ داڑھی میں کنگھی کی اور ریاست کی بندوق کندھے پہ رکھ کر نبی نگر کے لئے چل پڑا چیت کٹ رہا تھا دھوپ سے بدن میں چنگیں پڑنے لگیں تھیں لیکن وہ بڑے ٹھنڈے دلسے ہر پہلو پہ سوچتا نبی نگر کے ناکے پہ آ گیا ببول کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے اپنے کندھے سے انگوچھا اتارا چمرودھے جوتے میں دھنسے ہوئے پیروں پہ موزوں کی طرح چڑھی ہوئی گرد جھاڑ جھاڑ کر صاف کیا پھر بڑے رعب سے بالکل زمینداروں کی طرح اپنے گاؤں میں داخل ہوا چھپر میں کھٹیاں تماش بینوں کی طرح کھڑی تھیں تخت پہ مجلس کی مانند بڑی گمبھیرتا سے بیٹھا تھا اور سامنے ایک چمار کا لونڈا جو عمر میں حسینی سے سال دو برس چھوٹا ہی تھا حسینی کے سینے پہ سوار تھا اور حسینی رجب کا اکلوتا بیٹا حسینی لڑکیوں کی طرح دہائی دے رہا تھا رجب کی کھنکار کی آواز سے محفل اجڑ گئی چمار کا لونڈا ایڑی ہو گیا حسینی رجب سے کم بندوق سے زیادہ لپٹنے کے لئے لپکا لیکن رجب کی آنکھیں دیکھ کر سہم گیا اسی شام کو گڑھی میں رجب کی کوٹھری میں کھٹولہ بچھ گیا اور دبلا پتلا حسینی اپنے جلاد باپ کی ٹانگ سے بندھ گیا اور حسینی کی ماں شادی کی کچی ہنڈیا لئے بیٹھی اور گیلی لکڑیوں کو پھونک پھونک کر آنکھیں لال کرتی رہی

(۵)

اپنے باپ کی استادی میں حسینی سارا سارا دن محنت لگانے لگا لیکن بدن پہ گوشت نہ چڑھنا تھا نہ چڑھا وہ اپنے باپ سے اونچا ہو گیا چہرے پہ سرخی بھی دوڑ گئی لیکن کھونٹیوں کی طرح ابھری ہوئی رخسار کی دونوں ہڈیاں جوں کی توں رہیں مگدر کی جوڑی اور گھی کے منڑے نے ہاتھ پیر ایسے بنا دیئے جیسے لوہے کے موٹے موٹے تاروں کو بٹ دیا گیا ہو جب وہ ڈورے کا کرتا اور لال کناری کی نیچی دھوتی باندھ کر کھڑا ہوتا تو رجب کا چہرہ دھندلا جاتا

اور وہ دل ہی دل میں حسینی کے لئے دودھ کی مقدار بڑھا دینے کے مسئلے پر غور کرنے لگتا اس دن بھی وہ حسینی کا راتب بڑھا دینے کے مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ کہار چیخ گیا وہ اپنی لاٹھی پٹکتا کوٹھری سے نکلا تو پتہ چلا کہ نٹوں (کنگلوں) کا ایک قافلہ سرکاری باغ میں زبردستی اتر پڑا سیربانوں کو خبر ہوئی تو اکھٹا ہو کر ٹوکنے پہنچے جرائم پیشہ نٹوں کے سانڈ ایسے لونڈوں کی "تو تکار" کی کہاں تاب؟ باتوں میں گرمیاں بڑھتے ہی لاٹھیاں بجنے لگیں سیربان تقدیر کے اچھے تھے کہ اسی وقت کسی طرف سے حسینی نکل پڑا اور آتے ہی سارے نٹوں کو لپیٹ لیا اور سیربانوں کو چھٹی دے دی اب سیربان گڑھی میں دہائی مچاتے ہیں رجب بغل میں لاٹھی مارے دونوں ہاتھوں سے صافہ باندھتا بھاگتا چلا گیا باغ کی خندق پر پہنچ کر رجب کی آنکھیں پھٹ گئیں بانس ایسا لمبا حسینی پندرہ بیس تیار نٹوں کے حلقے میں اچھل اچھل کر لکڑی مار رہا تھا اور اس کی مار کھاتے ہوئے دس پانچ زمین پر پڑے ہوئے بھوریں بین رہے تھے دوسروں کی طرح رجب کو بھی حسینی نے ڈانٹ کر دور سے تماشا دیکھنے کا حکم دیا تھوڑی دیر میں فیصلہ ہو گیا نٹ باندھ کر لائے گئے اور گڑھی کے پھاٹک پر جھکا دیئے گئے اس شام بڑی دیر تک رجب اپنی کوٹھری میں بھنگ گھوٹتا رہا اور بغلیں بجاتی آواز میں "برہے" گاتا رہا

(۶)

ایک ہاتھ میں ناریل اور دوسرے ہاتھ میں بندوق لے کر رجب گڑھی کی دوسری منزل پر پہنچا تو چمکدار صحن میں ہلکی چاندنی بچھی تھی مراد آبادی پایوں کے پلنگ پر ڈوریوں سے کسا ہوا بےشکن اور بے داغ بستر لگا تھا اور "سرکار" ٹہل رہے تھے رجب نے اس پتھر کی چوکی پر بندوق رکھ دی جس کے ایک گوشہ میں چاندی کے کٹورے کا تاج رکھے اور منہ بند کلیوں کے ہار پہنے کوری صراحی بیٹھی تھی۔ سرکار اس کے قریب آ کر ٹھٹھک گئے۔ رجب دالان کے ستون کی مانند کھڑا رہا۔

"رجب"

"سرکار"

"میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تمہارے گھریلو معاملے میں نہیں پڑتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر ۔۔۔۔۔۔ مگر ۔۔۔۔۔ میں اتنا ضرور کہوں گا ۔۔۔۔۔۔ کہ حسینی جوان ہو گیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اس کی شادی کرو

رجب نے سرکار کے لہجے سے وہ ان کہی بات جو سرکار کے لفظوں سے پرے تھی لیکن لفظوں کے دل میں دھڑک رہی تھی سن لی ------ سمجھ لی -------اور اس کا سر جھک گیا

"کا ------ سرکار کوئی ایسی ویسی بات؟"

"نہیں ------ کوئی خاص بات نہیں -------لیکن منور کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے گھر کے چکر وکر لگاتا ہے"

"منور کے گھر کے چکر؟ منور کے؟"

سرکار پشت پہ ہاتھ باندھے ہوئے نئے سلیم شاہی کو آہستہ آہستہ چرمر کرتے ہوئے دوسرے کنارے پہ پہنچ گئے تھے رجب سر جھکائے بیٹھا رہا اس کی آنکھوں کے سامنے منور گھوم رہا تھا جیسے شہر کے ڈھول میں پہیے لگا دیئے گئے ہوں اور اس پہ تیل کا کالا مروا رکھ دیا گیا ہو اس نے دیکھا کہ گڑھی کے محرم میں منور ------ کالا ------ موٹا ----- بھدا منور اچھل اچھل کر "پھری گدکا" کھیل رہا ہے سامنے کالے چادرے کے گھونگھٹ میں دوپہرے کی آنکھیں پلکیں جھکا رہی ہیں غزنی پور کے بازار میں منور بھینسوں کے غول میں بیٹھا آگے دھرے ہوئے روپے کے ڈھیر کو گن رہا ہے اور اس کے انگوٹھوں پہ روشنائی لگی ہے میراپور کے باغ میں میراپور کی پنچایت بیٹھی ہے اور میراپور کا چودھری منور رجب کی ہیبت اور رجب کی دوستی کو طاق پہ رکھ کر رجب کے یاروں کے خلاف فیصلہ دے رہا ہے رجب کی مٹھیاں بند گئیں دانت بھینچ گئے داڑھی کے سخت بال کاف لگے ہوئے جلد بدن بنے ہوئے شانوں کے پٹھے کھڑکھڑانے لگے جیسے برچھایا ہوا سانڈ حملہ کرنے سے پہلے اگلے کھروں سے زمین کھودتا ہے

(۷)

سہالگ کا زمانہ تھا جب دیہات میں چڑیاں بھی گگلے کرتی ہیں گاؤں گاؤں لگنیں ہو رہی تھیں باراتیں اتر رہی تھیں میراپور کی بستی کو گرد کے شامیانوں نے ڈھانپ لیا تھا دھونیں کے لہراتے گاؤدم مینار شامیانوں کو توڑ توڑ کر اٹھ رہے تھے

منور اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ نیوتہ کھانے جا چکا تھا روپا نے دوڑ دوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ بھینسوں کی گوڑھی کو رسیاں پہنائیں - پانی بھر بھر کر سانی لگائی - پھر رات گئے

تک وہ دونوں بھینسیں لگاتی رہیں ------- دودھار پھونکتی رہیں جب اوپلوں نے آگ پکڑلی تب وہ دونوں روٹی کھا کر پڑ رہیں ایک ہی نیند ہوئی تھی کہ بڑ کی (بڑی بھینس) کا ڈکرانا سن کر ماں چونک پڑی آنکھیں مل کر لیٹے لیٹے دیکھا تو یہاں سے وہاں تک بھینسوں کے سارے چھپر میں کھلبلی پڑی تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے روپا کو کھسوٹا کھسوٹا پھر ایک سے چادر اور دوسرے سے روپا کو گھسیٹتی ہوئی بھینسوں کے چھپر میں گڑاپ سے گھس گئی اب سارے چھپر میں تہلکہ پڑ گیا جیسے جانباز سورماؤں کے کیمپ میں شب خون کی خبر پہنچ گئی ہو۔ اب چھتوں پر سے آدمی لاٹھیاں لگا لگا کر اترنے لگے ۔ لانبے چوڑے ------ ڈھاٹا باندھے ہوئے۔ بھیانک آدمی کوٹھری کا دروازہ توڑ رہے تھے ۔ اور روپا اپنی ماں کے کولھے سے لگی بڑ کی کی ناند کے پاس بیٹھی ہول رہی تھی کہ بڑ کی نے ڈکرا کر رسی تڑائی اور پھانسی دینے والے جلاد کی طرح جھومتی ہوئی نکلی اس کے پیچھے ساری بھینسیں ------ چھوٹی چھوٹی پڑیاں تک کیلیں کرتی ہوئی نکل پڑیں آدمیوں نے لاٹھیاں سوتیں اور چاہا کہ ان کو باڑھ پر لے لیں لیکن پندرہ بیس پاگل بھینسوں کو جھیل لے جانا ٹھٹھہ نہیں تھا ایک ہی چھپٹے میں فیصلہ ہو گیا بڑ کی نے رجب کو آٹے کی طرح گوندھ کر رکھ دیا سارے داؤ پیچ دھرے رہ گئے۔ جیالے ساتھیوں نے جان پر کھیل کر نیم مردہ رجب کو باہر نکالا اور گاؤں والوں سے لڑتے بھڑتے گڑھی تک آ گئے جب اپنی کوٹھری میں رجب کو ہوش آیا تو حسینی پیروں کے پاس بیٹھا تھا کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا بات رہ گئی جان نکل گئی۔

(۸)

باپ کا گھاؤ بھر گیا روپا کے بدن کی دھار حسینی کا جگر اسی طرح کاٹتی رہی ۔ جب رات بھیگ جاتی ڈھور ڈھنگر اپنے اپنے کھونٹوں پر پا کر کرتے کرتے دم سادھ لیتے اور پنکھ پکھیرو اپنے اپنے کنجوں میں سو رہتے کتے چپ ہو جاتے چوکیدار لیٹ رہتے دکھوں کی ماری بیوہ ماں آنگن میں پڑی ہوئی چارپائی پر کڑمڑاجاتی اور ڈھابلی میں بند مرغے پھر پھڑا کر بانگ دینے لگتے تب وہ پورے سکون قلب کے ساتھ ان حسین لمحوں کا خزانہ کھول کر بیٹھ جاتا جن کو روپا کے حسن کے پارس نے اشرفیوں کی طرح جگمگا دیا تھا وہ ان اشرفیوں پر دیدے گڑائے بیٹھا رہتا جیسے گاؤں کے ندیدے لڑکے موتی چور کے لڈوں کا تھال گھور رہے ہوں

ان حسین لمحوں کے خزانے پر وہ سانپ کی طرح بیٹھا پہرہ دیا کرتا پھر گھر گھر چکیاں چلنے لگتیں چھوٹی چھوٹی چڑیاں اپنی ماؤں کو دیکھ کر رسیاں تڑانے لگتیں اور دھوپ منڈیروں پر بیٹھ کر آوازوں کے تھال لڑھکانے لگتی بوڑھی ماں جھانکروں کی لانبی جھاڑو لے کر گوبر سمیٹنے لگتی تب وہ جھوٹی انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھتا اور اپنی لال آنکھوں کی زخمی نگاہوں کو اماں سے چرائے ہوئے بھینس کے نیچے جا بیٹھتا اور مٹ سے میں دودھ کی دھار بجنے لگتی ہاتھ مشین کی طرح چلتے رہتے اور ذہن گلیوں میں آوار گی کرتا رہتا جو روپا کے کپڑوں سے مہک رہی تھیں جو روپا کے زیوروں سے بج رہی تھیں جب اماں رات کی روٹی مٹھے میں مل کر مٹی کا پیالہ اس کے سامنے رکھتیں تو وہ بھی کبھی پیٹ میں انڈیل لیتا تو کبھی بہانہ کر کے ٹال جاتا گومتی کے کنارے سرکاری باغ کی منڈیر کو تکیا بنا کر لیٹ رہتا اور سوچ نگر کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹا کرتا جانور چرا کرتے اسے اس وقت ہوش آتا جب کسی کھیت میں بلا ہوتا اور کھیت والا اس کے جانوروں کی ماں بہنوں سے اپنے جنسی تعلقات کا پوری آواز سے اعلان کرتا زندگی کرنے کے اس ڈھب پر جب حسینی کے یاروں کی حسینی کے عزیزوں کی نگاہ پڑتی تو وہ اس کے مرحوم باپ کی کہانیاں کہتے پھر اپنی بھی گلو گیر آواز میں اپنے دکھوں کا پٹارہ کھولتے اور خون میں تھڑی ہوئی تصویریں دکھاتے وہ بھی سنتا رہتا اور کبھی جھنجھلا کر اٹھ جاتا اور کندھے پر لٹھ رکھ کر سیلانیوں کی طرح مارا مارا پھرتا۔

(۹)

پھر ایک دن اس کے یاروں نے اسے گھیر لیا باتیں کرتے کرتے اس کے پیٹ میں گھس گئے اور حسینی کے کلیجے پر بنی ہوئی روپا کی تصویر کی رونمائی کی حسینی کے یار بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے حسینی رسی لگے ہوئے چور کی طرح گم سم بیٹھا رہا ان یاروں میں بھی جنھوں نے حسینی کے ساتھ مگدر گھمائے تھے ساتھ لکڑیاں بلائی تھیں اور فوجداریاں لڑی تھیں کسی کی مجال نہ تھی جو یہ کہتا کہ روپا اس باپ کی بیٹی ہے جس کے آنگن میں رجب مارا گیا وہ سب کے سب سر جوڑے بیٹھے رہے بیڑیاں پھونکتے رہے اور سوچتے رہے آخر یار علی سے رہا نہ گیا اس نے تڑ سے کہہ دیا کہ وہ بھجا کی بیوی ہے اس کی مراد سے بات چیت چل رہی ہے اور گاجی سے آشنائی کی کہانی ایک ایک چھپر میں دس دس مرتبہ

سنی گئی ہے عورتوں کو تو اس کی پوری مہابھارت منہ زبانی یاد ہے وہ اپنی ماں سے چار چوٹ کی لڑائی لڑتی ہے اور باپ سے ٹھٹھول کرتی ہے روپا تو ایسی ہے روپا تو ایسی ہے جیسی برج بنی رنڈی ۔۔۔۔۔۔جیسی مٹی کی وہ ہانڈی جس میں کتے نے منہ ڈال دیا ہو حسینی گمبھیر تا اور دھیرج سے سب سنتا رہا جب یارعلی کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا تب اس نے گردن اٹھائی ایک ایک کی آنکھیں دیکھیں اور نگاہیں ٹٹولیں اور لاٹھی چلوانے والی آواز میں بولا کہ نبی نگر میں روپا اسی طرح پہچانی جاتی ہے جیسے میراپور میں یہ بات مشہور ہے کہ پچھلے محرم میں روپا حسینی کے ساتھ پکڑی گئی تو بھائی میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے روپا کا روپ بھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا میں نے روپا کو اسی طرح دیکھا جیسے جنم اشٹمی کے تیوہار پہ بھگوان کی جھانکی کہ ساری نگاہ کہنے پاتے میں الجھ کر رہ جائے اور بس پھر منور ایسا پانی دار باپ کہ برچھائی سے لڑائی لڑتا ہو وہ بھلا زندہ رکھتا روپا کو یہ سب کچھ سن کر؟ رہ گئی سبھا کی بات تو وہ ان کے گھر کا بکھیڑا ہے روپا کی سبھا سے بنتی نہیں تو منور اپنی اکیلی بیٹی کو برچھائیں میں لے کر کھڑا ہو گیا جس دن منور نے آنکھ بدل لی اسی دن سے سبھا جی مہاراج فارختی لکھ کر اٹھک بیٹھک لگانے میراپور میں دھرے ہیں یاروں نے حسینی کی باتوں کے شعلے اور آنکھوں کی چنگاریاں دیکھ کر زبان سی لی اور دور سے ہاتھ اٹھا کر دعا کی سوچنے لگے۔

(۱۰)

ایک دن جوار کے سب سے مشہور نانی گدی کے اکلوتے بیٹے کا پیغام منور کے گھر پہنچ گیا منور کو ایسا لگا جیسے اس کے دروازے پہ نیا خریدا ہوا ہاتھی جھوم رہا ہو میراپور کے بڑے بوڑھوں کے جھوٹ موٹ کی پنچایت ہوئی سبھا سے فارختی لی گئی اور چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی مسل دہرائی گئی حسینی کے ہمدرد اور دوست جو حسینی کے پریم سے بوکھلا گئے تھے بیاہ کا نام سنتے ہی دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ روپا کی وہ کہانیاں جن کے دوہرانے کے خیال سے منہ میں پانی بھر آتا تھا اسی طرح اپنے سینے میں دفن رہیں موسے کی شراب کی مستی میں اڑانے ہونے لمحوں کی طرح کچھ دن بیت گئے پھر حسینی کو ٹوہ لگی کہ جیسے روپا اس کی بیوی نہیں ہے ان کے گھر آئی ہوئی ایسی رحم دل مہمان ہے جو کبھی رات برات اسے اپنے پاؤں چاٹنے کی اجازت دے دیتی ہے یہ زہریلا خیال اس حسینی کی چھاتی سے چپٹ گیا جس کے لئے

ساری برادری آنکھیں بچھانے تھی اس سنپوے کو مارنے کے لئے اس نے اپنے خود فریبی کے ترکش سے ایک ایک تیر نکال کر پرکھ لیا لیکن کسی سے جی نہ پورا ہوا۔

(۱۱)

آخر وہ پنڈت بلا آئے جن کی جھمانی میں نبی نگر تھا حسینی کی ماں نے ان کو سیدھا اور آکھت دیا پھر اپنی بپتا کہی پنڈت جی نے سایت۔ بچاری پترا دیکھا الپ کائی اور دکھشا لے کر چلے گئے دوسرے دن شام ہوتے ہی حسینی کی ماں دس بیس عورتوں کے ساتھ اس پیپل کو پوجنے گئی جس پر برم راکس رہتے تھے سارنگ آباد کی پرانی مسجد کے امام نے تعویز دیئے تھے وہ شربت میں گھول کر روپا کو دھوکے سے پلائے گئے لیکن حسینی کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھانیاں اسی طرح تیرتی رہیں

سارنگ آباد کی بازار سے حسینی نے ایک لہلہاتے کپڑے کا لہنگا ایک چمچماتے کپڑے کی کرتی اور میل کھاتا ہوا دوپٹہ خریدا۔ اپنے کندھے پر سے چادر اتار کر جب تمام چیزیں باندھ چکا تب سیر بھر برفی کا دونہ ایک کھونٹ میں باندھ لیا اور بڑے ارمانوں سے گھر میں گھسا روپا چولھے والے کمرے میں سجی بنی بیٹھی کوئی مہین کام کر رہی تھی حسینی کا اشارہ دیکھ کر سمجھ کر بھی انجان بنی بیٹھی رہی آخر جب حسینی کی گردن کے پٹھے دکھنے لگے تب وہ مہارانیوں کی طرح چلتی ہوئی بڑے وقار سے کوٹھری میں آئی اور بے نیاز سی بیٹھ گئی حسینی نے پسینے میں ڈوبی ہوئی قمیض کا غلاف اپنے جسم سے اتارا تو شام کی ٹھنڈی ہوا بہت اچھی لگی وہ ہوا کے رخ پر کھڑا ہو گیا اور اپنے سینے اور شانوں پر پسینے کی ننھے ننھے قطروں کو انگلی سے چھونے لگا جیسے کشمل مار رہا ہے

"کرتا پہن لیو"

روپا نے شرمندہ کر دینے والی ناگواری سے کہا

"کاہے"

حسینی سوچتی ہوئی آواز میں بولا

"ای لئے -------- کہ برچھلے ہاتھ پاؤں دیکھ کے جی متلانے لگتا ہے"

روپا یہ کہہ کر برفی کا دونا کھولنے لگی

(۱۴)

پانی تھم گیا تھا لیکن آسمان اسی طرح رندھا ہوا تھا بادل تلے کھڑے تھے ۔ گرمی دودھ پہونچا کر آتے آتے دوپہر ہونے لگی تھی ۔ حسینی چلور درختوں کے پاس ہی تھا کہ اس نے دیکھا بوڑھی ماں دونوں ہاتھوں میں دو گگرے لئے رسی پر پھسلتے ہوئے نٹ کی طرح سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی ۔ حسینی کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے بڑی موٹی گالی دے دی ہو ۔ اس کا سر سنسانے لگا اور چال تیز ہوگئی ۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر روپا پر پڑی جو چھپر کی تھمڑیا سے پشت لگائے بیٹھی تھی کالے کپڑوں میں گورا بدن کوندے کی طرح لپک رہا تھا ۔ موتی کی انگلیوں کے پوروں پر مہندی کے لال جڑے تھے ۔ بھونرا نے سیاہ بالوں پر کوئی ڈیڑھ پاؤ چاندی کا چھپکار کھا تھا ۔ اس کے زانو کے پاس رنگ برنگی مونج رکھی تھی اور رانی کی تمکنت سے بیٹھی ہوئی ڈلیا بن رہی تھی ۔ جب وہ سوچنے میں مونج پھانس کر جھنکا دیتی تو گٹے سے کہنی تک بھرے ہوئے چاندی کے زیور چھنچھنا اٹھتے ۔ حسینی کی ساری آگ بجھ کر رہ گئی ۔ دوسری طرف چولھے والے چھپر میں اکڑوں بیٹھی ہوئی ماں جھوم جھوم کر پیتل کا بٹلا مانجھ رہی تھی ۔ زمین پر پڑے چادرے کا کونہ منہ میں رکھے چھوٹی سی بڑیا پاگڑ کر رہی تھی ۔ حسینی یہ دیکھتے ہی پاؤں پھٹپھٹاتا ہوا لپکا ماں نے چاہا ہوا چادرا نہار کر دیکھا اور سر پر ڈال لیا ۔

"بنانے والے تو مرہی گئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ موٹی چاپ ڈالی ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نگی گھوم لیوں"

ماں بربرائی ۔ روپا نے مونج کا سرا دانت سے توڑا اور "آپڑ وسن لڑ" کے انداز میں بولی

"کا ہے نگی کا ہے گھومیو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لاٹ ایسا پوت نانہیں ہے بنانے والا"

"پوت تو تیرے سر مسی بھر کا نانہیں ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا کا بنانے دینے"

روپا نے ڈلیا ہاتھ سے رکھ دی

"ہاں ۔۔۔۔ ای ماں کا جھوٹ ہے ۔۔۔۔۔۔ جب سے امرا پور چھٹا ۔۔۔۔۔۔۔ پہنا

کھاتا پھٹ گوا" بڑھیا نے بنا ہاتھ سے رکھ دیا اور سامنا کرنے کے لئے گھومی۔
"یہاں تو بھو کی نگی رہت ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے نائن؟"
"ناہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔راج کرت ہوں یہاں"
"راج تو امراپور میں ہے تیرے باپ کا۔۔۔۔۔۔۔۔یہاں کہاں راج"
"اے بڑھیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔میرے باپ دادا کا نام لیہے تو تیری سات پشتیں نوچ کے پھینک دیہوں"
یہ کہتے کہتے روپا تنتنا کر کھڑی ہوگئی حسینی نے دیکھا کہ اس کے چتونوں سے آگ برس رہی تھی۔
"توئی دیکھ رہا ہے حرام جادے۔۔۔۔۔۔۔۔۔یونانیں ہوت کہ لے کئے ڈنڈا"
"کون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ای پوت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ای مری انگی چھولیں۔۔۔۔۔۔۔تو کھون پی جاؤں"
"ہانے رجب کے پوت دھکارے۔۔۔۔۔۔۔ توی پہ"
بڑھیا پھٹپھاتی ہوئی دھڑاک سے دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ روپا پھر اطمینان سے بیٹھ کر اپنی ڈلیا بنانے لگی۔ حسینی کے سر سے پاؤں تک آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ آتش بازی کے درخت کی طرح پھنک رہا تھا۔ جب وہ لمبے لمبے ڈگ رکھتا ہوا آنگن سے گزر گیا تب بھی اس نے اپنے موجے پر سے نگاہ نہ اٹھائی۔ اس کی انگلیاں تو ڈلیا پر چل رہی تھیں لیکن نظریں کہیں اور تھیں۔ حسینی گومتی کے کنارے چرتی ہوئی بھینسوں کے ریوڑ کو گھورتا رہا۔ گھاس کے تنکے نوچ نوچ کر چباتا رہا۔ جب شام ہوگئی فضا کی روشنی گزہل کے پھولوں کے رنگ میں رنگ گئی۔ بھینسوں کے گردنوں کی گھنٹیاں بجنے لگیں تو وہ اس پجاری کی طرح اٹھا جسے دیوی نے شراپ دے دیا ہو۔ وہ سیدھا اپنے ماموں کے گھر گیا جہاں اس کی ماں دودھ دوھ رہی تھی۔ اس نے بڑے دلار سے اپنی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"کا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہتیارے"
ماں نے بھیگی ہوئی آنکھیں اٹھا کر جلی ہوئی آواز میں کہا
"گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چلو"
"وابدماس تو ہے گھر ماں؟"
"تم ہو چلو"

"تا۔۔۔۔۔۔میں رجب کی دلہن ہوں۔۔۔۔۔۔۔جو اجوازن کی آنکھ نائیں دیکھیں"

اس جملے نے حسینی کے خیالوں میں بجھی ہوئی بارود میں آگ لگا دی۔ وہ تیر کی طرح گھر سے نکل آیا۔ ماں جانوروں کی مزاج داں تھی۔ پہلے وہ سب کی ناند میں پھرتی پھر کسی کو چمکارتی کسی کو ڈانٹتی کسی کو نمک کسی کو گڑ کسی کو دانہ دیتی کسی کو چوکر ضدی بچوں کی طرح جانوروں کی ناک کرتی تب دو ہنے بیٹھتی۔ روپا کے اجنبی ہاتھوں نے جو تھنوں کو چھوا تو وہ گھوڑے کی طرح بھڑک کر لاتیں چلانے لگیں۔ وہ تو انکاروں کی گٹھری تھی مردوں کی طرح لاٹھی لے کر ٹوٹ پڑی۔ اس تڑاتڑی میں حسینی آ گیا۔

مار ڈالو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بھینسو کا مار ڈالو

"سب کا مار چکی ہوں۔۔۔۔۔۔بھینسیں بچی رہیں۔۔۔۔۔۔۔۔اب انہوں کا مارے ڈالت ہوں"

کون جانے۔۔۔۔۔۔کی کا مار چکی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔پھر جیسے ہوش آیا ہو اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ لئے اور ٹھنڈے لہجے میں بولی اے رجب تے پوت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رجب کی گرمی بھول جاؤ۔ منور کے گھر سے رجب کی لاش نکلی ہے۔"

حسینی دانت پیس کر گھوما اور کونے سے لاٹھی کھینچ لی لیکن جب مڑا تو اس نے روپا کے ہاتھ میں ہنسیا دیکھا جسے وہ تولے کھڑی تھی نکلتے ہوئے قد اور دوہرے پتھر یلے بدن کی غضب ناک روپا چٹان کی طرح کھڑی تھی۔

(۱۴)

آسمان پہ کالے کالے بادل مٹر گشتی کر رہے تھے جیسے بڑی بڑی "منڈراجی" بھینسوں کے ریوڑ چرائی پہ نکلے ہوں۔ چاند کبھی ابھر کر دیواروں اور منڈیروں پہ قلعی کر دیتا اور کبھی ڈوب کر سارے پہ جبر کا اندھیارہ لیپ دیتا جیسے سنسان دوپہر میں تالاب کے ہرے پانی میں روپا نہا رہی ہو نہا کم رہی ہو اور کھیل زیادہ رہی ہو۔ حسینی نے آہ بھر کر نگاہ اٹھائی سامنے پلنگڑی کی انگوٹھی پہ روپا شیشے کے لانبے نگ کی طرح جگمگا رہی تھی حسینی دیکھتا رہا۔ رام لعل حلوائی کی جلیبیوں کی طرح گرم گرم سوندھے سوندھے میٹھے میٹھے خیال اس کے رال ٹپکاتے دل میں گھلتے رہے۔ پھر وہ ایک دم چونک پڑا تھا جیسے جلیبی کی بجائے

منہ میں کھنکھورہ چلا گیا ہو جیسے جلتی ہوئی لکڑی پانی میں ڈبو دی گئی ہو۔ اس نے گردن گھما کر سارے گھر کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس کو ایسا لگا جیسے یہ گھر اس کا اپنا گھر نہیں ہے۔ یہ پوری ایک بستی ہے اس کا اپنا وطن ہے جسے کچی عمر میں چھوڑ کر وہ اپنے پیٹ کی روٹی کمانے پردیس چلا گیا تھا اور آج ایک زمانے کے بعد واپس آیا ہے۔ لانبے چھپر میں اپنے پہلوؤں میں منہ دیے بیٹھی ہوئی بھینسیں ان عزیز بوڑھی عورتوں کی طرح ہیں جن سے ان کی پشتینی عداوت رہ چکی ہے۔ ڈھابل میں مرغیاں کڑ کڑا رہی ہیں جیسے رستے چیختے ہوئے کھیلتے ہوئے بچے اسے نہ پہچان کر اسی طرح چیخ رہے ہوں۔ اسی طرح کھیل رہے ہوں۔ وہ ٹوٹا پلنگ رجب کے چوپال کی طرح اجاڑ پڑا ہے۔ جس میں اب کبھی گاؤں کی پنچایتوں کے پنچ بیٹھ کر فیصلے نہیں کریں گے۔ اور یہ روپا ہے۔ بھری ہوئی روپا کی پلنگ ہی اس کا اپنا گھر ہے جس کے صدر دروازے پر مورچہ کھایا ہوا تالہ جھوم رہا ہے اور وہ سوچ رہا ہے کہ اس کی کنجی کہاں بھول آیا ہے۔ چھپروں کے موٹے موٹے شہتیر ---------سرکار کے ظالم کارندوں کی طرح اسے گھیرے کھڑے ہیں اور بقایہ کا تقاضا کر رہے ہیں۔ پھر کونے میں کھڑے ہوئے ہل کی نیسی چمک اٹھی گویا کسی کارندے نے اپنا بلم سیدھا کر دیا ہو اس بلم کی چمک کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں دہک اور بار کوندگئی جیسے تنی ہوئی روپا ہنسیا اٹھائے کھڑی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ روپا کے ہاتھ سے ہنسیا کھینچ لے اور اسے روپا کے پیٹ میں بھونک دے۔ روپا کے پیٹ کا خیال آتے ہی "سرکار" کے قاصدان کی چاندی کی لسندی اور مخملیں تکیے میں بھرے سرمائی پرندوں کے پروں کا گداز دونوں اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئے------اور چارپائی سسکیاں بھرتی رہی۔ دن بھینسیں لگاتے رہے اور دودھ پہنچاتے رہے------اور راتیں سوچ کی ننگی بیریوں کے نیچے ننگے پاؤں چلتی رہیں اور کراہتی رہیں

(۱۴)

پھر دسہرا آ گیا۔ سارنگ آباد میں لگا۔ گڑھی کے سامنے میدان میں شامیانہ کھڑا کیا گیا۔ دور دور تک جاجم کا فرش کیا گیا۔ بل گاڑ کر گڑھی کی ان گنت گیس لٹکائی گئیں۔ سرکار کی چوکی پر بچے کام کی ہری مسند بچھائی گئی۔ ہری اطلس کے غلافوں میں لپٹے ہوئے تکیے رکھے گئے۔ گاؤں گاؤں بھنگیوں نے ڈگی پیٹ کر اعلان کہ آج رات "ویرا بھیمنیو" کھیلا

جانے گا۔ ساری خلقت کے دل گرما گئے۔ بوڑھے بوڑھے دلوں پہ "تیوہار" کی جوانی ٹوٹ پڑی۔
حسینی سارنگ آباد کے بازار سے سودا سلف لے کر گھر لوٹا تو اس کا دورا جگمگا رہا تھا جیسے ابھی ابھی گوبر سے لیپا گیا ہو۔ اندر پہنچا تو بھینسیں ناند سے الجھ الجھ کر کھا رہی تھیں اور گھنٹیاں بجا رہی تھیں۔ ان کے چھپر کے کونے میں ٹوٹی ہوئی روئیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مرغیاں پر پھڑ پھڑا کر لڑ رہی تھیں اور کڑ کڑا کر کھا رہی تھیں۔ بیچ آنگن میں ستلی سے بنا ہوا جہازی پلنگ پڑا تھا اس پر قالین بچھا تھا۔۔۔۔۔۔ایک آدمی۔۔۔۔۔ایک دانو۔۔۔۔۔۔اکڑوں بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ سیاہ گھنی سخت داڑھی گردن پر چھائی ہوئی تھی۔ تازہ بنا ہوا اوپری ہونٹ چمک رہا تھا۔ کلے چرے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی بھیانک آنکھوں پر جوڑے جوڑے سیاہ ابرو جھکے ہوئے تھے۔ سر کے خشخشی سیاہ بالوں کے بیچوں بیچ ایک پان بنا تھا۔ گوشت سے لدی ہوئی کلائیاں گنجان بالوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ حسینی کو دیکھتے ہی پلنگ سے اترنے لگا۔ کھڑے ہو کر پہلے اس نے داہنی ران پر دھوتی برابر کی جس کی بھڑکتی مچھلی پر حسینی کی نگاہ جڑی ہوئی تھی۔ پھر ڈکارا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"سلام آلیک"

"والیکم"

یہ کہہ کر حسینی نے اس کی آنکھوں میں اپنی سوالیہ نگاہیں رکھ دیں مگر وہ اسی طرح کھڑا ہوا اسی طرح محبت کے ساتھ ناریل گڑ گڑاتا رہا جیسے بھوکا کتا ہڈی چچوڑ رہا ہو۔ پھر روپا ایک کوٹھری سے نئی رنگے ہوئے پیروں میں چھاجیں بجاتی اور کلائیوں میں زیور چمکاتی ہوئی آئی اور حسینی کے پاس آ کر شادی کے بعد سکھی زمانے والی البیلی آواز میں مخاطب ہوئی۔

"ای گاجی بھائی ہیں"

ابھی حسینی ان آنکھوں پر رکھی ہوئی کاجل کی تازی دھار کو پرکھ ہی رہا تھا کہ روپا چولہے والے چھپر کی طرف مڑ گئی اور حسینی کے نتھنے نئے لہنگے کے کلف کی خوشبو سے بھر گئے۔

"بیٹھو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آپ گاجی بھائی بیٹھو"

اس نے انگوچھے سے سارا سودا کھول کر دوسری کھٹیا پر انڈیل دیا۔ پھر اسی انگوچھے سے پٹاخے داغنے والی آواز میں پاؤں اور جوتے صاف کرنے لگا۔

(۱۵)

روپا کے جہیز میں آئی چھوٹے سے سوتی قالین جیسی جانماز پر گاجی بھائی نماز پڑھ رہے تھے جیسے بیٹھکیں لگا رہے ہوں۔ چھپر کی تھمریا میں وہ پیتل کی لالٹین ٹنگی تھی جو آخری بار حسینی کے بیاہ میں قلعی ہوئی تھی۔ حسینی نے کوٹھری سے کپڑے میں لپٹا ہوا مراد آبادی حقہ اور سیتا پور کا بندھا ہوا نیچہ تازہ کر کے جب وہ چلم میں آگ رکھنے چولہے کے پاس گیا تو "دودھار" دیکھ کر ٹھٹھک گیا "دودھار" گلے تک بھری پڑی تھی۔

"کا دودھ کہوں سے آوا ہے؟"

حسینی نے انگارے کی راکھ جھاڑتے ہوئے روپا کو دیکھے بغیر پوچھا

"ناہیں تو.......... گھر کا ہے"

حسینی نے تیز سے محسوس کیا کہ آج مدت کے بعد اس آواز میں برچھی کی طرح کھنچی ہوئی خفگی نہیں ہے اس سے تو "تلک" کی مٹھاس ٹپک رہی ہے۔ اس نے گردن موڑ کر بے یقینی سے روپا کو دیکھا جو پیتل کے بٹلے میں پیتل کا چمچہ گھما رہی تھی جیسے کلئی کو نچا رہی ہو۔ حسینی دیکھتا رہ گیا۔ روپا کے چہرے پر اپنائیت کی وہ نرمی چمک رہی تھی جو موسم کی پہلی بارش کی پھوار میں ہوتی ہے........ جس کے انتظار میں اس کے دن سوکھ کر کانٹا ہو گئے......۔ اس کی راتیں جل کر کوئلہ ہو گئیں تھیں اس کے دل کے تھال میں رکھے ہوئے...... بجھے ہوئے سب دیے یکبار گی جل اٹھے جیسے ناچتے مور کے پیروں کے چاند چمک اٹھے ہوں۔ اس نے گاجی بھائی کے پئی سے حقہ لگا دیا اور گاجی بھائی سے باتیں کرنے پر آمادہ ہو گیا جس کا قیافہ ہمیشہ اس کا دل میں شبے جگاتا رہا جس کا نام روپا کی بدنامیوں کے آنچل سے بندھا تھا۔

"ہاں تو سب کھیر صلا ہے گاجی بھائی"

"سب اللله کا سکر ہے"

"گھر سے آئے رہے ہو سیدھے؟"

"ہاں کل....... منور چاچا بولے کہ تنی روپا کی کھیر کھبر لے آؤ....... تو ہم کہا کہ چلے جائیں"

"ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اچھا لیو۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

چار پہاڑ ایسے لڑکوں میں سے ایک کو بھی اتنی چھٹی نہ تھی کہ وہ روپا کی خیر سلا لے جاتا۔ وہ دل میں سوچتا رہا۔ گوبر سے لپے ہوئے چوکے میں بٹلے اور چمچ لئے روپا بیٹھی رہی۔ دیر کے بعد گاجی بھائی اور حسینی نہا کر آئے۔ سر سے پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے ٹپکاتے ہوئے چوکے میں بیٹھ گئے۔ روٹیوں کے چیتے (انبار) منھ کی ہانڈی آو کی بھاجی اور انڈوں کی ترکاری سب دیکھتے ہی دیکھتے اڑنچھو ہوگئی۔ گاجی بھائی کے بعد حسینی ایک لمبی ڈکار لیتا ہوا اٹھا اور طاق میں رکھے ہوئے تماکو کے کالے کالے ڈبے کو اٹھانے چھپر میں آیا تو اس نے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا کہ روپا کوٹھری میں بانس کا پسارا کھوے کھڑی کھدر بدر کر رہی ہے۔ کڑوے تیل کی میٹھی روشنی نے کوری ہانڈی ایسے چہرے پر پتریوں (رنڈیوں) کے گالوں پر لگانے والی لالی بکھیر دی ہے۔ کالا موٹا دوپٹہ شانوں پر سو رہا ہے سر کے زیور کی چاندی دھیمی دھیمی چمک رہی ہے۔ گردن کے چوڑے چکلے طوق کی لمبی لمبی جھالر کے نیچے سر اٹھا کر کھڑی بے پناہ جوانی ہاتھ ہلا ہلا کر حسینی کو بلانے لگی۔ اس نے تماکو کا بکوٹا چلم میں جمایا اور گاجی بھائی کو کنکھیوں سے دیکھا جو دوسرے چھپر کی دہلیز پر بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ اور اونچی آواز میں کھنکار کر آنگن کا کلیجہ ہولا رہے تھے۔ حسینی ترچھا ترچھا چل کر ایک ہاتھ روپا کے شانوں پر رکھ دیے۔ دھیرے دھیرے کانپتے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی روپا چمک دھڑک رہی تھی۔ چتونوں سے وہی جان کو ہاکان کر دینے والی لاپروائی برس رہی تھی جس نے حسینی کی راتیں اجاڑ دی تھیں اور نیندیں لوٹ لی تھیں قبل اس کے حسینی کی سنسناتی ہوئی کنپٹیاں معمول پر آئیں وہ جاچکی تھی۔

(۱۶)

گاجی بھائی کو نماز پڑھے مدت ہوگئی۔ جانوروں کی گھنٹیاں سوگئیں۔ گڑھی کے شامیانے میں بجتے ہوئے نقاروں کی کڑم دھڑم حسینی کے آنگن میں کڈکڑے لگانے لگی۔ بنی نگر سے جانے والوں کی ٹولیاں کھیارے میں لاٹھیاں پٹکتی اور گالیاں بکتی دور نکل گئیں تب حسینی کو ہوش آیا۔ الگنی سے چادر اتاری جھاڑ کر کندھے پر ڈالی مہندی سے رنگی اور لوہے سے بندھی لاٹھی بغل میں دابی اور گاجی بھائی کے قالین لگے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی

ہوئی اپنی کھری چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"تو کا گاجی بھائی تم ...."

گاجی بھائی نے لیٹے لیٹے بات اچک لی

"نائیں حسینی بھٹیا ...... جوڑ جوڑ ٹوٹا ہوا ہے ......تم دیکھو آؤ نوٹنکی میں کا سوونے دیو"

روپا چھپر میں جھولتے چھینکے پہ پتیلی بیٹھا رہی تھی حسینی کی آواز سے چونک پڑی "درواجا بند کر لیو ......میں رات اترنے آنے جیوں"

(۱۷)

نوٹنکی کا مسخرہ ہاتھوں کے اشاروں اور آواز کے گھٹتے بڑھتے جھم سے فحش مذاق کر رہا تھا اور سامعین لوٹن کبوتر بنے ہوئے تھے۔ چاندی کے پیچوان سے شغل کرتے ہوئے "سرکار" تک مسند پہ پہلو بدل بدل کر داد دے رہے تھے کہ نبی نگر کے نوجوانوں کی چھنٹیا بھرا مار کر کھڑی ہو گئی۔ مجمع کو پھاڑ کر شامیانے کے باہر آ گئی اور اس خاموشی سے نبی نگر کے راستہ پہ ہولی جیسے وہاں ڈاکہ ڈالنے جا رہی ہو۔ یار علی کے پہلو میں چلتا ہوا حسینی خلا میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے اس مکان کو جس کے دروازے پہ مورچہ لپٹا ہوا پنسیری بھر کا قفل جھول رہا ہے اور جس کی کنجی وہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہے ...... اس مکان کو مٹی کا تیل چھڑک چھڑک کر پھونک رہا ہے اور اس آدمی کو جو مکان کی تنہائی میں اپنے گناہوں کی پوٹ کھولے بیٹھا ہے سانپ کی طرح کچل رہا ہے۔

"اور منور والے"

کسی نے اس کے اندر سے سوال کیا۔ اس نے بھنا کر کوئی موٹی سی گالی تجویز کی۔ چلور کے درختوں کے پاس سب کھڑے ہو گئے۔

یار علی ...... تم پہنچ گھر گھیر لیو ...... بس۔

حسینی کنوئیں سے بولا۔ یار علی نے گردن ہلا کر ان پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھا جو مرنے مارنے پہ تلے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے حسینی نے اپنے گھر کے چاروں طرف گھوم پھر اطمینان کر لیا کہ کہیں گاجی کی چھنٹیا والے چھپے تو نہیں بیٹھے ہیں پھر اپنے صدر

دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے کمر سے وہ بارہ انچی چاقو نکالا جس پہ کئی آدمیوں کے لہو نے دھار رکھی تھی ۔ جب یار علی نے سب انتظام سے فارغ ہوکر گردن کو بلایا تب حسینی دروازے کے طاق پہ پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا اور گردن اونچی کر کے چوروں کیطرح اپنے مکان کا جائزہ لیا ۔

(۱۸)

صحن کے بیچوں بیچ پلنگ پہ قالین لیٹا سو رہا تھا ۔ اس کے دونوں پہلوؤں پہ ایک ایک چارپائی بے سدھ پڑی تھی ۔ اپنی سانسوں کو سنبھال کر اس چھپر کو دیکھا جس میں روپا کی کوٹھری تھی ۔ دونوں کواڑوں کے بیچ ایک بالشت چوڑی لالٹین کی روشنی کی جھالر ٹنگی تھی ۔ حسینی طاق سے پاؤں اتار نیچے آیا ۔ زمین پہ بیٹھ گیا ۔ ہرن مار کہ بیڑی کا بنڈل نکالا چپکے سے دیا سلائی جلائی ۔ چار ہی کش میں بیڑی کو کھا گیا ۔ آخری کش کا دھواں اپنے سینے پہ چھوڑا جہاں بھنگرے لگے تھے ۔ چاقو کی دھار ایک بار پھر ٹٹولی اور دیوار پہ چڑھکر صحن میں بلی کی طرح اتر گیا ۔ پل صراط پہ چلتا ہوا کوٹھری کے دروازے پہ پہنچ گیا ۔ سانسوں کی دھونکنی بندکر دی ۔ دل کی دھڑکن کے بجتے ہوئے گھنٹے کو تھاما اور نگاہ اٹھائی اور شیشم کی گاؤدم ران کے شہتیر پہ روپا لیٹی تھی کاجل لگی آنکھوں سے ایسی من موہنی باتیں کر رہی تھی جن کو سننے کے لئے ہر رات حسینی نے خوابوں کی فصل بوئی تھی اور ہر صبح بیڑی دل نے بسیارہ چن لیا تھا ۔ گاجی بھائی کی انگلیاں جیسے مرکھنے بیلوں کو باندھنے والے کھونٹے ------ ایسی انگلیاں کرتی کی چنٹ لہنگے کے بھنور اور آنچل کی منھائی ------ سب کی خیریت پوچھتی چل رہی تھی ------ حسینی کے بدن کا سارا خون اچھل کر اس کے سر میں تڑپنے لگا اور کانوں پہ بجلیاں سی گر پڑیں ۔

رجب کے بیٹے ------ دھکار ہے تونی پہ

دھڑاک سے دروازہ کھل گیا ۔ روپا کھمپنی (گوپھن) کے ڈھیلے کیطرح اڑی اور کونے میں کھڑی ہوئی آدمی بھر اونچی منھور سے چپک گئی ۔ گاجی بھائی اس جھگڑے سے بر جھا گئے جیسے ہاتھی کی خلوت میں کوئی آدمی چلا جائے ۔ گاجی بھائی کوٹھری میں اسطرح کھڑے ہو گئے جیسے نیام سے جدھر نکلتا ہے ۔ گاجی بھائی نے اکہرے بدن کے حسینی کو

خالی ہاتھ دیکھا تو اندر ہی اندر کھل گئے جیسے آدھی لڑائی جیت لی ہو پھر وہ گینڈے کیطرح اچھلے پھرتیلا حسینی بازو میں ہو گیا اور وہ اپنے زور میں توپ کے گولے کیطرح کوٹھری سے نکل گئے۔ پھر حسینی کی باہوں میں آگئے۔ لوہے کے موٹے موٹے تاروں سے بٹی ہوئی باہوں میں آگئے۔ اس داؤ سے الجھے ہوئے حسینی نے دیکھا کہ روپا دہلیز پر کھڑی ہے۔ لالٹین کی روشنی میں جگمگا رہی ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے خالی روپا نہیں سارا نبی نگر سارنگ آباد ساری دنیا اس نامی رجب کے اکلوتے بیٹے کی آخری کشتی دیکھ رہی ہے اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن میں آگ بھر گئی۔ اس نے اپنی عمر بھر کی ساری طاقت اور رجب کی زندگی بھر کی کمائی کو پکار کر زور کیا اور گاجی بھائی کو ------ داؤ کو اپنے سر تک اونچا اٹھا لیا تھا۔ اور حسینی کی کنکھیوں نے دیکھا کہ روپا کی آنکھ کان تک چری ہوئی آنکھیں پھٹ گئیں ------ وہ اس دیو کو اٹھائے ہوئے اسطرح چلتا صدر دروازے تک پہنچ گیا جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور اس کی دہلیز پر یار علی پستول لئے کھڑا تھا۔ حسینی نے دروازے کی چوکھٹ ہی سے گاجی بھائی کو پھینک دیا۔ جیسے کنویں کی گراری تک کھینچے ہوئے جہازی لگرے کی رسی ٹوٹ جائے ------ حسینی تھوڑی دیر تک ساکت کھڑا رہا۔ پھر جب مڑا تو اس کے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے۔ دونوں بازو جھول گئے تھے جیسے ان کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں ہوں۔ ہونٹوں پر گرم گرم نمکین نمی رینگ رہی تھی۔ کوٹھری کی دہلیز پار کرتے ہی اپنے آپ کو پلنگ پر پھینک دینے کے لئے وہ جھکا لیکن راستے ہی میں اسے روپا نے سنبھال اپنا چادرہ اتار کر حسینی کے ہونٹوں کا خون پونچھا۔ جب اس کا ہاتھ حسینی کے پھوڑے سے چھو گیا اور وہ بے قرار ہو کر چیخ اٹھا تو وہ چونک پڑی۔ نادم نادم نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی ------ اپنے سفید شیشے کے ہاتھوں سے حسینی کے سینے کو سہلانے لگی ----- جیسے وہ حسینی کا ابھرتی ہوئی ہڈیوں والا سپاٹ سینہ نہیں ولائتی شیشے کا فانوس ہو ______ حسینی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا -------- کہ ولائتی شیشے کا فانوس روپا کے چہرے کی مشعل سے جگمگا اٹھا۔

———— • ————

آنکھیں

طاؤس کی غمناک موسیقی چند لمحوں کے بعد رک جاتی ہے۔

سبحان اللہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جہاں پناہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ سبحان اللہ

"بیگم" (بھاری اور رنجور آواز میں)

"جہاں پناہ ۔۔۔۔۔۔۔ اگر ہندوستان کے شہنشاہ نہ ہوتے تو ایک عظیم مصنف، عظیم شاعر عظیم مصور اور عظیم موسیقار ہوتے۔"

"یہ تعریف ہے یا غمگساری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بہر حال جو بھی ہے مابدولت کے بے قرار دل کو قرار عطا کرنے کی جسارت کرتی ہے۔"

"جہاں پناہ کی آنکھوں نے آج پھر نیند کو باریابی سے محروم رکھا؟"

"بیگم"

"نصیب دشمناں ۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا مزاج عالم پناہی۔"

"ہندوستان کے تخت پر جلوس کرنا آسان ہے لیکن سچ بولنا دشوار ہے۔ دشوار تر۔"

"نور جہاں بیگم کے سامنے بھی عالم پناہ!

"بیگم"

"ظل الٰہی کو جو ارشاد فرمانا ہے وہ ارشاد فرما دیا جائے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر جلاد کو حکم دیا جائے کہ ہمارے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر الفاظ پر مہریں لگا دے۔"

"خوب ۔۔۔۔۔۔ جوانی آنکھیں قبول کر چکی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بڑھاپا سماعت کو سولی چڑھا دے۔"

"کنیز کچھ سمجھنے سے قاصر ہے۔"

"آپ کے نام کا سکہ روئے زمین کی سب سے شاندار سلطنت کے بازار کا چلن ہے۔ ہندوستان کی مہر حکومت آپ کی انگشت مبارک کی زینت ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ جہانگیر

ایک جام کے عوض تاج ہندوستان آپ کو عطا کر چکا۔۔۔۔۔۔۔۔لیکن یہ کون جانتا ہے کہ جہانگیر آج بھی اپنی محبت کی تکمیل کا محتاج ہے۔"

"ظل اللہ۔"

"پوری کائنات کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے والی محبت اس ایک چھوٹے سے لمحے کی محتاج ہوتی ہے جب عاشق اپنے سینے کا آخری راز محبوب کے سینے میں منتقل کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ آج کون سی رات ہے بیگم۔"

"شوال کی چودہویں عالم پناہ۔"

"بہت خوب۔۔۔۔۔۔۔۔ آج کی رات آسمان سے اس لئے اتاری گئی کہ مابدولت آپ کے سر پر تکمیل محبت کا تاج رکھ دیں۔"

"ظل الہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا روئے زمین پر کوئی عورت ہے جس کے ہاتھ میں خاتم سلیمانی ہو اور سر پر محبت کا تاج؟"

"نور جہاں بیگم۔۔۔۔۔۔۔رام رنگی کا ایک جام بنائیے اور اس طرح ہونٹوں سے لگا دیجئے کہ جام مابدولت کی آنکھوں سے دور رہے۔۔۔۔۔۔۔ایک عمر ہونے کو آئی کہ جام میں آنکھیں نظر آرہی ہیں۔۔۔۔۔۔وہی آنکھیں۔۔۔۔۔۔۔۔وہ بے پناہ آنکھیں۔"

"جہاں پناہ طبیب شاہی کی مقرر کی ہوئی مقدار شراب۔۔۔۔۔۔"

"نوش فرما چکے یہ کیسی شہنشاہی ہے کہ ایک ایک جام کو ترستی ہے۔۔۔۔۔۔۔؟

"بیگم۔۔۔۔۔۔ہماری محبت کے جشن تاجپوشی کے تصدق میں ایک جام عطا کر دیجیے۔"

"اتنی عزت نہ دیجئے جہاں پناہ کہ نور جہاں اس بار عظیم کی متحمل نہ ہو سکے۔"

(شراب ڈھالتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ایک ہی سانس میں جام خالی ہو جاتا ہے)

"بیگم۔"

"کنیز ہمہ تن گوش ہے عالم پناہ"

"ایک مدت ہوئی کہ مابدولت زندہ تھے۔"

"ظل اللہ۔"

"جی ہاں بیگم۔۔۔۔۔۔زندگی کا صرف ایک نام ہے۔ جوانی۔۔۔۔۔۔اور سلیم کی جوانی دولت مغلیہ کے اولیں صاحب عالم کی جوانی۔۔۔۔۔۔۔فردوس مکانی بابر بارہ برس کی عمر میں

بادشاہ ہو گئے۔ جنت مکانی ہمایوں میدان جنگ میں تلوار چلاتے ہوئے جوان ہوئے۔ عرش آشیانی (اکبر) اپنے داداجان کی طرح بارہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے اور اکبر اعظم کی ولیعہدی سلیم کا مقدر ہوئی ۔۔۔۔۔۔۔عرش آشیانی نے جب شراب پر پہرے بٹھا دیے تو مابدولت کے جاں نثار اپنی بندوقوں کی نالیوں میں شراب بھر کر لاتے اور پیمانے لبریز کر دیتے اور نظام ہضم بارود سے سینچی ہوئی شراب اس طرح ہضم کر لیتا جس طرح آج دوا کا پیالہ ہضم نہیں ہوتا۔ اس بے پناہ جوانی اور بے محابہ شہزادگی کا اثر تاجداری پر طاری رہا۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔بیگم۔"

"عالم پناہ۔"

"یہ پردہ ہٹا دیجئے ۔۔۔۔۔۔سنگ مرمر کی زیبائی چاندنی سے ہوتی ہے۔ آج کی رات کی چاندنی میں اگر مابدولت جوان ہوتے تو ساری رات آپ کے ہاتھوں سے پیمانے قبول کرتے رہتے۔"

"جہاں پناہ۔"

ہاں بیگم ۔۔۔۔۔۔دوسرا سال جلوس تھا۔ مابدولت مینابازار میں جلوہ افروز تھے کہ ایک لڑکی نے پان پیش کئے۔ گلوریوں کی نزاکت اور نفاست پسند خاطر ہوئی۔ ہاتھوں پر نظر پڑی تو اور ہی عالم نظر آیا جیسے نور کے سانچے میں ڈھال دے گئے ہوں۔ نگاہ بلند ہوئی۔ معصوم وحشی آنکھوں میں ڈوب گئی اور محسوس ہوا جیسے اندر کہیں کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ جب ہوش آیا تو وہ نگاہ نیچے کئے لرز رہی تھی اور دونوں ہاتھوں میں طشت کانپ رہا تھا۔ مابدولت گردن سے ہار اتار رہے تھے کہ اس کی آواز طلوع ہوئی جیسے کشمیر کے برف پوش پہاڑوں پر سورج کی کرن تڑپتی ہے۔

"تحفہ درویش کی قیمت کیا عالم پناہ۔"

بے شک تحفہ درویش قیمت سے بلند ہوتا ہے۔ یہ موتی اس نفاست اور نزاکت کی داد ہیں جو ان گلوریوں میں مجسم کر دی گئی۔ ہم آگے بڑھے تو عرفان ہوا کہ ہم پیچھے رہ گئے۔ پہلی بار معنی ویران معلوم ہوا ۔۔۔۔۔۔اکبر اعظم کے جانشین کی بارگاہ خالی محسوس ہوئی پہلی بار مابدولت کو غربت کا تجربہ ہوا ایسی غربت جو دل کو مٹھی میں دبوچ کر ایک ایک قطرہ لہو نچوڑ لیتی ہے اور جب ہم نے چاہا کہ دل کی ویرانی کو شراب سے شاداب کر لیں تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ شراب نشے سے عاری ہو چکی۔ دیر تک شیشے خالی ہوتے رہے لیکن دل کا خلا پر نہ

ہو سکا۔"

"جہاں پناہ! کنیز نے اپنی کم فہمی کی بنا پر قیاس کیا تھا کہ ظل الہی کا راز شاہزادہ خرم اور شاہزادہ شہریار کی آویزش سے متعلق ہو گا لیکن۔"

"خرم اور شہریار کی آویزش مغل تاجداروں کی روایت ہے۔ مغل سلطنت اس کا مقدر ہوتی ہے جس کی تقدیر کامگار اور شمسیر آبدار ہوتی ہے۔ جب خسرو نے مابدولت کے منہ پر تلوار کھینچ لی تو خرم اور شہریار بہر حال۔"

"پھر جہاں پناہ۔"

"پھر مابدولت کے ہاتھ نے گھنٹہ بجا دیا۔ چوبدار کے بجائے محرم خاں کورنش ادا کر رہا تھا۔ ابھی اس کی بے ادب حاضری پر غور فرما تھے کہ معروض ہوا۔ پان پیش کرنے والی صاحبزادی کا نام صائمہ خاتون ہے جو بخارا کے شیخ الاسلام کی پوتی اور جلوہ دار شیخ عرب کی بیٹی ہیں ان کا مکان عرب کی سرائے ہے۔"

"محرم خان"

"ظل الہی"

"یہ قیمتی معلومات کس کے حکم سے فراہم کی گئیں۔"

"زبان مبارک سے نازل ہونے والے احکامات کی تکمیل ہر بندۂ درگاہ کا فرض ہے۔ لیکن محرم خاں جیسے مقرب بارگاہ کے منصب حق ہے کہ وہ عالم پناہ کے چشم و ابرو زبان سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو۔"

"جہانگیری چشم و ابرو کی زبان سمجھنا ایک نادر علم ہے لیکن اس کا اظہار اس سے زیادہ نادر ہنر اور اس ہنر کا غلط استعمال بیداد کا مستوجب۔"

"خداوند۔"

مابدولت نے تمہارا قصور معاف کیا اور حکم دیا کہ خلعت ہفت پارچہ مع زرد جواہر کے ساتھ نواب صائمہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہو اور پیام دو کہ جشن سالگرہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں۔

"ہر چند کہ ابھی رات کی زلف کہیں تک بھی نہ پہنچی تھی تاہم بے طرح انتظار فرما ہو چکے تھے۔"

"کتنی خوش نصیب تھی صائمہ بیگم کہ عالم پناہ اس کے منتظر تھے۔ کتنی

بدنصیب تھی صائمہ بیگم کہ جہاں پناہ کی حضوری سے محروم تھی۔"

"تمام رات وہ آنکھیں ہماری آنکھوں کے سامنے مجریٰ کرتی رہیں جن کی سیاہی میں ابدالآباد تک کے تمام مہجور عاشقوں کی سیہ بختی کا جوہر کھینچ کر انڈیل دیا گیا تھا۔ جن کی تاب کے سامنے تمام سمندروں کے تمام موتیوں کی آب پانی پانی تھی۔"

"سبحان اللللہ -------اگر ملک الشعراءاس تشبیہہ کو سن لیتا تو خجالت سے ڈوب ڈوب جاتا۔"

"وہ رات زندگانی کی سب سے بھاری رات تھی۔"

"کیا اس رات سے بھی بھاری جہاں پناہ --------جس کی صبح اکبر اعظم کی تلوار طلوع ہونے والی تھی۔"

"ہاں بیگم -----------اس رات کی دلداری کے لئے پچاس ہزار تلواریں سلیم کی رکاب میں تڑپ رہی تھیں اور صاحب عالم کے منہ سے نکلا ہوا ایک فقرہ اکبری تلوار کو غلاف کر سکتا تھا لیکن اس رات کی غمگساری کے لئے نورالدین محمد جہانگیر کے پاس ایک دامن و آستین کے سوا کچھ نہ تھا۔"

کاش ------اس رات کی خدمت گزاری کنیز کا مقدر ہوئی ہوتی۔"

پھر سورج کی کرنیں سلام کو پیش ہوئیں -------مابدولت درشن کے پر نزول اجلال کے اہتمام میں مصروف تھے کہ فریادی نے زنجیر ہلا دی۔"

صائمہ بیگم اس طرح باریاب ہوئی گویا وہ کشور ہندوستان کے قلعہ معلیٰ میں نہیں کسی غریب عزیز کے گھر میں قدم رنجہ فرما رہی۔ نقاب کے اٹھتے ہی محسوس ہوا جیسے داروغہ چاندنی خانہ نے قلعہ معلیٰ کی تمام روشنیاں ایک شاہ برج میں انڈیل دی ہوں۔ استفسار پہ اس طرح مخاطب ہوئی جیسے وہ جہانگیر سے نہیں اپنی ڈیوڑھی پہ کھڑے ہونے سوالی سے مخاطب ہے -------اس کی خطابت نے یقین دلا دیا کہ مابدولت نے محرم خاں کو سفیر بنا کر غلطی کا ارتکاب نہیں جرم سرزد فرمایا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ بھری دوپہر پہ رات غالب آ گئی ہے۔ وہ جا چکی تھی ---------اس کے غروب ہوتے ہی محرم خاں باریاب ہوا ------عرض کیا گیا کہ خلعت نامقبول اور دعوت نامنظور ہوئی۔"

نجابت اور شرافت پہ اتنا غرور ---------ایسا تجبّر-----معاذاللللہ---------
معاذاللللہ-----ایک جام اور عنایت کہ زبان خشک ہونے لگی ہے۔ (شراب ڈھالتی ہے---

اور ایک ہی سانس میں آبگینہ ختم ہو جاتا ہے)

"جہاں پناہ۔"

گوش گزار کیا گیا کہ ارم آشیانی علیہ حضرت مریم زمانی ورود مسعود فرما رہی ہیں۔۔
۔۔۔۔۔۔سلام کے جواب میں ارشاد ہوا کہ شیخو بابا کو اس مغرور لڑکی میں کیا نظر آ گیا کہ مغل جبروت و جلال کی بازی لگا دی گئی ۔۔۔۔۔۔مابدولت سکوت فرما رہے ۔۔۔۔۔۔جب سکوت حد ادب سے گزرنے لگا تو علیہ حضرت نے سنا کہ صائمہ بیگم سر سے پاؤں تک کرشمہ الٰہی ہے لیکن آنکھوں کی بے پناہی زمین و آسمان کے درمیان اپنی مثال نہیں رکھتی ۔۔۔۔۔۔۔۔
سورج شاہ برج سے رخصت ہو کر اجازت مانگ رہا تھا کہ علیہا حضرت ثانی کا غلغلہ بلند ہوا۔ خوش خبری سنائی گئی کہ سفارش خاص پر نواب صائمہ بیگم رات کے کسی پہر قلعہ مبارک میں جلوس فرمائیں گی۔"

"ظل الٰہی نے اس خبر کو کس طرح قبول فرمایا۔"

مابدولت نے غسل فرمایا۔۔۔۔۔۔۔۔نیا لباس زیب تن کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نئے جواہر سے آراستہ ہوئے ۔۔۔۔۔۔اور خاصہ تناول فرمایا ۔۔۔۔۔داروغۂ چاندنی خانہ کو حکم ہوا کہ ارک معلیٰ کا چپہ چپہ روشنی میں غرق کر دے۔

"داروغۂ بیوتات کو فرمان ملا کہ ذرہ ذرہ مشک و عنبر سے معطر کر دے اور داروغۂ جواہر خانہ کو پروانہ پہونچا کہ شاہ برج کے طاق جواہرات سے لبریز کر دے۔ قلعہ دار کو مطلع کیا گیا کہ نواب صائمہ بہادر کی سواری کو نوبت خانے کی سیڑھیوں تک آنے کی اجازت عطا ہوئی۔ احکامات کی تعمیل ہو چکی تھی اور مابدولت انتظار کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔"

"ظل اللہ کے ذہن مبارک سے انتظار کا لفظ عطا ہو کر کنیز کی سماعت پر اس طرح گرتا ہے جیسے طاؤس پر عقاب۔"

مقربین بارگاہ نے تہنیت دی کہ حضرت نواب صائمہ بیگم بہادر کی سواری نوبت خانے کی سیڑھیوں پر لگا دی گئی ۔۔۔۔۔۔چوبداروں کی آوازوں پر ملاحظہ فرمایا کہ وہ سیاہ سوتی برقعہ پر بھاری نقاب ڈالے، دونوں بازوؤں پر عورتوں کا سہارا لئے ہاتھوں میں ایک سرخ پیالہ سنبھالے آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ نقیب خاص کی آواز پر عورتوں نے اس کے بازو چھوڑ دیئے اور وہ کورنش ادا کرنے کے بجائے گھٹنوں پر گر پڑی کانپتے ہاتھوں نے دراز ہو کر پیالہ تخت کی طرف بڑھا دیا۔۔۔۔۔۔۔مابدولت تخت سے اتر پڑے دستگیری عطا کرنے کے

بجائے اس کی نذر قبول کی ---------- پیالہ ہاتھ میں آیا تو بیگم --------- جیسے آنکھوں سے بصارت چلی گئی۔"

"جہاں پناہ۔"

"پیالے میں اس کی آنکھیں تڑپ رہی تھیں۔"

"ظل الہی۔"

ہاں بیگم اس کی آنکھوں کے دیدے پیالے میں رکھے تھے --------- شہنشاہ کی پوری عمر میں آداب شہنشاہی کبھی اتنے بھاری نہ معلوم ہوئے ------- تاہم انہوں نے اس کا نقاب اٹھا دیا ------- آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ زرد سنگ مرمر سے تراشا ہوا چہرہ ساکت تھا۔ پائے مبارک میں جیسے کسی نے زنجیریں ڈال دیں۔"

"نصیب دشمناں۔"

"صرف اس قدر ادا ہو سکا کہ نواب صالحہ بیگم بہادر نے یہ کیا کر لیا۔"
آواز آئی

"شہنشاہوں کی پسند غریبوں کو زیب نہیں دیتی۔ ناچیز کی آنکھیں جہاں پناہ کو پسند آ گئیں -------- نذریں گزار دی گئیں ---------- گل کی کٹوریوں کی طرح قبول فرما لیجئے۔" سر سے پاؤں تک آنسوؤں میں پروئی ہوئی ہماری اجنبی آواز ایک ایک طبیب کا دامن سماعت پکڑ کر فریادی ہوئی ------ لیکن بیگم۔"

"ظل الہی۔"

"جب بھی تنہائی باریاب ہوتی ہے --------- جہانگیر کی پیٹھ پر اس آواز کے تازیانے برسنے لگتے ہیں -------- آنکھوں میں وہ زندہ دیدے انگاروں کی طرح دہکنے لگتے ہیں -------- کاش وہ زندہ رہتی تو جہانگیری محل اس کو تفویض کر دیا جاتا اس کی دلداری اور دلآسائی کی جاتی تو شاید اس چوٹ کی تڑپ کم ہو جاتی بیگم۔"

"جہاں پناہ۔"

"ایک جام اور عطا کر دیجئے کہ سماعت جلنے لگی ہے اور بصارت دہکنے لگی ہے۔"

بھولے بسرے

کچھ راتیں اتنی بھاری ہوتی ہیں کہ صدیوں میں کبھی کبھی اور کسی کسی ملک پہ اترتی ہیں۔ ان کی کوکھ سے وہ سورج جنم لیتا ہے جن کی روشنی میں سونا پیتل اور پیتل سونا ہو جاتا ہے۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کی رات ایسی ہی ایک تھی۔ لال قلعہ حضرت دہلی کے سر پہ جھوٹے تاج کی طرح رکھا تھا۔ لاہوری دروازے کی توپیں اتر چکی تھیں۔ پہرہ اٹھ چکا تھا۔ مغل پرچم ادبار کی آدھی رات کی سیاہی میں ڈوب چکا تھا۔ دہلی دروازے کے دونوں آہنی کپاٹ کھلے پڑے تھے۔ ان کے دونوں طرف بندھے ہوئے دونوں ہاتھی حیرت سے پتھر ہو چکے تھے۔ شہزادے اور شہزادیاں سلاطین اور ان کی بیگمات اور ان کی سرکاریں اور ان کے درباری اور ان کے دستر خوانوں پر بھنکنے والے پشتینی خوشامدی ایک عظیم الشان میت کے جلوس کی طرح گزر چکے تھے۔ گزر رہے تھے۔ مرزا مغل افواج شاہی کے کمانڈر انچیف دوسرے شہزادوں اور افسروں کے ساتھ اپنی ٹوٹی پھوٹی پلٹنوں کے بے آبرو ہتھیاروں کی چھاؤں اور اندھی شمعوں کی کالی روشنی میں شہر پناہ کے دہلی دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ دہلی دروازے سے نو محلے تک اور نو محلے سے نوبت خانے تک تمام راستہ اسباب کی اقسام سے پٹا پڑا تھا اور اس کی پشت اور سامنا ان گنت شعلوں کی دھوپ سے روشن تھا۔ برقندازوں اور گرزبرداروں اور چیلوں کے ڈرے ہوئے چہروں سے چھلک رہا تھا۔ نوبت خانے سے دیوان عام تک تمام عمارتیں خالی پڑی تھیں۔ تمام راستے بد نصیب تلواروں اور بد اقبال بندوقوں سے پٹے پڑے تھے۔ دیوان عام کے بازو پر وہ روایتی لال پردہ ابھی کھنچا ہوا تھا جس پر سر جھکائے بغیر شہزادے بھی داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ دیوان میں نشیمن ظل الٰہی یعنی جھروکے کے نیچے لکڑی کا تخت طاؤس رکھا تھا جو بہادر شاہ کے تاج کی طرح نقلی تھا۔ بہادر شاہ کی بادشاہی کی طرح خیالی تھا۔ تخت طاؤس تو مغلوں کی عظمت کے ساتھ نادر شاہ کے مال غنیمت میں شامل ہو کر ایران جا چکا تھا۔ شاہ عالم کے دل میں جب اس کی یاد ہوک بن کر اٹھی اور سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی تو ہوا خواہان دولت نے تخت طاؤس کی نقل پیدا کر لی۔ لکڑی پر ایسا

رنگ و روغن کیا کہ سونا تو سونا ہیرے موتی تک شرمانے لگے اور اپنے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شہنشاہ نے دیکھا تو طاؤس کی کلغیوں کے زمرد تک اصلی معلوم ہو رہے تھے۔ وہ جس نے آنکھ کھول کر اصلی تخت طاؤس کا جلال و جمال دیکھا تھا نقلی تخت طاؤس کو دیکھتا رہ گیا کہ تسبیحوں کے موتیوں کا پانی عدن کے سمندروں پر بھاری تھا۔ وہ سلطنت کبریٰ جو گھٹتے گھٹتے دلی سے پالم تک رہ گئی تھی جب لال قلعہ کی سرخ دیواروں کے پیچھے بند ہو کر رہ گئی اور اس نقلی تخت طاؤس کو سجنے والے دربار رخصت ہو گئے تو اسے دیوان عام کے تہ خانوں میں دفنا دیا گیا۔ چار ماہ قبل ۱۹ مئی کو یہ تخت پھر نکالا گیا۔ آب و تاب کو اجالا کیا گیا اور دیوان عام کو سجایا گیا اور جھوٹے بادشاہ کو اسی جھوٹے تخت پر سجا دیا گیا۔ سکہ مسکوک ہوا اور خطبہ پڑھا گیا اور وہ سبھی کچھ ہوا جو تاریخ کے ایسے تماشوں میں ہوا کرتا ہے اور اب ڈراپ سین کا وقت آچکا تھا لیکن ۱۹ ستمبر کی اس تاریخی رات میں شاہجہانی قانون کے مطابق تلوار یئے راجپوتوں کا ایک دستہ غلاف پڑے ہوئے تخت طاؤس کے سامنے کندھوں پر بندوقیں رکھے اور کمر میں تلواریں باندھے پہرہ دے رہا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ تخت کو سلامی دیے بغیر سامنے سے گذر جائے اور لال پردے کے پیچھے دیوان خاص کی پہلی سیڑھی پر بوڑھا بادشاہ سر پر تاج سینے پر قرآن پاک اور کمر میں تلوار پہنے کھڑا تھا۔ دبلا پتلا بیمار بدن کانپ رہا تھا۔ داڑھی پر آنسو جڑے تھے۔ دونوں اٹھے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں کھلی ہوئی آنکھیں آسمان کے کسی ستارے پر جمی ہوئی تھیں جو اس کا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے جواں بخت اور اس کی اوٹ میں زینت محل اور سامنے آخری سیڑھی پر انگریزوں کا پرانا نمک خوار جاسوس اور بادشاہ کا وزیر اعظم الٰہی بخش ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اس کے برابر جنرل بخت خاں اپنے گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ "ظل سبحانی! چالیس ہزار سوار ہماری رکاب میں ہیں۔ جنت آشیاں شہنشاہ بابر بارہ ہزار سوار لے کر ہندوستان آئے تھے۔ عالم پناہ اس غلام پر بھروسہ رکھیں۔ محلات عالیہ کو ہمایوں کے مقبرے سے چھوڑ دیں اور خود بدولت دریا تر لیں۔ خدا نے چاہا تو عرش مکانی شہنشاہ ہمایوں کیطرح دلی دوبارہ فتح ہو گی اور تجربہ کار بڈھے جاسوس نے پینترہ بدلا۔

"اور مغلوں کا چراغ پٹھانوں کے دامن میں بجھا دیا جائے گا"

جنرل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ طپنچے کی جوڑی پر چلا گیا۔

رب العالمین کی قسم! اگر ظل سبحانی کے حضور میں نہ ہوتے تو اس فقرے کا جواب ہماری تلوار دیتی اور بہادر شاہ نے بیماری کے باوجود دو سیڑھیاں جوانوں کی طرح طے

گیں اور جنرل کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"بہادر" زبان کا جواب تلوار سے نہیں دیا جاتا۔ تلوار کی جگہ میدان جنگ ہے جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔" اور بادشاہ آگے بڑھ گیا اور جنرل سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جب یہ چھوٹا سا جلوس مغلوں کے جنازے کا جلوس دیوان عام کے سامنے آیا تو بادشاہ جریب کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

روشنیاں تیز کرو۔ باپ دادا کے اس سجادے کو آخری بار دیکھ لوں کہ شاید پھر کبھی دیکھنا نصیب نہ ہو۔ سینکڑوں مشعلوں، پنشاخوں اور گلاسوں اور جھاڑوں کی روشنی میں بادشاہ نے دیکھا کہ تخت طاؤس پر لال غلاف پڑا ہے اور اس کے دونوں بازوؤں پر دو سپاہی کیسری بانے پہنے ہتھیاروں میں اٹیچی بنے کانوں تک مونچھیں چڑھائے شیروں کیطرح کھڑے ہیں جیسے ہی بادشاہ نے سیڑھی پر قدم رکھا انھوں نے کندھے سے بندوقیں اتار کر سلامی دی اور تن کر کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ ان میں سے ایک کے قریب گیا۔ ان کے بدن دیکھتا رہا ان کے چہرے دیکھتا رہا ان کی آنکھیں دیکھتا رہا اور سر ہلاتا رہا۔

"تمہارا کیا نام ہے"

"اجیت سنگھ .... تم کو کمر کھولنے کا حکم نہیں ملا ...." "ملا تھا مہابلی!"

بادشاہ کھڑا کانپتا رہا اور گردن ہلاتا رہا۔ "ہم نے تمہاری خدمت معاف کی جاؤ ..... اپنے ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا کرو۔"

تھا کر نے سلام کیلئے سر جھکایا۔ پھر نگاہ اٹھائی تو بادشاہ کے جلوس کے آخری آدمی کی پیٹھ پر ڈھال چمک رہی تھی۔ پھر اچانک نوبت خانے سے نوبت بجنے لگی۔ آخری نوبت بجنے لگی بادشاہ لڑ کھڑا گیا۔ جنرل نے اپنا شانہ پیش کر دیا۔

"بند کرو .... کانوں میں زخم ہونے جاتے ہیں۔"

اور نوبت بند ہوگئی۔ جسطرح بجتے ہوئے ریڈیو کی بجلی فیل ہو جائے۔ بیماری اور ناکامی کے باوجود بادشاہ کا حکم تھا کہ دیوان خاص سے دہلی دروازے تک قلعہ معلیٰ کی ساری زمین کو وہ ننگے تلوؤں سے چومتا ہوا چلے گا لیکن نوبت خانے سے نکلتے ہی اس کی تقدیر کیطرح اس کے پیر بھی جواب دینے لگے اور جنرل کے اشارے اور الہیٰ بخش کی گذارش پر ہوادار کو طلب کر لیا گیا۔ بادشاہ تکیے سے پیٹھ لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

بھاری رات کی کوکھ سے سورج نکلا تو سونا پیتل ہو چکا تھا اور پیتل سونا۔

انگریزی توپوں کے دھوئیں میں ہندوستانی انقلاب کا سورج گہنا چکا تھا۔ایک ہی ہلے میں کشمیری دروازہ چھن گیا۔جمعہ کی اذان کے ساتھ جامع مسجد اپنے ہزاروں ہزار نمازیوں کے خون سے وضو کرنے لگی تھی اور لال قلعے کے نہتے دہلی دروازے پر کرنل ہملٹن کی پلٹنوں نے دھاوا کر دیا۔ دروازے بارود سے اڑادیے گئے۔ ہاتھیوں پر چڑھی ہوئی توپوں نے گھونگھٹ کے دمدمے اور برج مٹی میں ملا دیے۔ کرنل اور اس کے فاتح سپاہیوں کے گھوڑے نو محلے اور چوبیں مسجد کے سامنے سے گذرتے ہوئے نوبت خانے کی سیڑھیوں تک آچکے تھے۔ انگریزی فوج کی مشہور عالم ڈسپلن کشمیری دروازے ہی میں کام آچکی تھی۔شہر میں ہونی لگی آگ کی لپٹوں میں لال قلعے کے محل جل رہے تھے اور کرنل اپنے رسالے کے ساتھ دیوان عام کے رمنوں میں داخل ہوچکا تھا اور چوبیں مسجد سے اٹھتا ہوا دھوئیں کا مینار دیکھ رہا تھا کہ ایک آواز تڑپ گئی۔

"خبر دار ------- تخت شاہی ----------ادب لازم"

کرنل نے جھک کر گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔ گلے میں پڑے فیلڈ گلاس کو آنکھوں سے لگالیا۔اردگرد کے سوار اس کے پیچھے سمٹ آئے تھے۔کرنل نے دیکھا کہ دیوان عام کے آدھے آدھے بندھے لال بانات کے پردوں کے پیچھے سرخ مخمل کے غلاف پہنے ستون کھڑے ہیں۔ پتھر کے خالی بے جان ستون۔اس نے فیلڈ گلاس ہٹالیا۔ گھوڑے پر ترچھا ہو کر بگل بردار کو کرچ سے اشارہ کیا۔بگل بردار نے تین بار بگل بجایا اور آناً فاناً گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازوں سے سارا رمنہ چھلکنے لگا۔ ٹونیٹی سکنڈ امپیریل ماؤنٹڈ کیویلری کی چاروں کمپنیاں جو نو محلے سے ساون بھادوں تک اور لاھوری دروازے کے چھتے سے سلاطین کے مکانوں تک لوٹ مار اور نوچ کھسوٹ اور آتشزنی میں مصروف تھیں گھوڑے اڑاتی آئیں اور کرنل کے پیچھے اور داہنے بائیں دور تک ایک لانبی کمان کی صورت میں پھیل گئیں۔سکنڈ ان کمانڈر میجر ڈگلس تن کر رکابوں پر کھڑا ہو گیا۔

"دہلی فتح ہوچکا-------ہتھیار ڈال دو-------نہیں تو کتے کی موت مارا جائیگا۔

ابھی ان الفاظوں کی گونج سے فضا تھرتھرا رہی تھی کہ دیوان عام سے پہلی گولی چلی اور ڈگلس کے برابر گھوڑے پر سوار انگریز بگل بردار الٹ گیا اور اس کی رکابوں میں پھنسے ہوئے پاؤں گھوڑے کی کنوتیوں کے برابر آگئے اور ڈگلس کو اپنی زین پر قائم رہنے میں دقت ہوئی کہ اس کا گھوڑا الف ہوچکا تھا۔

"ٹیک پوزیشن ------ فائر ----------- چارج"

کرنل ہیملٹن گرجا اور درجن بھر بندوقیں دیوان عام پہ چل گئیں اور اب سواروں کا رخ دیوان عام کے دونوں بازووں کیطرف تھا اور کرنل کا گھوڑا اسی جگہ جما کھڑا تھا کہ دیوان عام سے دوسرا فائر ہوا اور ہملٹن کی آنکھوں کے سامنے داہنی طرف بڑھتے ہوئے رسالے کا سب سے آگے اڑتا ہوا سوار گھوڑے کی زین میں پھنسا ہوا گھسٹ رہا تھا اور اب گولیاں چلنے لگی تھیں برسنے لگی تھیں اور اس کے باڈی گارڈ اس کے پہلوؤں سے نکل کر اس کے سامنے دیوار کیطرح کھڑے ہو چکے تھے اور وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بائیں بازو کا رسالہ لال پردے کو اپنی کرچوں سے پھاڑ کر دیوان عام کی پشت پر مڑنے لگا تھا ۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ شاید جنرل بخت خاں کے کریک ڈویژن کے ان گنت مجاہد دیوان عام میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں اور اس خیال کے آتے ہی اس نے ڈگلس کو حکم دیا کہ دلی دروازے پہ کھڑی ہوئی فوج دریا کی ریتی پر پھیل جائے اور ان کے بھاگنے کے راستے مسدود کر دے ۔ ساتھ ہی لاہوری دروازے کے سواروں کو حکم پہنچا کہ وہ ماونٹ ہیوی آرٹلری کے ساتھ حاضر ہوں اور دیوان عام کو اڑا دیں کہ دیوان عام سے اتنی تیزی کے ساتھ اور اتنے سچے فائر ہو رہے تھے کہ وہ حیرت زدہ تھا اور اپنے پچھلے احکامات پر شرمندہ تھا اور نئے احکامات کہ ---------- اس کے سامنے کھڑے ہوئے گارڈز میں سے ایک کے گولی لگی اور ڈگلس اس کے گھوڑے کی لگام دبوچ کر اسے پیچھے کیطرف ڈھکیلنے لگا ۔

"فتح کئے ہوئے قلعے کے چند پتھروں کیلئے ہم آپ کو قربان نہیں کر سکتے ۔"

اور پھر دیوان عام سے آتی ہوئی گولیوں کے درمیان وقفہ بڑھنے لگا تھا کہ ڈوبتا ہوا سورج بہت دیر نہیں لگاتا ۔ اب سب کچھ خاموش ہو چکا تھا ۔ دیر کے بعد کرنل کے اشارے بگل بردار نے بگل بجایا ۔ سارے سپاہی اپنی اپنی پوزیشن پر الرٹ کھڑے رہے ۔ ہیملٹن ڈگلس کے ساتھ اپنے گارڈز کو جلو میں لیے ہوئے دیوان عام کیطرف بڑھنے لگا لیکن اتنی احتیاط کے ساتھ جیسے نہتے شکاری شیروں کی ماں میں گھستے ہیں ۔ ڈگلس نے داہنے ہاتھ سے ہیملٹن کے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی ۔ اس کا بایاں ہاتھ بلند ہوا اور کتنے ہی سوار تڑپ کر گھوڑے سے اترے اور بجلی کیطرح دیوان عام میں چڑھ گئے ۔ لیکن کوئی بندوق نہ چلی ۔ کوئی آواز نہیں نکلی ۔ ہیملٹن گھوڑے سے اترا جیسے بادشاہ تخت سے اترتا ہے ۔ سیڑھیوں پہ چڑھا جیسے تخت طاؤس پہ پاؤں رکھ رہا ہو ۔ ہیملٹن نے دیکھا دیوان عام کے شمالی اور جنوبی

دروں پر بھاری پردے پڑے ہوئے ہیں۔ شہ نشین کے نیچے سرخ مخمل کے غلاف میں لپٹے ہوئے تخت طاؤس کے ارد گرد درجنوں خالی داغی ہوئی بندوقیں پڑی ہیں اور ان کے سامنے کیسری بانے پہنے کانوں تک مونچھیں چڑھائے گولیوں سے چھلنی اپنے خون میں لت پت دو سپاہی صرف دو سپاہی پڑے ہیں۔

دیوان عام کا کونہ کونہ تہہ خانوں کا چپہ چپہ چھان ڈالا گیا لیکن تیسری لاش نہیں ملی پورے قلعے کی تمام عمارتوں کا تنکا تنکا دیکھ لیا گیا لیکن تیسری لاش نہیں ملی۔ غلاف پوش نقلی تخت طاؤس پر فاتح ہیملٹن کا بوٹ اسی طرح رکھا تھا۔ ڈگس اسی طرح چپ چاپ کھڑا تھا۔ ہملٹن نے لاشوں کو گھور کر دیکھا اور جیسے ڈگس سے کہا جیسے اپنے آپ سے کہا اگر دلی کے بادشاہ کو ان جیسے ہزار دو ہزار سپاہی مل گئے ہوتے تو اور ڈگس نے جملہ پورا کر دیا۔
"تو ہندوستان کی تاریخ بدل گئی ہوتی۔

———— • ————

میراث

رات سو رہی تھی لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ بادل کی رضائی کہیں کہیں سے مسک گئی تھی۔ اور اکا دکا ستارے چمک اٹھے تھے۔ پھر ایک ساتھ کئی گھنٹیاں کھنک اٹھیں۔ اس نے چوڑے چکلے پلنگ پر تھکاہارا بھاری بھرکم جسم اور پھیلالیا۔ پھر گھنگروؤں نے چٹکی لی۔ اس نے کاہلی سے کروٹ بدل کر دیکھا۔ آنگن کے بائیں چھپر کے آگے چرنیوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کے اپنے ہاتھ سے خریدے ہوئے جانور اجلے کالے دھبوں کیطرح کھڑے بیٹھے تھے۔ اور کنمنا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ٹارچ ٹٹولنے لگا لیکن پکڑ میں کارتوس آگئے۔ اس نے حاملہ عورتوں کیطرح پورا بدن موڑ کر سرہانے سے قالین کا کونا الٹ دیا اندھیرے میں بھی بندوق کا کندا نظر آگیا۔ اس نے بندوق اٹھالی۔ سیاہ، چکنی، ٹھنڈی نالوں کو پیار کیا۔ پھر آسمان کیطرف سیدھی کر کے کارتوس لگا دیے اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بیچوں بیچ قالین پر سوتے ہوئے ضدی بچے کیطرح آہستہ سے لٹا دیا اور آٹھ سیلوں کی لمبی ٹارچ اٹھا کر جانوروں کیطرف چلا۔ جب لال اینٹوں کی نئی دیواریں لگے ہوئے پھاٹک کے سامنے گذرا تو پاؤں دغے ہوئے گولے کے جلے ہوئے پان پر پڑ گیا اور اس کی ناک بارود کی خوشبو سے بھر گئی۔ دنیا کی بہترین خوشبو سے چھلک اٹھی۔ کان دنادن کی آوازوں سے گونجنے لگے۔ سورج چھپنے سے پہلے وہ سرپنچ عدالت کا چناؤ جیت چکا تھا۔ اور لوگ اسے بدھائیاں دے رہے تھے۔ نیلو مہیتا کی جے جے کار کر رہے تھے۔ رگھو چمار نے تو اس کے گلے میں کلابتو کا ہار بھی ڈال دیا تھا جسے اس نے بڑے ٹھاکر کیطرح اتار کر بڑکنو کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔ جب بلاک کا پہلا پہلا الکشن ہوا اور بڑے ٹھاکر جیت گئے اور رموا پور کے پنڈت نے ان کو ہار پہنایا تھا۔ تو انھوں پہنا کہاں تھا۔ کھڑے کھڑے اتار کر کسی سپاہی خدمتگار کو پکڑا دیا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے پیروں پر جلدی جلدی چلتا ہوا آیا۔ پانچ دروازوں والا لمبا کمرہ بند تھا۔ اس نے چوروں کیطرح زنجیر کھولی۔ دیوار پر جہاں بیلوں کی ہمیلیں اور اندھیریاں ٹنگی تھیں وہیں روشنی کے تیز گولدارے میں اس کا ہار جگر جگر کر رہا تھا۔ اس نے

اتار کر پہن لیا ۔ اور اپنے آپ پر نگاہ کی تو جیسے ہزاروں من مٹی کے نیچے مدتوں کے سوئے ہوئے خواب انگڑائیاں لینے لگے ۔ وہ دیر تک اس کمرے میں کھڑا رہا جس میں ایک طرف چھت تک بھوسہ بھرا تھا۔ اور جس کی دندک سے کمرہ دہک رہا تھا۔ جب اس کے ننگے پیٹ پر پسینے کے قطرے کھٹملوں کیطرح رینگنے لگے تو وہ باہر نکلا ۔ آم کے بور کی خوشبوں کا گہنا پہنے ٹھنڈی ہوا نے اسے اپنے آپ میں سمیٹ لیا۔ اب چرخی پر ہنگامہ کھولنے لگا تھا۔ اس نے جلتی ہوئی نارچ قالین پر لٹادی اور اسی طرح ہار پہنے پہنے کندھے پر بندوق رکھے جانوروں کیطرف اسطرح جیسے بڑے ٹھا کر گڑھی نکل رہے ہوں ۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر اپنے جانور دیکھے اور بیلوں کے ماتھے اور بھینسوں کے پٹھے سہلانے ۔ پھر سانی پانی کرنے والوں کو ڈانٹنے کیلئے گردن گھما کر منہ کھول دیا۔ مگر خیال آگیا کہ وہ اکیلا ہے اور رات باقی ہے۔ پھر گھر گھر چلنے والی چکیوں اور پنہاریوں کے گیتوں کی ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی آوازوں نے اسے گھیر لیا۔

جیسے موٹی عورتیں ناچ رہی ہوں اور ان کے گھنگروں کے ساتھ نئے ناڑی لگے بھاری بھاری لہنگے سرسرا رہے ہوں ۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں اور اسطرح دیکھا کہ اگر دن ہوتا تو اپنی عدالت میں مقدمہ قائم کرا دیتا۔

پھر اس کے اپنے گھر سے انھا دھری کی آوازیں آنے لگیں ۔ بڑکنو، منجھلنو اور چھٹکنو کھانسنے کھنکارنے لگے ۔ ان کی دلہنیں بولنے بتلانے لگیں اور لڑکے چیخنے چلانے لگے اور نیم کی پھنگیوں پر سرخی چمکنے لگی جیسے سنہری چڑیوں کی قطار بیٹھی ہو تو اسے یقین آگیا کہ سچ مچ صبح ہو گئی ہے ۔ اس نے جلدی سے کارتوس نکال کر بندوق قالین کے نیچے چھپا دی اور پھر دھم دھم چلتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا ۔ گلے سے ہار ------ اپنی جیت کا تھسک اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور اطمینان سے قالین پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آج کی رات اتنی جلدی کیسے گذر گئی ۔ آگے تو چوٹ کھائے ہوئے پھوڑے کیطرح راتیں ٹنگتیں رہتیں ۔ کروٹیں بدلتے بدلتے کولھے اور کندھے درد کرنے لگتے ۔ چلمیں پیتے پیتے سینہ دھونکنی ہو جاتا اور آج کی رات ------ جیسے کلاں راسی کالا گھوڑا بات کی بات میں کاوے کاٹ گیا ہو ۔

وہ اپنے اونچے سفید بیلوں کی جوڑ دیکھ رہا تھا ۔ نوکر سینگوں میں سیاہی لگا رہے تھے کہ رگھو چمار آگیا ۔ دبلا پتلا، جھکا ہوا سن سفید رگھو چمار لال انگوچھے باندھے تھا جس میں سے نکلی ہوئی پنڈلیاں سڑی لوکیوں کے مانند بے جان اور گھناؤنی تھیں ۔ چہرے پر جھریوں اور

زرد بالوں کے علاوہ جھریوں کی تھالی میں آنکھوں کے ڈھیلے کیچڑ اور خوف میں لتھڑے پڑے تھے ۔ لکڑی کے سوکھے ہاتھوں میں ایک بڑا سا دونا لرز رہا تھا ۔ وہ بڑی دیر تک کھڑا رہا ۔ اس کے ہونٹ ہلتے رہے ۔ پھر ملو مہیتا نے اس کو پھسلتی نگاہ سے دیکھا اور رگھو نے دونا مہیتا کے ہاتھ پکڑا دیا مہیتا نے مٹھائی ایک نوکر کے سیاہ ہاتھوں میں تھما دی اور ناریل کی مہنال دانتوں میں داب کر دونوں ابرو اچکا دیے ۔

"پرار تھنا ہے آپ سے"

ایک جملے کا بوجھ اتار کر رگھو ہانپنے لگا ۔ ملو مہیتا اسی طرح دھواں اگلتے رہے اور ادھر دیکھتے رہے جہاں جھنگنو پالکی کی چھت پر کہنی رکھے منگنی سے واپس آئی ہوئی جا جمین اور دریاں نہار رہا تھا ۔ مہیتا نے پھر سنا ۔

"ایک پلنگ برابر دھرتی ہے ------- کل ایک و کھت کی روٹی دے سکت ہے ۔

مہیتا نے نگاہ اٹھائی مگر اب رگھو اچل نکلا تھا ۔

"موار کا ہے ؟----- آج مرا کل دوسرا دن ------- مل چھوٹے چھوٹے بن بلپ کے بچے بلکت ہیں اور کھنڈر ماں آپ سمجھ لو نا ۔ بھرا پڑا ہے ۔ اگر دیواریں گرانے کے تما کو بونے دین جانے تو بجار روپیہ کھڑا ہونے جانے ۔"

اور رگھو کی جھولی خالی ہو گئی ۔ مہیتا نے پھاٹک کیطرف نگاہ کی ۔ جالم چو کیدار آرہا تھا ۔ خاکی کوٹ پر پیتل کی چپراس اور لال صافہ باندھے اور کندھے پر بلم رکھے وہ بالکل پاس آگیا ۔ مہیتا نے پلنگ پر اس خوف سے دور تک اپنے پاؤں پھیلا لیے کہ کہیں چوکیدار ان کے برابر نہ بیٹھ جائے اور دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑے ہوئے ناریل کو منہ سے ہٹائے بغیر پوچھا ۔

"کا ہے ------ جالم ؟"

"سب کچہری بھر گئی اور تمہاری راہ تکی جارہی ہے"

یہ ایک جملہ ریڑھ کی ہڈی میں برف کے خنجر کیطرح اوپر سے نیچے تک تیر گیا ۔ جب چلم جل گئی اور چوکیدار جماہیاں لینے لگا تب کہیں مہیتا اٹھے ۔ نئے کنویں کی جگت کے نیچے پکی چبوتریا پر کھڑے ہو کر پاؤں دھوئے ۔ تیل پلائے جوتے پہن کر رگھوا کو نگاہوں سے رخصت کیا اور گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی ہانک لگائی ۔

"ارے کہاں ہو -------------- بڑ کنو کی مہتاری"

بڑی بہو جو منجھلی کے پاؤں کی ایڑی رنگ رہی تھی ہڑ بڑا کر کھڑی ہو گئی۔ چھوٹی اسی طرح بیٹھی اپنے بیٹی کوٹ پر پھول کاڑھتی رہی اور بڑ کنو کی مہتاری سوپ میں بھنے ہوئے چنے پھٹکتی رہی۔ دوسری تدواری سے نکل آئیں اور پوری آواز سے چیخیں۔

"کہو"

"ہمار کرتا کہاں ہے؟ نوا"

"کا ہے"

"ارے عدالت مکدمے لئے بیٹھی ہے اور تم کا ہے کا ہے لگانے ہو۔"

اور بڑکنو کی مہتاری کے طباق جیسے چوڑے سرمئی چہرے پر گلابی رنگ کا پتارہ پھر گیا۔ سوپ کو دہلیز کے حوالے کر کے اوپر سے اچک کر گٹھری اتاری اور بھا گھپوری چادرے کا کرتا نکال کر مہیتا کو پکڑا دیا اور جھپاک سے کوٹھری میں گھس گئیں۔ مہیتا گاندھی بابا کی ٹوپی پہن رہے تھے کہ وہ نیا سوپ لے کر آ گئیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"پہلا پہلا مکدمہ ہے..........بھگوان سب نیک کریں۔"

اور سوپ جس میں گیندے کے پھول، سوکھے لڈو، تلپوری کے دانے، پان کے پتے اور چراغ رکھے تھے ان کے منہ کے آگے چپکے چپکے نچانے لگیں۔ مہیتا نے جو گھر والی کے منھ کی جھریوں پر آنسوؤں کے قطرے ڈولتے دیکھے تو گھٹنے کانپنے لگے۔ لیکن چندن سے بھری ہوئی موٹی موٹی انگلیوں کے لمس نے ان کی ہمت بندھائی۔ گھونگھٹوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ چمکیلی آنکھوں سے برستی ہوئی دعاؤں نے دھیرج دی اور وہ اپنے پیروں پر گھسیٹتے ہوئے باہر نکل آئے۔

جالم چوکیدار اس کے پھاٹک سے دور پکی سڑک پر گرام سبھا کی لالٹین کے نیچے کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ ان کو آتا دیکھکر آگے آگے چلنے لگا۔ مہیتا اس کی چال کی تاڑ گئے اور بڑھاپے کے باوجود ایسا جھوم کر چلے کہ چوکیدار پیچھے رہ گیا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں گڈھی کا پھاٹک ہوا کرتا تھا اور پہرہ کھڑا ہوتا اور اب وہاں ترکاریاں بوئی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اس عمارت کے سامنے سے گذرے جو کبھی دیوان خانہ تھا اور جس میں الٹی سیدھی دیواریں کھینچ کر بی۔ڈی۔او نے مکان بنالیا تھا اور جسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شخص نے لنگی اور کھڑاؤں پہن کر ٹائی باندھ لی ہو اور ہیٹ لگالیا ہو۔ اب املیوں اور نیم کے بوڑھے

درختوں کی آڑ میں کھڑی ہوئی سفید عمارت چمکنے لگی تھی اور دوسرے حصوں میں ہسپتال، پنچایت گھر، اسٹور اور پردھان کا دفتر تھا۔

آدمیوں سے لچکتے ہوئے دالان کی سرخ کامدار سیڑھیوں پر جب اس نے پاؤں رکھا تو پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ آدمیوں کی دیوار پھاڑ کر وہ ہال میں داخل ہوئے جس کے ننگے گلابی فرش پر دیوار کے نیچے چوکی بچھی تھی۔ اس کے دونوں طرف میڑھی میڑھی قطاروں میں مونڈھوں پر عدالت کے ممبران براجمان تھے۔ وہ چوکی کے پاس پہنچ کر ٹھٹک گیا تو سکریٹری نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ جب خون کی باڑھ اتر گئی اور سینے میں جلتی چکی تھم گئی اور سکریٹری پنڈت گرجا شنکر نے پاسنگ شو سگریٹ چوکی کے پائے سے بجھا کر اپنے کان میں لگالی اور بائیں کان سے قلم اتار کر رگھو ولد دھاندو ساکن موضع جاج پور کے مقدمے کی کارروائی شروع کر دی اور جالم چوکیدار نے رگھو ولد دھاندو کے نام پھسپھسی آواز میں ہانک لگائی اور انھوں نے نفرت سے سوچا کہ یہی ظالم چوکیدار اپنے تھانیدار کے سامنے کیسا ریل گاڑی کے انجن کیطرح ڈبکتا تھا اور پھر ملو مہیتا کی نگاہ اندھے کھڑے دروازوں سے گذر کر اس ستون سے لپٹ گئی جس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ نقش و نگار مٹ گئے تھے پلستر گر گیا تھا اور اینٹیں جھانکنے لگی تھیں۔ اور اب گویا وہ ستون نہیں تھا بلکہ خود ملو لنگوٹی باندھے کھڑا تھا اور اس کے جسم پر منڈھی ہوئی مترو ہی کھال سے پسلیاں جھلک رہی تھیں اور ملو مہیتا نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اب سکریٹری دیونا گری رسم الخط میں لکھی ہوئی مسل پڑھ رہا تھا۔

"مسمی رگھو ولد دھاندو قوم چمار ساکن جاج پور کو مکان مذکور دوسری غیر منقولہ جائداد کیطرح اپنے باپ دھاندو ولد چرنو سے وراثت میں ملا تھا۔ رگھو بلا شرکت غیرے تیس برس تک قابض و ساکن رہا۔ پھر تلاش معاش میں لکھنئو چلا گیا۔ عدم موجودگی میں مکان مذکورہ آفات ارضی و سماوی کے ہاتھوں کھنڈر ہو گیا اور گرام سبھا نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ لیکن قبل اس کے ضابطے کی کوئی کارروائی عمل میں آوے مسمی رگھو ولد دھاندو شہر سے واپس آ گیا اور مدعی ہوا کہ مکان مذکور کی حقیقت سے گرام سبھا اس کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ بڑکنو پردھان نے جو آپ کے بڑے بیٹے ہیں مقدمہ عدالت پنچایت کے سپرد کیا ہے۔ اب عدالت جو فیصلہ کرے۔"

اب رگھو ولد دھاندو جو قتل کے ملزم کیطرح خیالی کٹہرے میں کھڑا کانپ رہا تھا

گڑ گڑایا۔

"حضور۔۔۔۔۔۔۔ پنچ پرمیشور میری جوت میں دو بیگھا زمین بھی نا نہیں ہے۔ اسی لئے میرا لہو گھر میں دان دے سکت ہو۔"

اور رگھو نے آنکھوں میں بھرا ہوا کیچڑ انگوچھے کے کونے سے پونچھ لیا۔ عدالت کے سکوت پر اس کے ہونٹ لو کے مارے ہوئے آم کے پھانکوں کے مانند لرزنے لگے جیسے وہ بھگوان سے بنتی کر رہے ہوں' اپکار کی پرارتھنا کر رہے ہوں اور بھگوان سرپنچ کا روپ دھارے سامنے کے ستون پر آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ آج سے بیس برس پہلے اسی دالان کے اسی ستون کے پاس کھڑا ہے اور وہ بڑے ٹھاکر کے بنتھ چھٹ سپاہیوں کی مار سے پھوڑے کیطرح دکھ رہا ہے۔ اور جب وہ آج کا ملو مہیتا اور کل کا ملوا لہار بڑے ٹھاکر سے کچھ کہنے کی نویدن کرتا تو اس کے سر پر اپنے تھوکے ہوئے جوتے کا بھرا کا ہوتا۔ پھر اس کی آنسوؤں سے دھندلی آنکھوں نے دیکھا کہ یہ اندھے کھڑے دروازے رنگ برنگ کے شیشوں کی ان گنت آنکھیں کھولے کھڑے ہیں۔ ریشمی پردے پلکوں کیطرح الٹے پڑے ہیں۔ یہیں جہاں یہ ننگی بوچی جو کی پڑی ہے سیاہ چمکیلی کوچ بچھی ہے اور بڑے ٹھاکر لیٹے خوشبودار دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے غبار اڑا رہے ہیں اور وہ ان کے سامنے رگھو چمار کیطرح کھڑا ہے اور اپنے مقدمے کا آخری عدالت سے فیصلہ سن رہا ہے کہ ملوا کہار سے ریاست کی تمام زمین نکال لی گئی۔ پھر سرپنچ عدالت جاج پور ملو مہیتا کی نگاہ اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر جم گئی جس کا ناخن اسی مار پیٹ میں ٹوٹ گیا تھا اور انگوٹھے پر ناخن کے بجائے بد گوشت نکل آیا تھا۔ سیاہ گھناؤنا بد گوشت۔ انگلیاں اپنے ناخن کی یادگار کو سہلانے لگیں اور آنکھوں کے آگے پانی کے پردے لرزنے لگے جن کے اس پار کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ عدالت کے ممبروں نے سرپنچ عدالت کو بھری عدالت میں اسطرح روتے دیکھا تو سناٹے میں آگئے۔ انھوں نے جن کے پیروں میں عزیزوں' دوستوں اور مہربانوں کے الجھے ہوئے مفادات کی زنجیریں پڑی تھیں سکریٹری کے سامنے سے کاغذ کا ایک تختہ اٹھالیا اور کورے کاغذ پر دستخط کر دیے۔ انگوٹھے کے نشانات بنا دیے۔ پھر کاغذ سرپنچ کے سامنے رکھ کر مدھم آواز میں بولے۔

"آپ جو حکم چاہیں اس پر لکھ لیں"

دیر کے بعد ملو مہیتا نے پورے بدن کو سرکا کر پاؤں نیچے اتارے۔ بڑے ٹھاکر

کیطرح جھوم کر اٹھے اور سر کے اشارے سے سکریٹری کو حکم دیا کہ کاغذ قلم لے کر ساتھ چلے ۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوا جیسے بڑے ٹھا کر دوسرے دروازے سے چلے گئے ۔ اس کے بدن کے رونئیں جھک گئے ۔ اسے یاد آیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں ٹھا کر کچہری سے اٹھ کر آرام کیا کرتے تھے ۔ اس کی نگاہ اوپر اٹھ گئی جہاں سلاخوں اور کڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا ۔ تین ٹانگوں کے تخت کے سامنے وہ نیلے چکنے ٹھنڈے فرش پر ایک زانو توڑ کر بیٹھ گیا ۔ سکریٹری نے کاغذ کو گدے پر جما کر دے دیا ۔ اور وہ پوری آدھی صدی کے بعد عبارت بنانے کے لئے سوچنے لگا ۔ ایک لمبے چوڑے مفلس گھرانے کا مقدر لکھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ اس آسمانی لمحے کی اہمیت کا اسے احساس تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ اس فیصلے کی تنسیخ سے دیوتا بھی مجبور ہیں ۔ اس کو معلوم تھا کہ مقدمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اپیل کا ہاتھی اٹھا نہیں سکتا ۔

جب وہ کچہری کے ہال میں آیا تو عدالت کھڑی ہو گئی ۔ چلمیں اور بیڑیاں منہ سے نکل کر ہاتھوں میں سلگنے لگیں ۔ بھنبھناتی چنگھاڑتی باتیں خاموش ہو گئیں ۔ سوکھی لوکیوں جیسی پنڈلیوں پر رگھو کے کھنکھرو گھنٹے اور زور سے کانپنے لگے ۔ پھر اس کے زرد بالوں سے ڈھکے ہوئے کانوں نے سنا ۔

"عدالت پنچایت جاج پور مدعی مسمی رگھو ولد دھاندو قوم چمار ساکن جاج پور کا استغاثہ خارج کرتی ہے ۔"

اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی ۔ پھانسی کی سزا پانے والے دفعات کی تشریح سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ۔

———— • ————

ہماری مطبوعات

ناول اور افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
گردشِ رنگِ چمن	قرۃ العین حیدر	۱۷۵/-
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۲۰۰/-
چاندنی بیگم	قرۃ العین حیدر	۱۵۰/-
موج ہوا پیچاں	ساجدہ زیدی	۶۰/-
آخری آدمی	انتظار حسین	۹۰/-
خواب رو	جوگندر پال	۴۰/-
میرا شہر ادھورا سا	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
آدھے چاند کی رات	کشمیری لال ذاکر	۷۵/-
اس صدی کا آخری گرہن	کشمیری لال ذاکر	۱۲۵/-
آتے جاتے موسموں کا سچ	ہرچرن چاولہ	۶۰/-
ناروے کے بہترین افسانے	ہرچرن چاولہ	۶۰/-
البم (یادیں افسانے)	ہرچرن چاولہ	۷۵/-
ٹوٹتے بکھرتے لوگ	یوگیش کمار	۶۰/-
بے نام قاتل	یوگیش کمار	۶۰/-
پہلی نسل کا گناہ	صفیہ صدیقی (لندن)	۷۵/-
فسانہ کہیں جسے	عاشور کاظمی (لندن)	۱۵۰/-
یروشلم یروشلم	قیصر تمکین (لندن)	۶۰/-
وہی قتل بھی کرے ہے	حیدر مہدی رضوی (لندن)	۷۵/-
ٹھکانہ	حیات اللہ انصاری	۶۰/-
سنہری پت جھڑ	نثار راہی	۶۰/-
کینچلی	غضنفر	۶۰/-
دو کشتیوں میں سوار	خالد سہیل	۹۰/-
بازگوئی	سُریندر پرکاش	۷۵/-
خالد بن ولید	قاضی عبدالستار	۱۰۰/-
آئینۂ ایام (قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے)	مرتبہ: غیاث الدین	۱۰۰/-
قطب مینار	پیغام آفاقی	۹۰/-

شاعری

کتاب	مصنف	قیمت
شاخِ منظر	جمشید مسرور (ناروے)	۶۰/-
سنہری آنچ	واجد سحری	۳۰/-
غالب کی رہگذر	واجد سحری	۳۵/-
شوخیٔ تحریر	سید محمد جعفری	۷۵/-
صلاح الدین پرویز کے خطوط	صلاح الدین پرویز	۶۰/-
سبھی رنگ کے ساون	صلاح الدین پرویز	۱۵۰/-
سمن زار: منتخب فارسی اشعار مع ترجمہ	ضیاء احمد بدایونی	۱۰۰/-
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	۷۵/-
تازہ ہوا	باقر نقوی (لندن)	۵۰/-
مہر دو نیم	افتخار عارف (لندن)	۶۰/-
صراطِ منزل	عاشور کاظمی (لندن)	۶۰/-
نغمۂ حیات	دھرمیندر ناتھ بھنوت سرمست	۶۰/-
بے نشان	شاہین	۷۵/-
جب زمینوں سے شجر اگتے ہیں	علی ظہیر	۶۰/-
ذرّوں سے ستاروں تک	اکبر حیدرآبادی	۱۰۰/-

اسلامیات

کتاب	مصنف	قیمت
ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت	عزیز احمد/جمیل جالبی	۷۵/-
ہند و پاک میں اسلامی کلچر	عزیز احمد/جمیل جالبی	۱۵۰/-
رہبرِ کامل	عبدالاحد بٹ	۳۰/-
آخر اسلام ہی کیوں؟	عبدالاحد بٹ	۴۰/-
معلمِ اعظم (سیرۃ النبی)	منورہ نوری خلیق	۱۰۰/-
غالب اور تصوف	سید محمد مصطفیٰ صابری	۶۰/-

Educational Publishing House

3108-GALI AZIZUDDIN VAKIL, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-110 006. (INDIA).

TEL.: 526162/7774965